دکنی کلچر

محمد نصیرالدین ہاشمی

مجلس ترقیٔ ادب
۲ - کلب روڈ - لاہور

طبع اول : دسمبر ۱۹۶۳ء

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : سید امتیاز علی تاج ستارۂ امتیاز
ناظم مجلس ترقیٔ ادب لاہور

طابع : مطبع عالیہ ریلوے روڈ لاہور

مہتمم : سید ظفر الحسن رضوی

فہرست

۲۔ دوسرا باب

۴ - تیسرا باب

۵ - چوتھا باب

۶ - پانچواں باب

رہن سہن ، مکان ، آرکی ٹیکچر ، ملبوسات ، کھانا پینا ، مہمان نوازی وغیرہ

۶- چھٹا باب

۸ - ساتواں باب

حرف آغاز

میری پہلی تالیف ''دکن میں اردو'' سنہ ۱۹۲۳ع میں[1] شائع ہوئی - اس کے بعد کئی اور کتابیں منظر عام پر آئیں مگر ''دکن میں اردو'' کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ میرے لیے فخر و انبساط کا باعث ھے - اس کے لیے میں خدائے برتر و بزرگ کا شکر گزار ھوں کہ اس نے مجھے اس کتاب کے لکھنے کی توفیق دی اور اصحاب علم میں اس کو مقبول بنایا -

ھر زبان کے ادب میں خواہ شاعری ھو یا ناول نگاری ، افسانہ نویسی ھو یا ڈراما ، ان پر ماحول کا بڑا اثر ھوتا ھے - ھم جو کچھ دیکھتے ھیں اور جو کچھ گزرتا ھے ان ھی امور کو ادب میں ظاھر کیا جاتا ھے - حقیقت پرداز ادب اپنے زمانے کا عکاس ھوتا ھے -

دکن میں مسلمانوں نے چھ سو سال تک حکومت کی اور اس کے مختلف حصوں میں جہاں بانی کی نوبت بجائی ، شوکت اور صولت کا پرچم لہرایا ، رواداری ، ملن ساری اور امن و امان کا پرچار کیا ، ثقافت و کلچر کی ترویج کی ، تہذیب اور شایستگی کو پھیلایا ، غرض چھ سو سال تک دکن کی ترقی میں حصہ لیتے رھے - ان کے کلچر کی تفصیلی وضاحت کے لیے ضخیم صفحات کی ضرورت ھے مگر سر دست اس کا موقع نہیں ھے - ان اوراق میں مختصر

---

۱ - ''پنجاب میں اردو'' ، ''گجرات میں اردو'' وغیرہ کتابیں اس کے بعد شائع ھوئی ھیں -

طور پر طائرانہ طریقے سے مسلمانوں کے کلچر کی صراحت کی گئی ہے ۔ چونکہ دکن میں سلطنت آصفیہ مسلمانوں کی آخری حکومت تھی ، اس لیے زیادہ تر اسی حکومت کے کلچر کی تفصیل درج کی گئی ہے ۔

امید ہے کہ ارباب علم اور اصحاب ذوق کے لیے میری یہ کتاب بھی سامان ضیافت مہیا کرے گی اور موجب دلچسپی ثابت ہوگی ۔

مجھے اپنی کم مائگی کا احساس ہے مگر اس کے باوجود اردو کی خدمت اور مسلمانوں کے کارناموں کی تشریح کے لیے اس کتاب کو قلم بند کیا گیا ہے ۔ دعا ہے کہ اس کتاب کو بھی مقبولیت حاصل ہو ۔

ہاشمی

پہلا باب

دکن میں مسلمانوں کا آکر بس جانا

تمہید

دکن میں مسلمان اولاً تجارت اور تبلیغ اسلام کی غرض سے پر امن طریقے سے آئے۔ اس کے صدیوں بعد شمالی فاتح تزک و احتشام کے ساتھ دکن میں پہنچے ۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی کتاب "عرب و ھند کے تعلقات" میں "تاریخ فرشتہ" اور زین‌الدین کی "تحفتة المجاھدین" کی روشنی میں یہ واضح کیا ھے کہ ملیبار اور کارومنڈل کے سواحل پر مسلمان آئے تھے ، لیکن اس سے بہت پہلے مولوی محمد مرتضیٰ نے "سواحل ھندوستان پر مسلمانوں کا توطن" کے عنوان سے مسلمانوں کے جنوبی ھند میں آنے کو واضح کیا ھے ۔ اس مضمون کو ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے اضافے اور زیادہ تشریح کے ساتھ دوسری مرتبہ شائع کیا ۔ اس موقع پر عنوان مندرجہ بالا پر تفصیلی صراحت کرنے کے بجائے مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم کے مضمون کو پیش کرتا ہوں ، جس سے یہ واضح ہو جاتا ھے کہ مسلمان کس طرح جنوبی ھند میں کب آئے تھے ۔

جنوبی ھند میں پر امن طریقے سے مسلمانوں کے آنے کا مقصد یہ تھا کہ مذھب اسلام کی تبلیغ کی جائے۔ وہ عیسائی مبلغین کی طرح اپنے مذھب کی تبلیغ کرتے تھے اور اپنی زندگی بسر کرنے کے لیے تجارت کو ذریعۂ معیشت بنایا تھا ۔ درس و تدریس ، تصنیف و تالیف ان کی زندگی کا جزو لاینفک رہا ۔ جس وقت علاؤالدین خلجی

اور ملک کافور فوجی تزک و احتشام کے ساتھ علائی علم لہراتے ہوئے جنوب کی انتہائی سرحد راس کماری پر پہنچے تھے ، اس کے صدیوں پہلے اس سر زمین نے مسلمانوں کے قدم چوم لیے تھے - مسلمان جنوبی ہند کے مختلف حصوں پر چھ سو سال سے زیادہ عرصے تک حکومت کرتے رہے - سواحل سمندر کی اسلامی حکومت کا آغاز ۱۳۳۶ع میں ہوا اور دکن کی آصفیہ حکومت کا خاتمہ ۱۹۴۸ع میں ہوا -

سواحل ہندوستان پر مسلمانوں کا توطن

از مولانا محمد[1] مرتضیٰ مرحوم

پیش لفظ

از جناب ڈاکٹر محمد حمیداللہ صاحب سابق پروفیسر قانون جامعہ عثمانیہ

مولوی مرتضیٰ مرحوم کی مجسمۂ علم و عمل شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں - انھیں اپنے علمی مشاغل میں تاریخ تمدن سے بڑی دلچسپی تھی - ''سواحل ہندوستان پر مسلمانوں کا توطن'' نہ معلوم کتنے عرصے سے ان کی توجہ منعطف کیے ہوئے تھا - بہرحال جہاں تک مجھے علم ہے اس کی ایک قسط کو انھوں نے ماہنامہ ''صحیفہ'' (حیدرآباد دکن) میں جمادی‌الاول ۱۳۲۵ھ ۱۹۰۷ع میں ، یعنی راقم الحروف کی پیدائش سے بھی پہلے شائع کرایا تھا اور کئی سال تک یہ سلسلہ جاری رہا - بعد میں ان مضامین کو از سر نو مرتب کیا ؛ چنانچہ مرحوم کا جو قلمی مسودہ اس وقت میرے سامنے ہے اس کا مطبوعہ مضمون

---

۱ - مولوی محمد مرتضیٰ میرے حقیقی پھوپھی زاد بھائی تھے -

سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ مسودہ اصل میں گویا مطبوعہ مقالوں کا دوسرا اڈیشن ہے اور جا بجا اس میں اضافے عمل میں لائے گئے ہیں ۔

یہ ایک قیمتی دستاویز ہے جسے بعینہ شائع کرنا ہی مناسب خیال کیا گیا ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ گزشتہ چھتیس ایک سال میں عرب اور ہند کے تعلقات پر کافی وسیع لٹریچر مہیا ہو گیا ہے ۔ اردو میں مولانا سید سلیمان ندوی کی تالیفیں ''ارض القرآن''، ''عرب و ہند کے تعلقات'' (سنہ ۱۹۳۰ع) اور ''عربوں کی جہاز رانی'' (سنہ ۱۹۳۵ع) کافی معلومات کی حامل ہیں ہانکر کی انگریزی تالیفیں ملیبار کے متعلق کسی طرح بھی نظرانداز نہیں کی جا سکتیں ۔ ہائڈ کی جرمن تالیف کے فرانسیسی اڈیشن ''مشرق تجارت کی تاریخ'' میں جو بھی ہمارے موضوع کے متعلق ہے، اپنے مولف کی عظیم اہمیت کے باعث قابل ذکر ہے ۔ زین‌الدین المعبری کی عرب ''تاریخ ملیبار'' (''تحفۃ المجاہدین'') سے مرحوم واقف تھے اور اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ اس کا نسخہ ان کی نانی کے بھائی کے ہاں موجود ہے[1] ۔ مگر نہ معلوم کیا اتفاقات پیش آئے کہ اس مضمون کو چھپنے تک براہ راست استفادہ نہ کیا اور ''تاریخ فرشتہ'' پر تکیہ کر لیا جس میں ''تحفۃ المجاہدین'' ہی سے ملیبار کے حالات اخذ کیے گئے ہیں ۔ ''تاریخ فرشتہ'' کے

---

۱ ۔ قاضی عبیداللہ مرحوم کے اس نسخے سے جو بڑا نفیس اور صحیح ہے، حکیم شمس‌اللہ قادری صاحب نے یہ کتاب سنہ ۱۹۳۰ع میں شائع کی لیکن غیر عربی دان پروف بینوں نے اس کی مٹی پلید کردی ہے ۔ اس کا سنہ ۱۸۹۸ع میں لزبن میں پرتگالی ترجمے کے ساتھ جو عربی میں چھپا ہے، وہ ہمارے پیش نظر ہے ۔

ضرورت ہے لیکن مرحوم کے فرزند مولوی ڈاکٹر محمد غوث صاحب کا اصرار ہے کہ میں ہی اسے انجام دوں اور وہ بھی جلد ۔ مجبوراً مذکورہ بالا اور بعض دیگر کتابوں کی مدد سے جن کا اپنی اپنی جگہ حوالہ مل جائے گا ۔ چند تعلیقات سپرد قرطاس کیے جاتے ہیں ۔[1] قدرت کو منظور نہ تھا کہ مرحوم خود اپنے مضمون کی اس وقت نظر ثانی کر سکتے ۔ اب جہدالمقل کے سوا کیا چارہ ہے ۔

عربوں اور ہندؤں کے قدیم تعلقات

جدید تحقیقات نے یہاں تک پہنچا دیا ہے کہ عربوں کے تعلقات ہندؤں کے ساتھ ابتداء زمانہ تاریخی سے شروع ہوئے ہیں لیکن واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ قبل زمانۂ اسلام وہ ہندوستان ہی کے لوگ تھے جو اپنے ملک کی پیداوار کو سواحل عرب تک لاتے تھے ۔ نہ یہ کہ عرب تاجر ان کی تلاش میں ہندوستان جاتے تھے اور جس وقت یمن کی بندرگاہوں سے ہندوستان کو جہاز جانے لگے ، وہ زمانہ آنحضرت علیہ‌السلام کی بعثت سے بہت قریب تھا ۔

(۵ تمدن عرب صفحہ ۵۰۳) ان تعلقات کی تصدیق فرشتہ سے اس طرح ہوتی ہے ۔

”از عہد آدم علیہ‌السلام تا آن زمان (یعنی زمان فتح سندھ) از جزیرہ سرندیپ از راہ دریا کشتی ھا بمکہ و دیار عرب متردد

---

۱ ۔ یہ تعلیقات اصل مضمون کے آخر میں ضمیمے کے طور پر شامل کیے گئے ہیں ۔ متن میں دائرے کے اندر جو نشانات ہیں وہ تعلیق کی رہبری کے لیے ہیں ۔

بودند و بر همه هندوستان پیش از ظهور اسلام جهت زیارت
خانه کعبه و پرستش اصنام آنجا بمکه و دیار عرب متردد
بودند "۔ ("تاریخ فرشته"، جلد دوم ، ذکر سندھ)
آدم علیه‌السلام کے ھند یا سرندیپ میں ھبوط کی تاریخی روایت
گویا ان تعلقات کی مشہور یادگار دستاویز ہے (الف)

یہودیوں اور مسیحیوں کی آمد ہندوستان میں

قبل اس کے کہ فرنگستان کے مسیحی ساحل ھند پر اپنا قدم جمائیں ، صدیوں پہلے ایشیا کے یہودی اور مسیحی ہندوستان میں اسی بحری راستے سے پہنچ چکے تھے جس کی تصدیق "تحفۃ المجاھدین" سے اس طرح ھوتی ہے :

"پیش از ظهور اسلام و بعد از ظهور اسلام طائفه یهودی و نصاریٰ به رسم تجارت از راه دریا بدان دیار آمد و شد می‌کردند و در آخر الامر میان ملیباریان ایشان بواسطه منافع دنیوی الفتے بهم رسیده بعضے از بازرگان یهود و نصاریٰ دو شهر هائے ملیبار ساکن شده منازل و بساتین ساختند ۔" (ب)

("تحفة المجاهدین" سے فرشتہ نے فارسی ترجمہ کیا ہے ۔ (اصل "تحفة‌المجاهدین" کا نسخہ شمس‌العلما مولوی قاضی‌عبداللہ صاحب کے پاس موجود ہے) اس وقت بھی کوچین تراونکور میں یہ پرانے عیسائی بہ کثرت موجود ھیں ۔ اپنے کو سریانی چرچ کا

(الف) "سجة‌المرجان" میں آزاد بلگرامی نے اس بارے میں تاریخی روایات جمع کیے ھیں ۔ تمام مورخین کا ماخذ امام طبری کی تاریخ ہے ، جلد اول طبع یورپ صفحہ ۱۲ ۔

(ب) یہودی چین میں بھی نہایت قدیم زمانے سے آباد تھے ("دعوت اسلام" آرنلڈ) اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس راستے سے چین گئے ۔

مولف کو عربی زیادہ نہیں آتی تھی ؛ چنانچہ زیر ذکر اقتباسات کی جگہ ''تحفة المجاهدین'' کا ترجمہ اس قدر غلط کیا گیا ہے کہ مطلب الٹ گیا ہے ۔

چند اور فرانسیسی اور جرمن کتابوں اور مضامین کا مجھے علم ہے جن سے اس موقع پر استفادہ ضروری تھا لیکن بحالات موجودہ ممکن نہیں ۔ مرحوم نے ''تمدن عرب'' مترجمہ سید علی بلگرامی سے پورا استفادہ کیا ہے ۔ لیکن لبون کی (جو اردو میں لی بان بن گیا ہے) اصلی فرانسیسی تالیف ۱۸۸۴ع میں چھپی تھی ۔ میں نے ایک زمانے میں اصل اور ترجمے کا مقابلہ کرنا شروع کیا تھا اور کافی نظر ثانی اور تصحیح کی ضرورت محسوس ہوئی تھی ؛ البتہ جو دو ایک اقتباس مرحوم نے دیے ہیں ، ان کی حد تک اب مکرر اطمینان کر لیا گیا ہے کہ ان میں اصلی فرانسیسی کا مفہوم بدل نہیں گیا ہے ۔ ملیبار فخر کر سکتا ہے کہ اس نے ایک امیرالبحر خانوادہ کنج علی مرکار پیدا کیا جو کئی پشت تک ہند کے مغربی ساحل کا واحد محافظ بنا رہا ۔ اس کے حالات اور کار گزاریاں تلاش بھی چاہتی ہیں اور تفصیل بھی ۔ ان کا ذکر مختصر حواشی میں ناممکن تھا اور نامناسب ۔

میرے پیش نظر ملیالم زبان ''ملبار چرترم اتام کھنبم'' مالیبار کی ایک اسلامی تاریخ مولفہ ابراہیم الملوی الملباری کی حصہ اول ہے ۔ کہیں کہیں سے جو سمجھ میں آ سکا یہ رسالہ بہت دلچسپ معلوم ہوا لیکن کسی ملیالم جاننے والے کی مدد سے اس کو پوری طرح سمجھے بغیر اس کا کوئی حوالہ دینا مناسب نہ ہوگا ، اور فی الحال یہ ممکن نہیں ہے ۔

مجھے ہمت نہیں ہوتی تھی کہ مرحوم کے مقالے پر کچھ حواشی لکھنے کی ذمہ داری لوں ۔ اس کے لیے طویل مطالعے کی

منبع بیان کرتے ھیں ، کسی اور مقام پر اتنے عیسائی نہیں ھیں ۔ پانچویں صدی عیسوی میں نسطوری فرقے نے ھندوستان میں نصرانیت کی اشاعت کی تھی (ج) ۔ ان قوموں کے فرسودہ آثار مختلف بلاد سواحل میں اب بھی موجود ھیں جن میں سب سے زیادہ اھم سینٹ توما (تھامس) کا مقبرہ واقع میلا پور (مدراس) ھے ۔

سینٹ توما

مختصر تاریخ ''کنیسۃالمسیح'' میں (جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ھے) لکھا ھے ''نیقو نورس نے بیان کیا ھے کہ یہ مبشر آخر میں ھندوستان گیا ۔ یہاں کے باشندوں نے پرتگیزوں سے بیان کیا کہ مبشر مذکور سب کے آخر میلا پور دارالحکومت کورو منڈل میں آیا اور بہت سے لوگ اس کی تلقین سے ایمان لے آئے ۔ حتیٰ کہ یہاں کا فرماں روا ساگا موس نامی بھی ھدایت پایا اور اب اس نے کنیسہ (چرچ) بنانا چاھا ۔ برھمن لوگ اس سے غصے میں آ گئے اور موقع تاک کر ایسے وقت جب کہ وہ تنہا نماز پڑھ رھا تھا ، اس کو گھیر لیا اور نیزے سے مار ڈالا ۔'' صفحہ (۱۸) ۔

فی‌الحال یہ مقبرہ رومن کیاتھلک فرقے کے قبضے میں ھے ۔

(ج) مختصر تاریخ ''کنیسۃ المسیح''زبان عربی، طبع یورپ، صفحہ ۱۰۶، مطبوعہ سنہ ۱۸۳۹ع : یہ کتاب کتب خانہ جناب قاضی الملک بدرالدولہ مرحوم کے صندوق متعلقہ کتب عیسائیاں میں موجود ھے ۔ پروفیسر آرنلڈ نے بھی نسطوریوں کے متعلق لکھا ھے کہ انھوں نے اسلام کے زمانے میں مسیحی کے کاموں کو بھی بڑے دھوم دھام سے بیرونی ممالک میں جاری کیا ، چین اور ھندوستان کو اپنے مشنری روانہ کیے (''دعوت اسلام'' صفحہ ۸۲) ۔

''عربی دائرۃ المعارف'' میں بھی جس کا مؤلف شام کا عیسائی ہے ، سینٹ تھامس کا مختصر تذکرہ ہے ۔ (صفحہ ۲۷ جلد ۶) جس میں وہ یہ بھی لکھتا ہے ''بعض نصرانیوں کے پاس سینٹ تھامس کے واقعات فرقہ (د) مانویہ کے اختراع ہیں ۔ ہندوستان کا سینٹ تھامس مانی کا شاگرد تھا ۔''

نسطوریہ فرقے کا مرکز بھی ایران تھا (''دعوت اسلام'' صفحہ ۸۲) اور اسی بنا پر گویا نسطوریوں کی کوشش مانویہ کی طرف منسوب کی گئی ہے ، لیکن حسب بیان مختصر تاریخ کنیسہ نسطوریوں کی دوبارہ کوشش کی بنا پر سینٹ تھامس کے پہلی صدی عیسوی میں ہندوستان آنے کی تردید نہیں کی جا سکتی ۔ مشہور فرنگستانی سیاح مارکو پولو ، جس نے تیرھویں صدی عیسوی میں (مطابق ساتویں صدی ھجری) ہندوستان کی بھی سیاحت کی تھی ، سینٹ تھامس کے مقبرے کا ذکر اس طرح کرتا ہے :

'' صوبہ معبر (کارو منڈل) میں سنٹ تھامس کا مزار ہے ۔ یہ مزار میلا پور میں واقع ہے ۔ وہاں تاجر کم جاتے ہیں کیونکہ تجارت کی کوئی چیز نہیں ملتی ۔ عیسائی اور مسلمان دونوں اس قبر کی زیارت کرتے ہیں ۔ مسلمان بھی سینٹ تھامس کو ایک ولی مانتے ہیں ۔ وہ اسے حواری کے لقب سے یاد کرتے ہیں'' (مارکو پولو ، سفر نامہ ، ترجمہ اردو ، مطبوعہ مشن پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی ، صفحہ ۱۵۳)۔ یہ مسیحیوں کا بیان ہے ۔ ابن اسحاق نے حواریوں میں تو اس کا نام لکھا ہے اور بتایا

(د) مانی نے مجوسی و نصرانی مذہب کو ملا کر ایک نیا مذہب پیدا کیا تھا ۔ (شہرستانی کی ''الملل و النحل'' جلد اول ، صفحہ ۱۴۳ ۔ ''رسائل شبلی'' صفحہ ۳۴۵ ۔)

ہے کہ وہ بابل بھیجا گیا ۔ (ہ) ما بعد اسلامی مورخین مثلاً طبری (و) کا ماخذ ابن اسحاق ہے ۔ ابن اسحاق کا ماخذ نصرانیوں ہی کی روایتیں ہیں (ز) ۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ ما قبل زمانۂ اسلام کے حالات کی نسبت بجز غیر مسلموں کے نقل کے اور کوئی ذریعہ تاریخی نہیں ہو سکتا ۔ بہر حال اسلامی اصول کے لحاظ سے توما حواری کے ہندوستان میں آنے کی نفی نہیں کی جا سکتی ۔

مسلمانوں کی آمد ساحل ہندوستان میں

جب حضرت خاتم النبیین علیہ‌السلام کی ہدایت سے فیض یاب ہو کر صحابہ کرام رضی‌اللہ‌عنہم نے بھی حواریان حضرت مسیح علیہ‌السلام کی بشارت کی طرح دعوت اسلام کے لیے اپنی زندگی وقف کردی تو یہ امر کسی‌طرح مستبعد نہیں ہو سکتا کہ ساحل ہندوستان بھی ان کے آثار سے محروم رہا ہو ۔ چنانچہ حضرت تمیم انصاری کا مزار بہ مقام کولم (۳) جو ساحل مدراس سے جانب جنوب (۱۲) میل کے فاصلے پر واقع ہے جس کی زیارت سے میں بھی متعدد دفعہ مشرف ہو چکا ہوں اور حضرت عکاشہ رضی‌اللہ‌عنہ کا مزار بہ مقام محمود بندر (ح) اس کے ثبوت میں موجود ہے ، جب کہ چین کے بندر کیانٹن (۴) میں حضرت وھب رضی‌اللہ عنہ کا مزار گویا تواتر سے ثابت ہے تو پھر ساحل کاروسنڈل میں اس کے وجود سے انکار نہیں ہوسکتا ۔

(ہ) سیرۃ ابن اسحاق بہ روایت ابن ہشام ، طبع یورپ ، صفحہ ۹۷۲ ۔

(و) جلد دوم صفحہ ۸۳۸ ۔

(ز) ابن اسحاق کی نسبت مسلم ہے کہ یہود و نصاریٰ سے بھی اخذ کرتا تھا ۔ علامہ ابن الندیم کی ''کتاب‌الفہرست''۔

(ح) مدراس کی جانب جنوب ساحل کارومنڈل پر واقع ہے ۔

اور ان متبرک ناموں کی شہرت خود ایک قوی ثبوت ہے ۔ یہ تو مسلم تاریخی واقعہ ہے کہ مسلمان سواحل ہند پر اپنی حکومت قائم ہوتے ہی پہنچ گئے ۔ لی‌بان لکھتا ہے کہ اپنی حکومت قائم ہو جانے کے ساتھ ہی عربوں نے تعلقات تجارتی کو بہت بڑی ترقی دی اور وہ بہت جلد ساحل کاروہ‌نڈل ، ملا بار ، سوماٹرا جزائر بحر ہند کو طے کرتے ہوئے جنوب چین تک پہنچ گئے (''تمدن عرب'' صفحہ ۵۰۳) (د) موجودہ عربی تاریخوں میں ان کا ذکر نہ ہونے سے ان کی نفی کی جا سکتی ۔ قبل اس کے کہ ہم روایات سماعی قلمبند کریں عربوں کی بحری تاریخ کے متعلق کتابی مواد جو دستیاب ہوا قلمبند کریں گے ۔ اس قسم کی تاریخیں جن میں عربوں کے بحری کارنامے بتلائے گئے ہوں ، اگرچہ عربوں نے بہت کچھ لکھی تھیں لیکن ہندوستان میں وہ مفقود ہیں ۔

مسلمانوں کی بحری اور تجارتی حالت

اس سلسلے میں صرف ایک کتاب کتب خانۂ آصفیہ میں ہماری نظر سے گزری جس کا نام '' عجائب الہند برہ و بحرہ '' جو ایک ایرانی النسل مسلمان جہاز ران ''بزرگ بن شہر یار ناخدا رام ہرمزی'' کی تصنیف ہے اور یورپ کے علمی شوق کی بدولت ۱۸۸٦ع میں پروفیسر فان ڈر لائٹ کے ضروری تحشیے اور فرنچ ترجمے کے ساتھ نہایت اہتمام سے بہ‌مقام لیڈ چھاپی گئی ہے ۔ سنہ کتابت ۳۰۳ ہجری درج ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ دیگر نامور گذشتہ قوموں کی طرح عربوں میں بھی اس وقت ہندوستان عجائب گھر شمار کیا جاتا تھا اور اس ادبی ذوق رکھنے والے جہاز ران نے اپنی بحری سیاحتوں میں سنے ہوئے عجائبات کا تحفہ متمدن عربوں کی خدمت میں پیش کیا ہے اور اپنے موضوع کے لحاظ سے بجائے عام تمدنی حالت کے جو آج

عجائبات سے زیادہ قابل تحقیقات شمار کی جاتی ہے ، غیر معمولی واقعات کو اس رنگ میں پیش کرنا زیادہ مناسب خیال کرتا ہے جس سے سند باد جہازی کے سے قصوں کا لطف آئے ۔ فی الواقع ایک جہاز ران سے اس تحقیق کی امید کس طرح کی جاسکتی ہے جو ابو ریحان بیرونی جیسے محقق کے شایاں ہو ۔ لیکن بہر کیف اس کتاب سے ضمناً عربوں کے ساتھ تجارتی و بحری تعلقات کی تاریخ پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے ۔ اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت عربی جہاز رانی اور تجارت کس قدر باعث عظمت تھی ۔ بہت سے عرب ناخداؤں کے کار نامے معلوم ہوتے ہیں ، جنھوں نے اس زمانے میں کمال فن سے نہایت شہرت و ناموری حاصل کی تھی ۔ محمد بن بادشاہ ایک جہاز ران اور عبہر نامی ایک دوسرے جہاز ران کے حالات معلوم ہوتے ہیں جس نے چین تک جہاز رانی کو ترقی دی تھی ۔ بحر ہند چین اور ہندوستان کے متعدد شہر و جزائر مثلاً انڈمان وغیرہ کے حالات بھی اس کتاب سے دریافت ہوتے ہیں ۔ غرض اسلامی جہاز رانی کی ترقی کی تاریخ اس کتاب سے نہایت عمدہ طور سے واضح ہوتی ہے ۔ اُن آفات و مصائب کے حالات بھی معلوم ہوتے ہیں جو اس وقت کے غیر دخانی جہازوں کو پیش آیا کرتے تھے ؛ چنانچہ سنہ ۳۰٦ھ میں تین بڑے جہازوں کی تباہی کا حال لکھا ہے جن میں بارہ سو آدمی سوار تھے اور جو سیراف (عرب کے اس زمانے کے مشہور بندر گاہ سے ساحل ہند پر آ رہے تھے) کے کنارے کے قریب پہنچ کر سمندر میں طوفان کی وجہ سے باستثناء ۳۳ آدمیوں کے جو ایک کشتی میں سوار ہو کر ساحل سے آ لگے ۔ سب کے سب غرقاب فنا ہو گئے ۔ اس کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس انداز سے امن و امان کے ساتھ جہازوں کے ذریعے اسلام کا اثر پھیلا کرتا تھا ۔ چنانچہ متعدد نو مسلموں کے حالات لکھے ہیں ۔

سب سے زیادہ اہم تاریخی واقعہ جزیرۂ سیلون کی سفارت کا حضرت ختم المرسلین علیہ السلام کی نبوت دریافت کرنے کے لیے بیان کیا جاتا ہے۔ سراندیپ کے جوگیوں میں سے ایک فرقہ بیکور نامی کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو چاہتے ہیں اور ان کی طرف بہت میلان رکھتے ہیں۔ "تحفۃالمجاہدین" میں جس کا ذکر آئندہ آتا ہے، ملیبار میں اسلام پھیلنے کا زمانہ تیسری صدی ہجری قرار دے کر اس روایت کو غیر صحیح قرار دیا ہے جس میں حضرت ختم المرسلین علیہ السلام کے زمانے میں ہی راجا ملیبار کے اسلام لانے کا بیان ہے۔

ملیبار اور سیلون کی تاریخ ایک حد تک ملی جلی ہوئی ہے۔ (ملاحظہ ہو "عجائب الاسفار" ترجمہ سفر نامہ ابن بطوطہ جس میں پیر زادہ مولوی محمد حسین ایم۔ اے۔ نے نہایت تحقیقات کی ہے) اور ایک عرصے تک ملیباری راجا ہی سیلون پر حکمران ہو گئے تھے۔ چنانچہ پہلی صدی ہجری میں ملیباری راجا بھی سیلون میں حکمران تھے۔ پس جو روایت اس جہاز ران نے اہل سیلون سے سن کر بیان کی ہے اور مصنف "تحفۃ المجاہدین" کے زمانے میں سات سو برس کے امتداد سے مالک بن دینار کے واقعے سے مل کر مخلوط ہو گئی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ دراصل دو الگ الگ واقعات ہیں اور جس طرح مالک بن دینار کا واقعہ (جس کا ذکر آئندہ آئے گا) بجائے خود بالکل ثابت ہے، اسی طرح کوئی وجہ نہیں کہ اس سیلونی یا ملیباری سفارت کے واقعے کو جو مالک بن دینار کے واقعے سے علیحدہ ہے صحیح، نہ تسلیم کیا جائے، جب کہ سواحل ہند پر آثار صحابہ کرام تواتر سے ثابت ہیں۔

راجا سیلون کا اسلام لانا

پروفیسر آرنلڈ نے اگرچہ سلیون کے متعلق لکھا ہے :
”معلوم ہوتا ہے کہ سیلون میں تبلیغ اسلام کے لیے زیادہ علمی کوشش صرف نہیں کی گئی “ لیکن ”مجمع الجزائر“ میں ملایا کے بیان میں وہ لکھتے ہیں ”دوسری صدی ہجری میں جزیرۂ سیلون کی تجارت عربوں کے ہاتھ میں تھی“ (صفحہ ۳۸۱) - پس جب کہ عربی تاجروں نے سیلون میں ایسا طاقتور اثر قائم کر لیا تھا تو ضرور یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ دعوت اسلام کی کوشش ضرور ہوئی ہوگی - چنانچہ فرشتہ نے سندھ کے بیان میں عربوں اور ہندؤں کے پرانے تعلقات کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے :

” ہر آئینہ حاکم سر اندیپ پیشتر از رایان دیگر مواضع ہندوستان بر حقیقت اسلام مطلع شدہ در عہد صحابہ کرام مقلد قلادۂ شریعت مصطفوی گردیدہ بود - چون بسلاطین اسلام اعتقاد فراوان داشت از دریا کشتی مملو از تحف و ہدایاجہت ولید روانہ دارالخلافہ ساخت - “

فرشتہ نے یہ روایت سندھ کی قدیم تاریخوں سے اخذ کی ہے اور ان کے غیر صحیح قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی - بلاذری نے اس واقعے کو لکھا ہے لیکن راجا کا مسلمان ہونا نہیں لکھتا -

سواحل ہند پر مسلمانوں کی نو آبادی پہلی صدیوں میں

مابعد کے مصنفین مثل مصنف ” تحفۃ المجاہدین “ اور ابن بطوطہ نے سواحل ہند پر اسلامی آبادی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اور جس کا ذکر آئندہ آئے گا ، اس کی تصدیق اور

ابتدائی حالات اسی کتاب " عجائب الهند " سے معلوم ہوتے ہیں ۔ سواحل ہند خصوصاً ساحل بمبئی و سندھ کے شہروں میں کثرت سے مسلمان تاجروں کے توطن کا حال معلوم ہوتا ہے ۔ مصنف نے تشریح کی ہے کہ ہندو راجا مسلمانوں کے ساتھ لطف و مہربانی سے پیش آتے تھے اور درباری مراسم وغیرہ کی پابندی سے ان کو معاف رکھا گیا تھا ۔ مسلمانوں کی اندرونی حکومت ان ہی کے قاضی وغیرہ کیا کرتے تھے ۔ " کوام مالی " میں ناگ سانپوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہاں ایک مسلمان شخص موجود ہے جس کو ہندی میں بنجی بولتے ہیں ۔ یہ شخص پابند صلواۃ ہے اور ناگ کے کاٹے ہوئے پر کچھ پڑھ کے پھونکتا ہے ۔ اگر زہر پوری طرح سرایت نہ کر گیا ہو تو اس کا پڑھنا اثر کرتا ہے ۔ ہندو منتر پڑھنے والوں کا ذکر کر کے لکھتا ہے کہ بہ نسبت ان کے اس مسلمان شخص کے پڑھنے میں تاثیر زیادہ ہے ۔ "ملیبار کوارٹرلی ریویو" (۷) کے کسی نمبر میں ملیبار کے ماپلے مسلمانوں کی نسبت ایک مضمون چھاپا گیا تھا ۔ جو نئی بات اس مضمون سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ " کویلنڈی کے قریب ایک پتھر پر کندہ ہے کہ علی بن عبدالرحمان اس جہان فانی کو چھوڑ کر عالم بقا کو سدھارا ، سن ١٦٦ھ ۔ بہرحال یہ تاریخی طور سے ثابت ہے کہ مسلمان پہلی دوسری صدی میں ہی سواحل ہند پر آباد تھے ۔ (۸)

سواحل ہند پر اسلامی آبادی کا دوسرا دور

مسلمانوں کے تجارتی اثر کے ساتھ ان کا معاشرتی اثر بھی دن بہ دن بڑھتا گیا اور تیسری صدی کے بعد داعیان اسلام کی کوششیں سواحل ہند پر پورے طور سے بارآور ہوئیں ۔ یہ دوسرا دور مالک بن دینار مشہور داعی اسلام کے ہندوستان میں آنے

کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ ''تحفۃالمجاہدین فی اخبار البرتکالین''
کی ہی وہ کتاب ہے جس کی بدولت اس دعوت کا حال
محفوظ رہا۔ یہ رسالہ مع ترجمہ انگریزی میں بھی طبع ہوا ہے
اور اسی سے پروفیسر آرنلڈ نے بھی انتخاب کیا ہے۔ اس کا
قلمی نسخہ جناب قاضی عبیداللہ صاحب کے پاس موجود ہے
اور اس رسالے کے مطالعے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ
ایک خلاصہ اس رسالے کے متعلق لکھا جائے جس سے اس کی
وقعت اغراض تصنیف اور اعتبار روایت پوری طرح ظاہر
ہو اور اس ضمن میں ساحلی تاریخ بھی ساتھ ساتھ معلوم ہوتی
جائے۔ اس رسالے کے مصنف شیخ زین‌الدین مشہور شافعی فقیہ
ابن حجر مکی کے شاگرد ہیں جو ملیبار میں آ کر متوطن ہو گئے
تھے اور بہت سی فقہی کتابیں بھی ان کی یادگار موجود ہیں۔ اس
نامور فقیہ نے اسی تاریخی تصنیف سے ثابت کر دیا ہے کہ
فقہا جب تاریخ پر توجہ کریں تو وہ اس کو کس اعلیٰ
پیمانے پر لکھ سکتے ہیں۔ رسالے کے پڑھنے سے ہی معلوم ہو
جاتا ہے کہ مصنف ضرور کوئی عالم ہے جس کا دل اپنی قوم کی
بگڑی ہوئی حالت دیکھ کر بے تاب ہو جاتا ہے۔ اس عالم
میں یہ رسالہ لکھ کر علی عادل شاہ کے نام پر معنون کرتا
اور اس کو مسلمانان ملیبار کی اس وقت کی بگڑی ہوئی حالت
پر توجہ دلاتا ہے۔

دیباچے میں اس نے صراحتاً بیان کیا ہے کہ اللہ نے اہل ملیبار
کو دین اسلام بہ طوع و رغبت قبول کرنے سے اکرام بخشا نہ کہ
خوف و بربادی کے ذریعے سے۔ یہ اس طور سے ہوا کہ مسلمانوں
کی ایک جماعت ملیبار کی بندرگاہوں میں آئی اور یہاں اپنا وطن
بنایا۔ وہاں کے باشندے روز بہ روز اللہ کے دین میں داخل ہونے
لگے اور اس طرح اسلام کو پورا عروج ہوا تا آں کہ مسلمانوں

کی کثرت ہوئی اور ان سے اس سر زمین کے شہر بن گئے ؛ بہ وجہ اس کے کہ ہندو راجا ظلم نہیں کرتے تھے ۔ نہ اپنے رسوم قدیم سے تجاوز کرتے تھے ۔ اس کے بعد پرتگال والوں کا غلبہ ہوا اور ان کے ظلم و ستم کی وجہ سے مسلمانوں کی حالت نہایت خراب ہو گئی ۔ بہ لحاظ ضعف بے زوری ذلت کے جو مصیبت مسلمانوں پر نازل ہوئی اس کے دور کرنے کے لیے باوجود طاقت و شکوہ کے مسلمان بادشاہوں میں سے کسی نے توجہ نہ کی ۔ اس رسالے کو میں ان کی ترغیب کے لیے لکھتا ہوں کیونکہ اہل پرتگال نے بہت سے مسلمانوں کو قید کیا ، بہتوں کو مار ڈالا اور ایک جماعت کو مرتد کرکے نصرانی بنا لیا ۔ بہت سی مسلمان عورتوں کو گرفتار کر لیا جس سے نصرانی اولاد پیدا ہوئی جو مسلمانوں سے ہی لڑتے اور ان کو اذیت دیتے ہیں ۔ اس رسالے کے چار حصے ہیں ، دوسرے حصے میں ملیبار میں اشاعت اسلام کی تاریخ قلمبند کی ہے ۔

اس تاریخ اشاعت اسلام کو بہ‌حذف زواید مختصر طور سے اس طرح قلمبند کیا جا سکتا ہے کہ مسلمان زائرین کی ایک جماعت قدم آدم کی زیارت کے لیے سیلون جا رہی تھی ۔ راستے میں کرانگانور میں یہ لوگ اتر پڑے وہاں کے راجا چیر امن پرومل (حسب بیان ”عجایب الاسفار“) نے ان کے ساتھ عمدہ اخلاق کا برتاؤ کیا ۔ قافلہ سالار نے حضرت علیہ السلام کے حالات راجا کے سامنے بیان کیے اور اسلام کی حقیقت اس کو بتائی ، تائیداً معجزۂ شق القمر پیش کیا ۔ راجا مسلمان ہوا اور ملک کو تقسیم کر دینے کے بعد ان کے ساتھ پوشیدہ طور سے حجاز میں گیا اور وہیں اس کا انتقال ہو گیا ۔ مرتے وقت اس نے اپنے رفیقوں کو وصیت کی کہ ملیبار میں تبلیغ اسلام کا جو مصمم قصد تھا اس کو تجارت و سیاحت کے وسیلے سے پورا کیا جائے اور

اس کام میں مدد کے لیے راجا نے سفارش کا خط نایب ملیبار کے نام لکھا۔ یہ جماعت جس میں شرف بن مالک، مالک بن دینار، مالک بن حبیب سر بر آوردہ تھے، ملیبار میں آئے اور راجا کا خط اس کے نایب کے سامنے پیش کیا جس نے ان کے ساتھ عمدہ برتاؤ کیا اور جہاں چاہیں توطن اور مسجد، مکانات، باغات تیار کرنے کی اجازت بخشی۔ چنانچہ کرانکانور میں یہ جماعت مقیم ہوئی اور پھر اس کے بعد مالک نے کل ساحل ملیبار کا دورہ کیا اور مسجدیں تعمیر کیں۔''

پروفیسر آرنلڈ نے اس روایت کی نسبت یہ ریمارک کیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ تاریخی حیثیت سے مستند ہو یا غیر مستند، ہمارے خیال میں گو زواید روایت پورے طور سے صحیح نہ ہوں لیکن مالک بن دینار کے اسلام کی دعوت کرنے اور راجا کے اسلام قبول کرنے کے اصل واقعات کو تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، جب کہ مقامی روایتوں کی بنا پر لکھتا ہے کہ ملیبار نویں صدی (مطابق تیسری صدی ھجری) تک کریلا کے ماتحت رہا لیکن وہاں کے راجا کے دین محمدی قبول کرنے کی وجہ سے لوگوں نے بغاوت کی۔ سلطنت متفرق حصوں میں جدا ہو گئی لیکن اس کا جزو اعظم کلی کوٹ کے راجا زامورن (سامری) کے ماتحت تھا۔ (ط)

''ملیبار کوارٹرلی ریویو'' کے اس مضمون میں جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے لکھا ہے کہ چیر امن برومل نو مسلم راجا ملیبار (جس کی قبر شجر یا ظفار میں ہونا ''تحفۃ المجاہدین'' میں منقول ہے۔) کے متعلق مسٹر لوگن نے ایک عرب سے سنا

ط۔ ترجمہ تاریخ سنکلر مترجمہ ریورنڈ سیل موجود بہ کتب خانۂ شرف الدولہ مرحوم۔

ہے کہ اسی راجا کی قبر ظفار میں ہے اور اس کے سنگِ مزار پر کندہ ہے تاریخ ورود ظفار (۹) سنہ ۲۱۲ھ وفات سنہ ۲۱۶ھجری نام عبدالرحمان سامری۔ ان سماعی شہادتوں سے قطع نظر سب سے زبردست شہادت وہ مسجدیں دے رہی ہیں جن کی تعمیر حسب بیان "تحفۃ المجاہدین" مالک بن دینار نے کی تھی اور جو آج کے دن بھی دعوت اسلام کی اس قدیم روایت کی تصدیق اپنے زبان حال سے کررہی ہیں۔ جن جن مقامات میں یہ مسجدیں بنائی گئیں ان کی فہرست یہ ہے:

نشان شمار	نام مندرجہ "تحفۃ المجاہدین"	نام موجودہ حسب تحقیق "عجائب الاسفار"
(۱)	کد نکلور	کرانکار
(۲)	کولم یا کولن	کولن صفحہ ۲۹۹ "عجایب الاسفار۔" یہ گویا ملیبار کا آخری شہر ہے (جو مدراس کے قریب کولم سے علیحدہ ہے) ساحل پر ہنوز اور کولن کے مابین واقع ہیں۔
(۳)	ہیلی	اب آباد نہیں۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ ہیلی کے شہر کو ہندو مسلمان متبرک سمجھتے ہیں کیونکہ اس میں ایک جامع مسجد ہے جو برکت والی مشہور ہے۔ صفحہ ۲۸۸ "عجایب الاسفار۔"
(۴)	جرفتن (پٹن)	سری کندا پورم۔ مسجد اب بھی موجود ہے۔ " عجایب الاسفار" صفحہ ۲۸۹۔
(۵)	درفتن	دومہ پٹن۔ یہاں بھی مسجد تھی۔

یہاں کے راجا کے مسلمان ہونے کا ذکر ابن بطوطہ نے کیا ہے ۔

”عجایب الاسفار“ صفحہ ۲۸۹ ۔

(۶) فند زنیہ — ”مہند اوانی“ صفحہ ۲۹۱ ۔

(۷) جالیات — پیر زادہ مولوی محمد حسین صاحب ایم ۔ اے ۔ کا قیاس ہے کہ بد ٹین جس کا ابن بطوطہ نے ذکر کیا ہے، چالیام ہوگا ، کیونکہ وہاں بھی مالک بن دینار کی مسجدوں میں ایک مسجد تھی مگر چالیام کا نام ” تحفة المجاهدین “ میں نہیں ہے اور چالیات (۱۰) الگ وہ مقام ہے جس کا ذکر ابن بطوطہ نے کلی کوٹ کے بعد کیا ہے اور جس کو خود انھوں نے بھی تسلیم کیا ہے ۔ صفحہ ۳۰۲ ۔

(۸) خاکنور — ”بر کور“ صفحہ ۲۸۶ ۔

(۹) سنگلور — ”سنگلور“ صفحہ ۲۸۷ ۔

(۱۰) کنجر کوٹ — مولوی محمد حسین صاحب نے شاید اس کا نام سہواً چھوڑ دیا ہے ۔

مالک بن دینار کے زمانے کے متعلق ”تحفة المجاهدین“ میں اس طرح درج ہے کہ ان کے زمانے کی تحقیق نہ ہو سکی لیکن ظن غالب ہے کہ ان کا زمانہ دوسری صدی ہجری کے بعد ہے ۔ مسلمانان ملیبار کے شافعی مذہب ہونے سے فرشتہ نے یہ قیاس قائم کیا ہے کہ مالک بن دینار وغیرہ بھی شافعی ہوں گے ۔ جس سے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ تیسری صدی

کا ھی واقعہ ہے کیونکہ امام شافعی خود دوسری صدی کے آخر اور تیسری صدی کے شروع میں ہوئے ہیں ۔ کتبۂ قبر سے تو چوتھی صدی کا واقعہ معلوم ہوتا ہے ۔ ’’تحفة المجاهدين‘‘ میں مالک بن دینار کے خراسان واپس جانے کا ذکر ہے مالک بن حبیب کرانکار میں پیوند زمیں ہوئے اور ان کی اولاد کولن میں بسی ۔ اس کے بعد ’’تحفة المجاهدين‘‘ میں مختصراً بتایا ہے کہ ملیباری بتدریج دین اسلام میں داخل ہونے لگے، ہر طرف سے تاجر وہاں پہنچنے لگے اور بہت سے شہر مسلمانوں کے ان کی تجارت کی بدولت آباد ہوئے ۔

پھر اس نے کسی قدر تفصیل سے بتایا ہے کہ ہندو راجاؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کس قدر اچھی حالت میں تھے ۔ ہندو راجا ان سے اچھا برتاؤ کرتے تھے ۔ نو مسلم ملیباریوں کو ان کے ہم وطنوں کی طرف سے کوئی اذیت نہیں پہنچائی جاتی تھی بلکہ خود اصل مسلمانوں کی طرح ان کا بھی احترام کیا جاتا تھا ۔ گو وہ اسلام لانے کے پہلے نیچ ذاتوں کے کیوں نہ ہوتے ۔ مسلمان تاجر گویا چندہ کرکے اپنے نو مسلم بھائیوں کی مدد کرتے تھے ۔ کتاب کی قسم ثالث میں مولف نے ملیباریوں کی سوشل حالت پر نہایت عمدہ طور سے روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ اسلام کی کامیابی کا ایک سبب ملیباریوں کی وہ فرقہ بندی تھی جس کی بدولت ان کی سوشل حالت میں رخنہ پیدا ہو گیا تھا ۔ دو تین جگہ اس نے تشریح کی ہے کہ افراد ملک سے کوئی امر مخالف فرقہ بندی سر زد ہوتا تو ان صورتوں میں خود بخود ان کو اسلام کے سائے میں پناہ لینے کی ترغیب ہوتی تھی ۔ اس ضمن میں یہ بھی بتایا ہے کہ ملیباریوں کے بعض رسوم و رواج کا اثر مسلمانوں میں بھی ہو گیا ہے ۔

غرض کہ داعیان اسلام کی کوششوں سے ملیبار میں وہ اسلامی

زبردست نو آبادیاں قائم ہوگئیں جس کی عظمت و شان کا اندازہ کسی قدر ابن بطوطہ کے بیانات سے ہوتا ہے ۔ اور جن کی یادگار میں آج بھی مالابار مسلمان موجود ہیں ۔۔۔۔

کتاب کی قسم رابع میں جو اس رسالے (''تحفۃ المجاہدین'') کا اصل مقصد ہے ، پرتگالیوں کے سواحل ہند پر آنے اور رفتہ رفتہ یہاں ان کی حکومت قایم ہونے کے حالات نہایت تفصیل سے بتاتے ہیں اور کل مورخیں ہند میں یہی فقیہ مورخ ہے جو اس حصۂ تاریخ کا پہلا جامع ہے اور میرے خیال میں خود پرتگالی مورخین نے اس سے زیادہ نہیں لکھا ہوگا جس قدر اس رسالے میں لکھا گیا ہے ۔ فرشتہ نے اس کو مناسب اختصار کے ساتھ اپنی تاریخ میں درج کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہوسکتا ہے کہ اندلس میں مسلمانوں پر جو ظلم وحشی پرتگالیوں کے ہاتھوں برپا ہوا تھا ، مثلاً جبراً عیسائی بنانا ، مسجدوں کی اہانت ، عورتوں کی بے حرمتی ۔ حج کی ممانعت وغیرہ ، ان سب کا پورا نمونہ ساحل ہندوستان نے بھی دیکھ لیا ۔

(اس کی تصدیق انگریز مورخوں نے بھی کی ہے جو پرتگالیوں کے عیوب اچھی طرح ظاہر کرتے ہیں ۔ ملاحظہ ہو ''تاریخ ہند'' مولفہ ذکا اللہ)

اس حصۂ کتاب میں جو بات سب سے زیادہ قابل تعجب و ستایش ہے ، وہ واقعات کے علل و اسباب پر غور کرنا ہے ۔ پرتگالیوں کی ترقی کے اسباب عالم مصنف اس طرح بیان کرتا ہے کہ وہ مکر و دھوکا والے ہیں ۔ اپنے معاملات کی مصلحتوں سے باخبر ، وقت ضرورت اپنے دشمنوں سے عاجزی کرنے لگتے ہیں اور جب ضرورت نکل جاتی ہے تو پھر ہر ممکن طور سے ان پر اپنا اثر ڈالتے ہیں ۔ سب کے سب نہایت اتفاق رکھتے ہیں ، اپنے افسروں کے حکم کی مخالفت نہیں کرتے ۔ باوجودیکہ وہ اپنے

بادشاھوں سے نہایت دور مسافت پر ھیں بہ ایں ھمہ ان میں بہت کم اختلاف ھے ۔ اور یہ کبھی نہیں سنا گیا کہ ان میں سے کسی نے اپنے افسر کو حکومت حاصل کرنے کی غرض سے مار ڈالا ۔ اس لیے باوجود ان کی اقلیت کے ملیبار کے راجا ان کے مطیع ہوگئے ۔ اس کے برعکس مسلمان بادشاھوں میں باھمی نا اتفاقی ایک دوسرے سے بدگمانی ، اپنی ذات کے خلاف سازش کا خوف وغیرہ اسباب تنزل نہایت وضاحت سے آئینہ کرکے بتایا ھے ۔

غرض کہ اس قابل قدر عالم مصنف نے دسویں صدی ھجری میں قوموں کی ترقی و تنزل پر جو فلسفیانہ نظر ڈالی ھے اور ساحل ھند کی جیسی مکمل تاریخ مرتب کی ھے اس پر اب چودھویں صدی میں بھی کوئی اضافہ نہیں کیا جاسکتا ۔ پرتگالیوں کی تاریخ کے ضمن میں اس نے یہ بھی بتایا ھے کہ مسلمان تاجروں کی تجارت کس طرح گھٹ گئی اور کس طرح پرتگالی بتدریج تمام تجارت پر قابض ھوگئے اور کس طرح مسلمانوں کی عظیم الشان جہاز رانی کا صرف نام باقی رہ گیا ۔

ساحل کارو منڈل

''تحفة المجاھدین'' میں ان داعیان اسلام کے صرف ملیبار میں توطن اور ساحل ملیبار پر ھی مسجدیں بنانے کا ذکر ھے لیکن مغربی ساحل ملیبار کی طرح مشرقی ساحل کارو منڈل میں بھی ان داعیان اسلام کے آثار اولین ملتے ھیں ۔ اور ان کا ذکر ''تحفة المجاھدین'' میں نہ ھونے کی وجہ یہ ھے کہ ''تحفة المجاھدین'' چونکہ صرف ملیبار کی تاریخ ھے لہذا اس میں ساحل کارو منڈل کے متعلق ذکر نہیں کیا گیا ۔ لیکن ''تحفة المجاھدین'' میں ان کا ذکر نہ ھونے سے کسی طرح ان کی نفی نہیں کی جا سکتی ، جب کہ تواتر سے اور صحیح قرائن سے ان کا ثبوت مل رھا ھے ۔ چنانچہ

اسی کولم میں جو مدراس کے قریب واقع ہے اور جہاں حضرت تمیم انصاری رضی‌اللہ‌عنہ کا مزار واقع ہے ، ایک قدیم مسجد اسی ہندی طرز کی موجود ہے جس کو اسلامی تعمیر ہند کا سب سے پہلا دور کہا جا سکتا ہے ۔ یہ مسجد بھی مالک بن دینار کی مسجد کے نام سے مشہور ہے ، اگر کوئی شخص جس نے مالیبار کی قدیم مسجدوں (۱) کو دیکھا ، ان کا اس مسجد سے مقابلہ کرے تو اس کا قطعی فیصلہ ہو جائے گا کہ یہ مسجد بھی انہی کے ساتھ بنی ہوئی ہے ۔

مولوی نجم‌الدین صاحب مرحوم تحصیل دار کولم نے جن کا نام ان کے عمدہ خیر کے کاموں کی وجہ سے وہاں مشہور ہے، اپنے خاندان کی ایک تاریخ لکھی ہے ۔ اس میں ضمناً کولم کے حالات آگئے ہیں ۔ بہر حال جس قدر تاریخی واقعات اس کتاب سے معلوم ہوئے ان کی نقل یہاں درج کی جاتی ہے ۔ نواب سعادت‌اللہ خان مرحوم (جو کرناٹک کے مشہور اور سب سے پہلے نواب ہیں) سنہ ۱۱۱۱ھ میں حضرت سیدنا تمیم انصاری رضی‌اللہ عنہ کے مزار مقدس کی زیارت کے واسطے فائز کولم ہوئے ۔ اس وقت مسجد مالک بن دینار کے منبر پر خطبہ خواجہ احمد مرحوم نے (تحصیل‌دار صاحب مولف تاریخ کے جد اعلیٰ) جو نواب مرحوم کے ساتھ آئے تھے ۔ زبانی پڑھا ۔ سنہ ۱۱۵۹ھ میں اس مسجد کی خطابت و موذنی کا پروانہ اور اخراجات مسجد کے لیے جاگیر کدمباری ان کو نواب مذبور کی طرف سے عطا ہوئی جس کو انھوں نے اپنے بڑے بھائی شیخ محمد مرحوم کے نام سے کرا دیا ۔ سنہ ۱۱٦۷ھ میں درگاہ حضرت تمیم انصاری رضی‌اللہ‌عنہ کے عرس وغیرہ خدمات کے لیے موضع پرمالٹری کا پروانہ ان کے نام عطا ہوا ۔ یہ دونوں پروانے اور جاگیریں ان کے خاندان میں اب بھی بحال ہیں ۔ نواب سعادت‌اللہ خان کے زمانے سے

کولم کی تاریخ روشنی میں آئی ہے ۔ جب سے اس کا نام سعادت بندر رکھا گیا محمد حسین حاکم شرع بھی جو نواب سعادت‌اللہ خان کے ساتھ سنہ ۱۱۱۱ھ میں کولم آئے تھے ، یہیں بس گئے اور ان کے مشہور عمارتی آثار اب بھی موجود ہیں ۔ سنہ ۱۱۳۷ھ میں ان کا انتقال ہوا اور مزار مقدس کے پائیں مدفون ہوئے جہاں اب بھی ایک چوکھنڈی ہے اور ان کی تاریخ وفات کا کتبہ تین شعروں میں کندہ ہے ۔

غرض کہ جب سے کرناٹک میں اسلامی نوابوں کا دور شروع ہوا کولم کی تاریخ روشن ہوتی ہے ۔ لیکن یہ سوال کہ حضرت تمیم انصاری کس طرح یہاں تشریف لائے ؟ ابھی تک تاریخی روشنی میں صاف نظر نہیں آتا ۔ عام طور پر جو روایت مشہور ہے ۔ وہ شاید تاریخی طور سے تسلیم نہ کی جا سکے ۔ بہر حال جب کہ چین کے بندر کیانٹن میں ایک صحابی کا مزار تواتر سے ثابت ہے تو ساحل کارو منڈل پر اس کی نفی نہیں کی جا سکتی ۔ کولم کے قریب جو ساڈ راس منجا کویم کے مشہور دیول ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی بڑی آبادی اور راجاؤں کا مستقر ہوگا جس کی تاریخ بہت کچھ غور طلب ہے ۔ حضرت تمیم انصاری رضی‌اللہ‌عنہ کے مزار مقدس کے آگے مسجد مالک بن دینار کے محاذی ایک چوکھنڈی ہے اور اس میں عام مروجہ قد و قامت کی قبروں سے کلاں قد و قامت کی قبر ہے ۔ ان کا نام مولوی نجم‌الدین صاحب کے فرزند مولوی عبدالرحیم‌صاحب کی زبانی سید سلیمان معلوم ہوا ۔ مسجد مالک بن دینار کی پشت پر اطراف میں ایک قدیم قبرستان ہے جس کی قدامت ان کتبوں کے خطوط سے ثابت ہوتی ہے جو بعض قبروں کے پاس پتھروں پر کندہ ہیں ۔ بعض کتبے نہایت قدیم طرز کے عربی خط میں ہیں ۔ ایک کتبہ جو نہایت قدیم عربی خط میں ہے ۔ افسوس ہے کہ

باوجود کئی احباب کی کوشش کے پورے طور سے پڑھا نہیں گیا ۔ زیادہ سے زیادہ ''اسماعیل بن عبداللہ بن علی'' (۱۲) پڑھا جاتا ہے لیکن یہ بھی یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا اور اس کے بعد آخری سطریں تو بالکل پڑھی نہیں جاتیں ۔ یہ کتبے اس کے مضبوط گواہ ہیں کہ نواب سعادت اللہ خاں کے بہت زمانے پیشتر کے ہیں اور بلحاظ ان کے طرز خط اور بلحاظ اس ''تاریخ دعوت اسلام'' کے جو اس وقت تک قلمبند کی گئی ہے ، تیسری یا چوتھی صدی میں ان کا لکھا جانا قرین قیاس ہے ۔ یہ عربی آثار قدیمہ ہیں جن کی طرف اب تک کسی متجسس آثار قدیمہ نے کوئی نگاہ لطف نہیں ڈالی ہے ۔ اور جو اس وقت کے منتظر ہیں جب کہ عربی آثار قدیمہ کے متجسس ان کا پتا لگانے کی کوشش کریں ۔ نہ معلوم ہماری عربی سے محبت رکھنے والے طلباء کے علم میں کب یہ ذوق پیدا ہو کہ وہ اپنے اسلاف کی بالکل بھولی ہوئی تاریخ کا ان کتبوں کے ذریعے سے پتا لگائیں اور تاریخ ہند میں ایک ایسا اضافہ کریں جس کی طرف اس وقت تک بہت کم توجہ کی گئی ہے ۔

ساحل کا رو منڈل پر کولم کے علاوہ محمود بندر میں حضرت عکاشہ کا مزار بیان کیا جاتا ہے ۔ باوجود دریافت اس بات کا کوئی پتا نہ لگا کہ محمود جس کے نام پر یہ بندرگاہ آباد ہے ، کون تھا ۔ حضرت عکاشہ کی نسبت بھی بیان کیا جاتا ہے کہ نواب والا جاہ مرحوم کے پروانے میں عکاشہ صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم درج ہے ۔ (مجھے جناب مولوی محمود صاحب نے جناب طرازش خان مرحوم سے سنی ہوئی یہ بات کہی ہے) ۔

بہرحال ملیبار کی طرح کارو منڈل میں بھی عرب مسلمانوں کا زبردست اثر موجود ہے ۔ ابن بطوطہ معبر (کارومنڈل) کے حصۂ زیریں مشہور مدرہ اورکاویری پٹن تک آیا تھا جہاں اس وقت اسلامی

شاھان معبر کی حکومت تھی ۔ (اسلامی شاھان معبر کی تاریخ مولوی محمد حسین صاحب نے نہایت تلاش سے لکھی ھے ”عجائب الاسفار“) علاؤالدین خلجی و محمد تغلق نے جب دکن سے راس کماری تک فتح کیا ھے تو اس وقت ساحل پر مسلمان تاجر پہلے سے موجود تھے ۔ اس ساحل پر کولم کے قریب سدرن پٹن بھی قابل لحاظ ھیں ۔ میرے مہربان سید شاہ (ی) محمد حبیب‌اللہ صاحب نے سدرن پٹن کے متعلق قابل لحاظ حالات قلم بند کیے ھیں (جو ”صحیفہ“ ماھواری میں شائع ھوئے) جن سے اس قیاس کی تصدیق ھوتی ھے کہ مالک بن دینار کی کوششیں ملیبار میں محدود نہ رھیں بلکہ کل ساحل کارومنڈل میں اس عظیم‌الشان حقیقی مجاھد و داعی اسلام نے دورہ کیا تھا ۔ صاحب موصوف نے جو حالات لکھے وہ یہاں نقل کیے جاتے ھیں ۔ ”سڈراس کولم سے ۱۹ میل کے فاصلے پر زمانۂ قدیم کا ایک مشہور آباد شہر سمجھا جاتا ھے ۔ مسلمانوں کی آبادی تخمیناً ۸۰۰--۹۰۰ افراد کے مابین ھوگی ۔ ڈچ لوگوں کا ایک پرانا قلعہ فی‌الحال شکستہ حالت میں ھے ۔ یہ قلعہ بھی انھی قلعوں میں سے ھے جن کو انگریزوں سے ڈچ نے ہر وقت معاھدہ توڑ دینے کا اقرار کیا تھا ۔ یہاں دو مسجدیں ھیں ۔ ایک فتح خان کی مسجد کہلاتی ھے جو پتھر چونے کی چھوٹی سی مسجد ھے ۔ مسجد کے سامنے ایک گنبد میں فتح خان کی قبر ھے ۔ اور مسجد کے داھنی جانب گنبد نما رواق میں فتح خان کے بھائی کی قبر ھے ۔ اسی دوسرے گنبد کے بلند حصے پر کچھ عبارت فارسی خط میں کندہ ھے جو بلندی اور خود رو پیلوں کے ڈھک جانے سے سمجھ میں نہیں آتی یہ گنبد اور مسجد اس قدر تباہ و شکستہ حالت میں ھیں کہ اندر قدم رکھتے ھوئے خوف ھوتا

(ی) یہ صاحب اب صدر محاسبی سرکار عالی میں منتظم ھیں ۔

ہے ۔ مسجد کے ہر ایک حصے میں جنگلی خار دار درخت ایستادہ ہیں ۔ دوسری مسجد جو زیادہ قدیم اور تاریخی طور سے قابل لحاظ ہے ، کسی قدر اچھی حالت میں ہے ۔ مسجد میں ایک بوریا بچھا ہوا ہے ۔ جہاں ایک یا دو آدمی یا کوئی مسافر نماز پڑھتے ہوئے نظر آتا ہے ۔ اس مسجد کی وضع تعمیر ویسی ہی ہے جیسے کولم میں مسجد مالک بن دینار کی ہے اور اس مسجد کے متصل ہی ایک قبرستان ہے جس کی الواح مزار کی وضع تحریر و تراش بھی ویسی ہی ہے جیسی کولم میں مالک بن دینار کی مسجد کے متصل قبرستان میں ۔ اس مسجد کے متولی مولوی نجم‌الدین صاحب مرحوم تحصیل‌دار کے برادر زادے ہیں اور ان کی سکونت سدرن‌پٹن سے چند میل کے فاصلے پر کسی قریے میں ہے ۔ کولم میں ان سے ملاقات ہوئی تھی ۔ انھوں نے بیان کیا کہ ان کے والد کہتے تھے کہ سدرن پٹن کی مسجد بھی مالک بن دینار کی تعمیر کی ہوئی ہے ۔ سدرن پٹن سے دو میل جانب شمال ایک موضع موسوم بہ کل پاک ہے جہاں آبادی سے دور لب ساحل دو کچی قبریں ہیں ۔ عام طور سے ایک قبر کے مدفون کا نام نوربی مشہور ہے اور ان کے پہلو میں ان کے فرزند کی قبر بیان کی جاتی ہے ۔ نوربی صاحب کرامت مشہور ہیں ۔ ہر سال ان کا عرس بتاریخ ۱۲ ذی‌الحجہ ہوتا ہے ۔ دونوں قبریں باوجود اس کے کہ ساحل پر ہیں اور بجز ایک تودۂ ریت کے اور کچھ نہیں ۔ بایں ہمہ اپنی اصلی حالت پر قایم ہیں ۔ ان دو قبروں کے متعلق کوئی زیادہ تحقیقات نہ ہو سکی ۔

نوربی کی قبر پر سرہانے اور بائیں دو پتھر نصب ہیں ۔ سرہانے کے پتھر پر شمال کی جانب کچھ عبارت کندہ ہے جو قدامت نیز لوح مزار کے روغن آلود ہونے کی وجہ سے کچھ سوجھ میں نہیں آتی ۔ شاید آیت ”کل من علیھا فان“ ہوگی ۔ اس پتھر کی

وضع تراش بھی ویسی ھی ھے جیسے کولم میں مالک بن دینار کے قبرستان میں ۔ یہاں تک مدراس کے جانب جنوب کی تاریخ قلم بند کی گئی ۔ مدراس کے جانب شمال ساحل پر پلیا گھاٹ میں بھی قدیم وضع کی مسجدیں ھیں اور عربی آبادی کا زبردست اثر ھے جو ملیبار اور دوسری جگہ کے مسلمانوں کی طرح اب زمانے کی رفتار سے تنزل میں ھے ۔ ظاھر ھے کہ ان کی عظمت تجارت کی وجہ سے تھی جو اب یورپ کے بخار و برق کی طاقتوں کے رو برو ٹھہر نہیں سکتی تھی ۔ پلیا گھاٹ کے رومال پائیداری میں مشہور تھے ۔

پلیا گھاٹ کے آگے عربوں کا نشان نہیں ملتا ۔ بظاھر یہ امر قابل تعجب معلوم ھوگا کہ مدراس سے نیچے تک تو عربی میں آثار موجود ھوں لیکن جب اس سے اوپر بنگلہ کی طرف بڑھیں تو یہ آثار معدوم ھوجائیں ۔ لیکن اس میں دراصل عرب داعیان اسلام کا کوئی قصور نہیں ھے - اصل یہ ھے کہ قدرتی طور سے یہ حصہ بالکل غیر آباد و دشوار گزار واقع ھوا ھے ۔ سمندر کے ساحل میں بہت نشیب و فراز ھیں چنانچہ عربوں سے پہلے آرین متمدن حکومتوں کا اثر بھی یہاں بہت کم پہنچا تھا ۔ ''جغرافیۂ مدراس'' مرتبہ محمد ابوالحسن (موجود بہ کتب خانۂ شرف الدولہ) میں لکھا ھے کہ ''ان تمام شمالی و ساحلی ضلعوں میں جنوبی اضلاع ساحلی کے جیسے بڑے بڑے خوبصورت مندر بالکل کم نظر آتے ھیں ۔'' یہ اس لحاظ سے کہ مشرق بالائی حصہ تجارتی و تمدنی لحاظ سے اس کے جنوبی حصۂ زیریں کا مقابل نہیں تھا بلکہ غیر آباد ملک تھا ۔ لہٰذا عرب تاجروں اور داعیان اسلام کا بھی یہاں زیادہ اثر نظر نہیں آتا ۔ شمالی اضلاع نیلور ، گنٹور ، مچھلی بندر اور راجمندری میں عربی قدیم آثار ملیبار کرناٹک جنوب کی طرح بالکل نہیں پائے جاتے ۔ ان اضلاع میں جوکچھ اسلامی آثار ھیں بھی تو

وہ مابعد اسلامی دور ، علی الخصوص ہماری سلطنت آصفیہ کی یادگاریں ہیں ، مثلاً ضلع گنٹور میں نظام پٹن جو سرکار آصفیہ کی مبارک کوششوں کی نشانی اپنے نام سے ظاہر کر رہا ہے ۔ راجمندری کی مسجد حال میں از روئے قانون آثار قدیمہ قابل حفاظت قرار دی گئی ہے ۔ اس کے حالات بھی دریافت طلب ہیں ۔ اس ساحل میں سب سے آخری ضلع اسحاق پٹن پھر ہم کو یاد دلاتا ہے کہ عربی قدیم اثر یہاں بھی موجود ہے ۔ اسحاق کا نشان مابعد اسلامی دور میں نہیں ہے اور اس لیے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ بلحاظ اپنی نام کی وضع کے پرانے عربوں میں سے ہی ہوگا ۔

غلام دستگیر صاحب داماد عبدالرحیم صاحب پالونھہ نے بیان کیا کہ یہ وہاں اسحاق مدینہ کے نام سے مشہور ہیں اور قدیم زمانے میں یہاں آئے تھے ۔ کل اس ساحل میں اسحاق پٹن ہی ایسا بندر گاہ ہے جو جہازوں کے لنگر زن ہونے کے لیے بہت ہی ٹھیک طور سے واقع ہوا ہے ۔ اور اس لیے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ عرب جہازران اس ساحل کو پوری طرح چھانتے ہوئے آخر ایک ایسے انتہائی مرکز پر پہنچ گئے جہاں اس ساحل کا خاتمہ ہوتا ہے ۔ اور جس کے بعد صرف ضلع گنجام ایسا ہے جہاں ہندوستان کی قدیم قومیں بھیلی اور گونڈ بستی ہیں ۔ ساحل ہند کو چھانتے ہوئے عرب تاجروں نے جو عظیم الشان اسلامی آثار چھوڑے ہیں اسی کی تاریخ اس نقطے پر ختم ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔

مغربی ساحل

واضح رہے کہ مشرقی ساحل کی طرح مغربی ساحل بھی ابتداء ہی سے مسلمان عرب تاجروں کی کوشش سے معمور رہا ۔ فرشتہ لکھتا ہے :

”بعد از انکہ رفتہ رفتہ تردد مسلمانان در آن ملک بسیار از

ملوک ملیبار بحلقہ اسلام در آمدند را جہازئے بندر گودا(ک)
دوابل و جیول وغیرہ بطریق حکام ملیبار مسلمانانے را کہ
از عربستان آمدند در سواحل دریا مسکن داد و ایشاں را
مخاطب بہ نوایت گردانیدند ۔''

بلحاظ تقدیم مکانی میرے خیال میں ملیبار و ساحل کارو منڈل سے پہلے یہاں اسلام کا اثر مستحکم ہو گیا تھا ۔ جیسا کہ ''عجایب الہند'' سے معلوم ہوتا ہے اور اس کی بڑی تصدیق ابن بطوطہ سے ہوتی ہے ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حملے کے بعد سے ہی یہاں کے مسلمانوں کے آثار ملتے ہیں ۔ بمبئی کے قریب تھانہ میں صحابہ کرام کا مدفن ہونا بیان کیا جاتا ہے ۔ عرس وغیرہ بھی ہوتا ہے ۔

یہ تاریخ جس پر دراصل سرسری نظر ڈالی گئی ہے ، اس قابل ہے کہ اس کی پوری تحقیقات کی جائے ۔

بے شبہہ عرب زندگی کی ضرورتوں کے لحاظ سے آئے لیکن کشت و خون اور جوع البقر کی طرح نہیں بلکہ تہذیب و تمدن فاضلہ کے اس جائز اور لازمی طریقے کے موافق جس کا بقول محققین یورپ ، یورپین تہذیب و تمدن میں صرف نام باقی ہے ۔ ان اسلامی مشنوں کے بے شر ہونے کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ مہمان نواز ہندؤں نے بلا مزاحمت ان کو ''خوش آمدید''

(ک) واپھول اور جیول مغربی ساحل پر دو بڑے بندرگاہ تھے ۔ سلطنت بہمنیہ کے زمانے میں بھی ان کی شہرت قائم تھی ۔ بقول فرشتہ ، محمود شاہ بہمنی کے وقت میں بڑے شہروں میں ان کا شمار تھا ۔ فیروز شاہ کے زمانے میں جب بحری ترقی ہوئی تو یہ بندر بھی بحری کارناموں کے مرکز تھے ۔ واپھول کوکن میں اب ضلع رتن گڑھی میں واقع ہے ۔ ''سیرۃالمحمود'' صفحہ ۶ ۔ مولفہ مولوی عزیز مرزا صاحب ۔

کہا اور کئی صدیوں تک مسلسل ایسے میل جول کے ساتھ بسر کرتے آئے (ل) جس کی ایک جھلک اب بھی ساحلی مقامات پر نظر آتی ہے۔ (۱۴)

اس طرح بغیر کشت و خون یا مکر و فریب کے محض پر امن طریقے سے جس عمارت کی بنا ڈالی گئی اس کی بنیادیں اب بھی علیٰ حالہ مستحکم ہیں ۔ نوایتہ، ماپلے ، لبے، چولیے کیلان وغیرہ مختلف کثیرالتعداد قبائل اس عمارت کا مختلف قسم کا مسالہ ہیں جن کی باہمی تفریق ایک دشوار کام ہے اور علمی تحقیقات کی شعاعیں اس پر ماند پڑتی ہیں ۔ صرف دو کتابیں میری نظر سے ایسی گزری ہیں جن میں اس کے متعلق کسی قدر لکھا گیا ہے ۔ ایک ''سراج التواریخ'' جو نواب غلام غوث خان مرحوم کے حسب الحکم مرتب ہوئی لیکن افسوس ہے کہ اس کا مکمل نسخہ دستیاب نہیں ہوتا ، صرف ایک خام مسودہ نظر سے گزرا ہے (موجود کتب خانۂ جناب مفتی محمد سعید خان صاحب مرحوم) ۔ دوسرے مولوی نجم الدین صاحب مرحوم کی خاندانی تاریخ جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے ، ان دونوں کتابوں سے جس قدر مواد مل سکا ، وہ قلم بند کیا جاتا ہے ۔ ماپلے ملیبار کے مسلمان ہیں ۔ وجہ تسمیہ میں مختلف اقوال ہیں ، لیکن کوئی صحیح قول معلوم نہیں ہوا ۔ چولیے بقول ''سراج التواریخ'' وہ مسلمان ہیں جو چولا منڈل میں بسے ۔ چولا منڈل چولا راج کی عملداری

(ل) ''تحفۃالمجاہدین'' میں صراحتاً مذکور ہے کہ ہندو راجا مسلمانوں کے ساتھ نہایت عمدہ برتاؤ کرتے تھے اور مسلمان بھی ہندوؤں کے ساتھ کسی قسم کی برائی نہ کرتے تھے ۔ مسلمانوں کی وجہ سے ملک میں تجارت اور تمول کی ترقی ہوئی ۔ ''دعوت اسلام'' ''ابن بطوطہ'' اور ''عجائب الہند'' سے بھی اس کی تصدیق ہوتی جیسے اوپر درج کیا گیا ہے ۔

سیں ہے۔ شہرت کل تجارتی دنیا میں چھپی ہوئی نہیں ہے۔ ان کی وجہ تسمیہ ”سراج التواریخ“ میں یہ بیان کی گئی ہےکہ چونکہ یہ لوگ لبیک لبیک بکثرت استعمال کرتے تھے لہٰذا اسی لفظ سے ان کی شہرت ہوگئی جو کثرت استعمال سے لبہ ہو گیا۔ جب کہ اس امر پر غور کیا جائےکہ اب بھی قابل عزت مسلمانوں میں لبیک کا لفظ بکثرت استعمال کیا جاتا ہے تو بلحاظ اصول علم الالسنہ یہ وجہ تسمیہ بعید نہیں بلکہ قرین قیاس ہے۔ یہ قبائل ان مسلمانان ہند سے جو ما بعد زمانے میں براہ خشکی ہندوستان داخل ہوئے، بالکل متمائز ہیں۔ عموماً شافعی ہیں۔ ان کی تجارت مشہور عامہ ہے۔ سرسری نظر سے بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ان قبائل کی زبان (عرب ٹامل وغیرہ) پیشہ، عادات، لباس، وضع قطع، چال ڈھال، وغیرہ میں کسی قدر عربی اثر ہے۔ یورپ کے تجار اور بجلی کی طاقتوں نے ان پر بھی اپنا مہیب اثر ڈالا اور ان کی پہلی عظمت باقی نہ رہی۔

تعلیقات

از جناب ڈاکٹر حمیداللہ صاحب سابق استاد قانون جامعۂ عثمانیہ

(۱) مضمون کا آغاز لبون کے ایک اقتباس سے ہوا ہے جو اصل فرانسیسی کتاب کے صفحہ ۵۹۹ تا ۶۰۰ پر موجود ہے۔ اس میں کوئی حوالہ نہیں ہے کہ قدیم تر زمانے میں ہندیوں کا عرب جانا قابل قبول ہے اور کیوں عربوں کا ہند آنا نہیں۔ مسقط و عمان اور سندھ و بلوچستان میں اتنی جغرافیائی قربت ہے کہ عربوں کا وہاں نہ جانا حیرت کی بات ہوگی۔ عربوں کا اپنے مرزبوم کی صحرائی اور غیر زرخیز حالت کے باعث کچھ نہیں تو چار ہزار سال قبل مسیح سے ترک وطن کے سیلاب برپا کیا کرنا مسلم ہے (عنایت اللہ ”جیوگرافکل فیکٹرس ان عربین لائف“

سنہ ۱۹۳۲ء صفحہ ۲۹) زمانۂ قدیم کی سب سے بڑی سمندری فینقی الھیں مہاجر عربوں پر مشتمل تھی ۔ عرب اپنے روز گار کے لیے زراعت و حرفت سے محروم ہونے کے باعث محض تجارت پر تکیہ کرنے پر مجبور تھے ۔ نہنت اور پیٹ بھرے ہندی کو کیا پڑی تھی کہ تجارت کے لیے عرب جیسے خشک اور مفلس ملک ہی کو جائے ۔ ہندیوں کو تجارتی بحری سفر کا شوق رہا ہو ، یہ علمی حلقوں میں ابھی تک در خور التفات نہیں سمجھا گیا ہے ۔ عہد نبوی میں یمن و عمان ہی نہیں حجاز کی عربی زبان بھی بحریات کی اصطلاحوں سے اتنی مالا مال ہے کہ وہ کسی طویل بحری روایات کے پس منظر کے بغیر سمجھ میں نہیں آ سکتی ۔ قرآن مجید میں سمندری سفر اور بحری تجارت کا جو کثیر اور دقیقہ رس ذکر ہے اس کے اولین مخاطب حجازی عرب ہی تھے ۔ اگر "رحلۃالشتاء والصیف" پر دار و مدار معشیت رکھنے والے بحری تجارت سے نا آشنا محض رہے ہوتے تو قرآن مجید کا شد و مد سے اور بار بار بحری سفر کی نعمتیں یاد دلا کر خالق بحر کی طرف بلانا بے اثر ہوتا ۔ عہد نبوی کی ماخوذ زمانۂ جاہلیت کی مکی دستاویزوں میں مابل بحر صوفیہ کا بحری محاورہ تقریباً تکیہ کلام کے طور پر برتا جاتا نظر آتا ہے ۔ قرآن مجید کی مزید اصطلاح "لتذھب ریحکم" بھی باد بانوں سے متعلق اصطلاح سمجھی جاتی ہے ۔ (ان دونوں محاوروں کی تشریح کے لیے دیکھیے میری " الوثایق السیاسیہ " حصہ غریب‌اللغات)

"عرب و ھند کے تعلقات" کے صفحہ ۹ پر مولانا سلیمان ندوی نے لکھا ہے :

"عرب تاجر ہزاروں برس پہلے سے ہندوستان کے ساحل تک آتے تھے اور یہاں کے بیوپار اور پیداوار کو مصر اور شام کے ذریعے یورپ تک پہنچاتے تھے اور وہاں کے سامان کو ہندوستان

جزائر ہند چین اور جاپان تک لے جاتے تھے ۔'' مگر کوئی حوالہ نہیں دیا گیا ہے ۔ اسی کے صفحہ ۱۰ تا ۱۱ کا یہ اقتباس بھی دلچسپی سے پڑھا جائے گا کہ ''ستیارتھ پرکاش کے مصنف سوامی دیانند جی نے گیارھویں سمولاس (پہلا پروا دھیایہ ۱۴۷) میں لکھا ہے کہ مہا بھارت میں جب کورووں نے لاکھ کا گھر بنا کر پانڈووں کو اس کے اندر جلا کر پھونک دینا چاہا تو ودرجی نے یدھشٹر کو عربی زبان میں بتایا اور یدھشٹر نے اسی عربی زبان میں ان کو جواب دیا ۔''

سردار کے ایم پان کر کی تالیف ''ملیبار اینڈ دی پور چگیز'' (سنہ ۱۹۲۹ع صفحہ ۲ ما بعد) میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ ہندوستان کی بحری تجارت ''زیادہ تر مصریوں اور ایشائی یونانیوں'' کے ھاتھ میں تھی ۔ ملیبار میں قدیم رومی سکے بڑی کثرت سے دستیاب ھوئے ھیں اور جیسا کہ بلاذری نے لکھا ہے ، عرب چونکہ خود اپنے سکے نہیں رکھتے تھے اس لیے وہ رومی اور ایرانی سکوں ھی سے کاروبار چلاتے تھے ۔ صفحہ ۴ پر پانکر نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''عرب مصر اور مغرب سے اس قریبی تعلق ھی کے باعث ملیبار میں یہودی اور سینٹ ٹامس کے فرقے کے عیسائی آئے'' یونانی اور رومی جغرافیہ نویسوں وغیرہ کے بیان سے بھی یہی معلوم ھوتا ہے کہ ہندوستان کو جہاز جاتے تھے نہ کہ ہندوستان سے جہاز آتے ھوں ۔

دے ورژے کی فرانسیسی تالیف ''عرب'' صفحہ ۴ میں بھی یہی لکھا ہے کہ عرب اپنے ملک کی صحرائی کیفیت کے باعث غلہ وغیرہ حاصل کرنے ہند اور دیگر ممالک کو جایا کرتے تھے ۔ اور اس بارے میں توریت سے بھی استدلال کیا ہے (جز قیل ۲۷ - ۱۵) غرض بحراحمر اور خلیج فارس اور بحر عرب کی بندرگاھوں سے جہازوں کا جانا بعثت نبوی سے بہت قریب نہیں بلکہ سیکڑوں

ہزاروں برس سے جاری معلوم ہوتا ہے ۔

(۲) ''تحفة المجاھدین'' مطبوعه لزبن صفحه ۱۲ کی اصل عربی عبارت کا ترجمه یه ہے :

''حصه دوم اسلام کا ملیبار میں شروع ہونا ۔ وہ یه که یہودیوں اور عیسائیوں کی ایک جماعت ملیبار کے ایک شہر میں آئی جس کو کڑنگلور کہتے ہیں ۔ یه وہاں کے بادشاہ کے رہنے کی جگه ہے ۔ یه لوگ ایک بڑے جہاز میں اپنے عیال و اطفال کے ساتھ آئے اور اس (بادشاہ) سے زمینیں ، باغ اور گھر مانگے اور وہیں بس گئے ۔ اس کے برسوں بعد وہاں مسلمان فقیروں کی ایک جماعت آئی جن کے ساتھ ایک شیخ بھی تھا ۔ یه لوگ ہمارے باپ آدم علیه السلام کی قدم کی زیارت کے قصد سے نکلے تھے ۔''

پانکر نے (''ملیبار اور پرتگالی'' صفحه ۴) میں لکھا ہے :

''یہودیوں اور عیسائیوں کی آمد کا ٹھیک وقت ہمیں معین طور پر معلوم نہیں ۔ اس کی شہادت موجود ہے که وہ ساتویں صدی عیسوی میں ملیبار میں پھل پھول رہے تھے''۔ بظاہر یه اسلام کی آمد سے ایک آدھ نسل سے زیادہ قدیم نہیں ۔

(۳) کولم (Covelong) مدراس کے جنوب میں ساحل پر کوئی چالیس میل پر ایک چھوٹی سی بستی ہے جہاں ایک پرتگالی قلعے کے کھنڈر بھی تا حال پائے جاتے ہیں ۔ محمود بندر ایس ۔ آئی ریلوے پر ایک اسٹیشن ہے جو پونڈی چری اور کڈ لور جنکشن کے جنوب میں چنگل پیٹ جنکشن سے ریل پر پورے ۱۱۰ میل پر واقع ہے ۔ انگریزی میں اسے پرتگالی نام سے پورٹو نودو (نئی بندر گاہ) (Porto Nove) کہتے ہیں اور تامل زبان میں اسے پھرنگی پیٹ (فرنگی پیٹ) جیسا که اسٹیشن پر نام کا تختہ بتاتا ہے ۔ حضرت عکاشه کو مقامی مسلمان عکاس کہتے ہیں ۔ مگر وہاں

کتبے نہیں ہیں اور موجودہ مقبرہ سو پچاس سال سے زیادہ پرانا نہیں معلوم ہوتا ۔ اسی محمود بندر میں علاوہ حضرت عکاشہ کے مزار کے میں نے منصور حلاج کا مزار بھی سنہ ۱۹۳۷ء میں دیکھا تھا حالانکہ منصور حلاج کی لاش کو جلا کر بغداد میں دریائے دجلہ کے سپرد کر دیا گیا تھا ۔ نواب بہادر یار جنگ کے سفر نامے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ناموں کے صحابہ کے مزار انھوں نے افغانستان میں بھی دیکھے تھے ۔

(۴) بروم ہال نے انگریزی میں ''اسلام چین میں'' کے نام سے جو تاریخ لکھی ہے اس کے صفحہ ۹۶ پر چین کی ایک مقامی روایت کا ذکر ہے ۔ شہنشاہ چین نے اپنے اسلام کے اظہار کے لیے ایک سفیر مدینہ روانہ کیا تھا اور اسی کتاب میں صفحہ ۸۳ اور ۱۲۰ پر تفصیل سے اس مسئلے پر بحث ہے کہ جناب رسالت مآب نے اپنے ایک قریبی رشتہ دار نیز حضرت سعد بن ابی وقاص کو چین روانہ کیا تا کہ سنگان فو میں ایک مسجد تعمیر کریں ۔ یہ مسجد اب بھی موجود ہے اور کینٹن میں مقبرہ بھی ہے ۔ ان کے کتبوں کے حالات غالباً اردو دانوں کے لیے نئے ہوں گے اس لیے کسی قدر تفصیل سے خلاصہ بیان کیا جاتا ہے :

چین کی اسلامی یادگاروں میں سنہ ۱۲۵ھ ۷۴۲ء کا کتبہ جو شہر سیان فو میں ہے ، سب سے پرانی چیز ہے ۔ اس کا ذکر خانوادہ مینگ کے سرکاری عظیم الشان جغرافیات میں بھی ہے اورکینٹن کے اسلامی کتبوں میں بھی لیکن یہ دونوں قسم کے بیانات سیان فو کے خود اصل کتبے پر مبنی ہیں اس لیے کوئی تائیدی شہادت کی حیثیت نہیں رکھتے ۔ یہ کتبہ چینی زبان میں یہاں فوشنس کی سب سے اقدم مسجد میں ہے ۔ اس کا چوبہ چار فٹ آٹھ انچ لمبا اور دو فٹ ساڑھے تین انچ چوڑا ہے اور اس پر جو چینی تاریخ ہے ، وہ سنہ ۷۴۲ء کے مطابق ہے ۔ علاوہ عنوان کے اس میں ۱ کیس, کھڑی

سطریں اور ہر سطر میں کوئی تیس لفظ ہیں۔ اس کا ترجمہ یہ ہے :

پہلی مسجد بنانے کی یادگار

''یادگاری کتبہ جو پہلی مسجد بنائی جانے کے متعلق ہے، اسے حکیم القانون وانگ کنگ معتمد مجلس مال و احتساب نے لکھا ہے......''

''جو چیز شک و شبہ کے بغیر سو نسلوں تک مانی جاتی رہی ہے، وہی صداقت ہے۔ انسان کو جس ذریعے سے یقین حاصل ہوتا ہے وہ دل ہے ۔ تمام عقلمندوں کا دل ایک ہوتا ہے اور صداقت بھی ایک ہی ہوتی ہے ، اس لیے ان میں سے ایک کی بات سے دوسرے کو یقین ہو جاتا ہے اور شبہے کی گنجائش نہیں رہتی چاہیے (دونوں میں) سو نسلوں کا فصل ہی کیوں نہ ہو۔

''دنیا کے تمام حصوں میں عقلمند پیدا ہوتے ہی جو اسی وحدت دل اور صداقت کے عامل ہوتے مغرب کے بڑے عقلمند (حضرت) محمد نے عرب میں چین کے عقلمند کنفوشس کے بہت بعد زندگی گزاری ۔ اگرچہ ان میں باہم نسلوں اور صدیوں کا فصل تھا ، ان دونوں کی تعلیمات یکساں ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ ایک ہی دل اور صداقت کے مالک تھے ۔ مثل مشہور ہے کہ ہزاروں عقلاء ہوں بھی تو ان کا دل ایک ہوتا ہے اور دس ہزار قرن بھی گزر جائیں تو بھی ایک ہی صداقت براجتی ہے ۔

''اگرچہ اس بڑے مغربی عقلمند (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم) کو گزرے ہوئے نسلیں ہو گئیں لیکن قرآن اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مافوق الفطرت حکمت لے کر پیدا ہوئے تھے ۔ آپ پیدائش اور ترقی عالم کے قوانین سے واقف تھے۔ آپ نے زندگی اور موت کا ذکر کیا ہے ۔ آپ کی تعلیم میں یہ

امور بھی تھے کہ نہا کر پاکی حاصل کرو ، روزے رکھ کر جذبات پر قابو حاصل کرو ۔ تربیت نفس کے لیے ضروری ہے کہ اپنی خامیوں کو دور کرو ، دوسروں کو یقین دلانے کے لیے صداقت اور دیانت کے حامل بنو ۔ شادیوں اور جنازوں میں شرکت کرو ۔ اہم ترین اخلاقیاتی مسائل سے لے کر روزمرہ زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل تک میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو معقولیت کی حامل نہ ہو یا جس کے متعلق آپ نے احکام نہ دیے ہوں اور ان میں ہمیشہ خدا کے احترام کا جزبہ پایا جاتا ہے ۔ اگرچہ آپ کی تعلیمات کی تفصیل دراز ہے ، لیکن ان سب کا منشاء صرف ایک چیز کو حاصل کرنا ہے ، یعنی خلاق عالم خدا کی عزت کی جائے۔

"شہنشاہ یاؤ نے کہا تھا "آسمان کی عزت کرو" شہنشاہ مٹنگ نے کہا تھا "عزت ملحوظ رکھنے سے روز اپنی اصلاح ہو سکتی ہے۔" شہنشاہ وین وانگ نے کہا تھا کہ خدا کی عبادت کرو ۔ کنفوشس نے کہا تھا "جو آسمان کے خلاف گناہ کا ارتکاب کرے اسے عبادت کام نہیں دیتی ۔" یہ تمام کہاوتیں عملاً ایک ہی چیز ہیں ۔ ظاہر ہوتا ہے کہ ان سب کو ایک ہی چیز پر یقین اور ایمان تھا ..... ۔

"تعلیمات مقدسہ (محمدیہ) صرف مغرب میں پھیلیں اور چین میں خانوادہ سوی کے حکمران کای هوانگ (سنہ ۵۸۱ تا[1] ۶۱۰ع) کے زمانے تک پہنچ نہ سکی لیکن تب سے وہ برابر چین میں رفتہ رفتہ ہر طرف پھیل رہی ہے .....

"جلالت مآب شہنشاہ تئین یاو نے یہ دیکھا کہ اس بڑے

---

۱ ۔ یہ نہ بھلایا جائے کہ جناب رسالت مآب کی ولادت ہی سنہ ۵۷۰ع میں ہوئی تھی اور نبوت سنہ ۶۱۰ع میں حاصل ہوئی ۔

عقلمند کی تعلیم خود ہمارے ہاں کے عقلاء کی تعلیم کے مطابق ہے کیونکہ وہ سب ہی راہ راست میں ہیں ۔ اس لیے اس (شہنشاہ) نے لوتئیس چو کو جو تعمیرات عامہ کا مہتمم تھا ، حکم دیا کہ اس مسجد کی تعمیر کا بیڑا اٹھائے تا کہ اس مذہب کے پیروؤں اور ان کے سر گروہ ہاتا ایرتی کے لیے سہولت حاصل ہو ۔ یہ سرگروہ اپنے مذہب کے امہات کتب کا خوب واقف ہے اور بطور سرگروہ کے اس میں یہ صلاحیت ہے کہ مقدس مذہب کی باقاعدہ عبادت کی امامت کرے اور شہنشاہ کی درازیٔ عمر کے لیے دعا کرتا رہے ۔

”اس عمارت کی تعمیر تئین یاو کے سنہ جلوس کے پہلے سال کے تیسرے چاند (مہینے) (سنہ ۷۴۲ع) میں شروع ہوئی اور اسی سال آٹھویں چاند کی بیسویں کو مکمل ہو گئی ۔

”یہ واقعہ آئیندہ نسلوں میں بھلایا نہ جانے کے لیے یہ یادداشت ایک کتبے میں کندہ کرائی گئی ہے :

”المرقوم موسم خزاں کا خوش نصیب دن تئیں یاو کا پہلا سنہ جلوس“

” یہ پتھر وان لیس ھسین مین بمقام ان چنگ[۱] تراشا گیا “

جیسا کہ کتبے سے ادعا ہوتا ہے اسلام چین میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کے نبی بننے سے بھی پہلے آ گیا تھا ۔ مزید یہ کے ”مسجد“ کے لیے اور ”عرب“ کے لیے جو الفاظ اس کتبے میں برتے گئے ہیں وہ کتبے کی تاریخ سے چھ سو سال بعد مروج ہوئے ۔ کتبے کے عہد میں دوسرے الفاظ پائے جاتے تھے ۔

---

۱ - یہ شہر سان فو کا نام ہے جو تسی این خانوادے کے زمانے میں مروج تھا اور تاریخ کتبہ سے دو ڈھائی سو سال بعد دیا گیا تھا ۔

اس میں کسی کے عرب سے بطور سفیر و مبلغ آنے کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے ۔ چین کے مورخ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس مسجد کا نام تین وقت بدلا اور کتبے میں جو نام ہے وہ پہلا نہیں بلکہ تیسرا یعنی اس وقت کا ہے جب سنہ ۷۱۵ھ ۱۳۱۵ع میں اس مسجد کی مرمت عمل میں لائی گئی تھی ۔

رسول کریم کی ولادت سنہ ۵۷۰ع میں، بعثت سنہ ۶۱۰ع میں اور ہجرت سنہ ۶۲۲ع میں ہوئی تھی لیکن چینی مورخ اپنے جن حکم رانوں کے سنہ ہائے جلوس کے حوالے سے ان امور کی تاریخ بیان کرتے ہیں ، اس کے مطابق ولادت سنہ ۵۴۶ع میں ، بعثت سنہ ۵۸۶ع میں اور ہجرت سنہ ۵۹۹ع میں ہو جاتی ہے ۔ گویا پورے چوبیس سال کا فرق پڑ کر واقعات قبل از ہو جاتے ہیں ۔

بے شبہہ اگر ولادت با سعادت واقعی چوبیس سال پہلے ہوئی ہوتی تو کتبے میں اسلام کی آمد جو سنہ ۶۵۱ع سے کچھ پہلے ہونی بیان کی گئی ہے ، وہ کم و بیش قیصر و کسریٰ کے نام تبلیغی خطوط کی ترسیل یعنی سنہ ۶ھ کے مطابق ہو جاتی ہے ۔

اس کی وجہ سمجھنی کچھ زیادہ دشوار نہیں اور اتفاق سے ہمارا ماخذ یعنی ”بروم ہال“ بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہے ۔ اصل میں چین میں بھی قمری کبیسہ سال کا رواج ہے اور عموماً ہر تیسرے سال ایک مہینے کا اس طرح اضافہ کر لیا جاتا ہے جس طرح عرب میں زمانۂ جاہلیت میں رواج تھا (اس کے متعلق تفصیلی معلومات اور سیرت نبوی پر اس کے اثرات کے لیے جولائی سنہ ۱۹۳۲ع کے رسالۂ ”معارف“ اعظم گڈھ میں مضمون ”عہد نبوی کے عربی ایرانی تعلقات“ ملاحظہ ہو سکتا ہے) ۔ اگر کوئی شخص خالص قمری اور کبیسہ قمری سال کا فرق نہ جانتا ہو جیسا کہ خود بعض عربی مولفوں مثلاً واقدی وغیرہ کے ہاں نظر آتا ہے تو چوبیس سال کا فرق آٹھ سو سال کے عرصے میں پیدا ہو جاتا ہے ۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سیان فو کے کتبے پر جو تاریخ ہے وہ آٹھ سو سال بعد کندہ ہوئی ۔ اس زمانے کے مورخوں نے دیکھا کہ سنہ ۶ھ پر اب چونکہ آٹھ نو سو قمری سال گزر چکے ہیں اس لیے چین کے قمری کبیسہ آٹھ نو سو سال پہلے کے حکم ران کا نام معلوم کیا اور اپنے زمانے میں جو روایات مروج تھے کہ اسلام سنہ ۶ھ میں چین میں آیا اور اس مسجد کی تعمیر سنہ ۱۲۵ھ میں ہوئی ، تو اس کتبے کو حقیقت میں سنہ ۱۲۵ ہجری میں کندہ نہیں کرایا گیا بلکہ اس کے پورے آٹھ سو سال بعد ۔

اگر اسلام کی سنہ ۶ ہجری میں چین پہنچنے کی کوئی تائیدی شہادت حاصل ہو جائے جو تا حال حاصل نہیں ہوئی ہے تو تقویمات سے نابلد چینی مسلمان مورخوں کی اس غلطی کو ہم آسانی سے نظر انداز کر سکتے ہیں[1]۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ چین میں اسلام کی سنہ ۶ ہجری میں آمد کا ذکر عرب کے سیرت نگاران نبوی کے ہاں بالکل نہیں۔ ہمارے معلومات کا واحد ماخذ بھی چینی دعوے ہیں اور ان کے دعوے کا واحد ثبوت مذکورہ بالا کتبہ ہے جس کی ماہیت ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ

---

[1] خاص کر اس لیے کہ ''بروم ہال'' (صفحہ ۷) میں شہر کینٹن کے ایک کتبے کا ذکر ہے کہ :

''چند لوگ ادعا کرتے ہیں کہ قدیم عقلمند (یعنی آنحضرت کا سفر سمندری راستے سے مینگ خانوادے کے دور حکومت (یعنی سنہ ۳ق ھ تا ۲۸۲) میں تجارت کے لیے آیا ۔ لیکن یہ غلط ہے وہ حقیقت میں چین کو سوی خانوادے کے زمانے (یعنی سنہ ۱۱ ولادت نبوی تا سنہ ۵ق ھ) میں آیا تھا ۔''

جس چیز کو جھٹلایا گیا ہے وہ کبیسہ سال کے فرق سے چند وقفوں کا معلوم ہوتا ہے جسے بھولے بھالے لوگ سمجھ نہ سکے اور خیال کیا کہ اس طرح سفیر کی آمد بجائے سنہ ۶ ہجری حضرت عثمان کی خلافت میں ہو جائے گی ۔

گیارھویں صدی ھجری کا ہے ۔

اب ھم رسول کریم کے ماموں کی چین میں آمد اور وھیں ان کی وفات و مزار کا ذکر کریں گے ۔ شہر کی کینٹن کی ایک نہایت قدیم مسجد کے متعلق روایت چلی آرھی ہے کہ ابتدآ اسے سعد وقاص یعنی حضرت سعد بن ابی وقاص نے تعمیر کیا اور قریب ھی ان کا مزار بھی تا حال موجود ہے ۔

چینی مسلمانوں میں سب سے مستند سیرت النبی نان کنگ کے ایک عالم لیوچی کی ہے ۔ اس مولف کا نام کٹی لیئین بھی ہے ۔ یہ سنہ ۱۷۲۱ع ۱۱۳۴ ھجری میں لکھی گئی اور بعد میں دس جلدوں میں شایع ھوئی ۔ اس میں آغاز اسلام کے متعلق لکھا ہے کہ چین کے بادشاہ نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا کہ اس کے محل میں بھوت گھس آئے ھیں ۔ پھر ایک عمامہ پوش شخص آ کر اپنے ھاتھ کی ایک کتاب تلاوت کرنے لگا تو بھوت گڑگڑانے لگے مگر تلاوت جاری رھی تو تھوڑی دیر میں وہ خاک کا تودہ ھو گئے ۔ تعبیر یہ کی گئی کہ چین پر مصیبت آنے والی ہے اور اس کا علاج یہی ہے کہ اس عمامہ پوش سے مدد لی جائے ۔ مشورے پر یہ طے ھوا کہ ایک چینی سفیر مکۂ معظمہ بھیجا جائے ۔ جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے "سعد وقاص کو تین دیگر ھمراھیوں کے ساتھ بھیجا ۔ سعد نے شہنشاہ کی اجازت سے کینٹن میں وہ مسجد تعمیر کی جو اب تک مسجد ذکری کے نام سے موجود ہے ۔ چند دن کے بعد وہ حجاز واپس ھوئے اور کوئی بیس سال بعد تا آن دم نازل شدہ قرآن کی نقل ساتھ لے کر مکرر چین آئے اور آنحضرت کے حکم سے چین ھی میں متوطن ھو گئے اور اسی سال جناب رسالت کی مدینۂ منورہ میں وفات ھو گئی ۔

قبل اس کے کہ اس روایت کی تنقید کی جائے دو امور قابل ذکر ھیں ۔ ایک تو یہ کہ لیوچی کا تذکرہ "سعد وقاص" چین کی

جس قدیم ترین تالیف میں ملتا ہے وہ خانوادے مینگ کی ''عظیم الشان جغرافیہ'' جو ۱۳۷۰ع ۷۷۲ہجری میں مرتب ہونا شروع ہوا اور سنہ ۱۴۶۱ع ۸۶۶ ہجری میں شائع ہوا ۔ اس میں شہر مدینہ کے حالات پر بھی ایک باب ہے اور اس میں ہے کہ ''سعد وقاص صحابی کی چین میں آمد خانوادہ سوی کے حکمران کائن ہوانگ کے زمانے میں (یعنی ۱۱ ولادت نبوی تا سنہ ۳۰ ولادت نبوی ۵۸۷ع تا سنہ ۶۰۰ع کے مابین یعنی قبل بعث نبوی) ہوئی''۔ دوسرے یہ قابل ذکر ہے کہ چینی رسم الخط کے باعث جس شخص کے بطور سفیر و مبلغ چین آنے کا ذکر کیا ہے اس کا نام مختلف کتبوں اور کتابوں میں بدلا ہوا ہے ۔ اور وہب ابن کبشہ ۔ وکاسد (وقاص) وانگ کاسے ، سعد ابوقاص وانگ کے چی ۔ وانگ کرس ۔ کرسن ۔ سہابہ (صحابی) ساھوتی ۔ سر تن سرتا وغیرہ وغیرہ پڑھے جاتے ہیں ۔

سنہ کی پیچیدگی کو ہم اوپر حل کر چکے ہیں ۔ محض وہ اس روایت کے بنیادی امور کو غلط قرار دینے کے لیے کافی نہیں ۔ اب رہا نام سعد بن ابی وقاص اور وہب ابو کبشہ دو قابل غور ہیں ۔ چینی مسلمان اسے عام طور پر حضرت سعد کی طرف منسوب کرتے ہیں ۔ ابن عبدالبرکی ''الاستیعاب فی معرفتة الاصحاب'' (۱۳۳۱ع) میں لکھا ہے کہ آنحضرت ان کو اپنا ماموں کہا کرتے تھے ۔ یہ فاتح ایران تھے ۔ ان کی وفات سنہ ۵۵ ھجری میں مدینۂ منورہ میں ہوئی اور وھیں دفن کیے گئے ۔ ان کا چین جانا ثابت نہیں ۔

ابو کبشہ جن لوگوں کی کنیت تھی ان میں آنحضرت کے نانا وھب بھی شامل ھیں اور ''استیعاب'' نمبر۲۶۸۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ وھب بن الاسود نامی ایک صحابی آنحضرت کے ماموں زاد بھائی گزرے ھیں جن کے مزید حالات معلوم نہیں ۔ وھب ابن کبشہ نامی کسی صحابی سے جو چینی روایت کے مطابق آنحضرت کے ماموں تھے ، میں باوجود تلاش واقف نہ ہو سکا ۔

حضرت صحابی مذکور کا جو مقبرہ کینٹن میں ہے اس کا فوٹو بھی "بروم ہال" میں ہے۔ اسے چینی طرز تعمیر سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ وہ خالص عربی یا کم از کم عراق ایرانی وضع کا گنبد ہے۔ کینٹن کی مسجد ذکری میں ایک منارہ بھی اذان کے لیے ہے جو خالص غیر چینی نمونے کا ہے۔ میری حقیر اور نا چیز رائے میں یہ خلافت عباسیہ کے زمانے کی چیزیں ہیں۔ اس مقبرے میں کوئی پرانا کتبہ نہیں ہے۔

(۵) یہ عبارت لبون کی اصل فرانسیسی کتاب میں صفحہ ۶۰۰ پر ہے اور وہاں یوں ہے "اپنی سلطنت کے اچھی طرح مستحکم ہوتے ہی انہوں نے اپنے تجارتی تعلقات کو قابل لحاظ وسعت دی اور ہم انہیں دیکھتے ہیں کہ وہ جلدی ہی ..." خط کشیدہ لفظ اصل اور تمدن عرب کے فرق کو ظاہر کرے گا۔

(۶) بزرگ بن شہریار الرامہر مزی نے سنہ ۳۴۲ ہجری کے کچھ ہی بعد اپنی کتاب تالیف کی۔ یہ ناخداؤں اور ملاحوں کی داستان پر مشتمل ہے اور سنہ ۲۸۸ ہجری تا سنہ ۳۴۲ ہجری تک کے تذکرے اس میں ملتے ہیں۔ اس میں صفحہ ۲ تا ۴ پر کسی ہندی زبان (غالباً سندھی) میں قرآن مجید کے ترجمے اور تفسیر کا ذکر ہے۔ حضرت سلیمان فارسی رضی اللہ عنہ کے فارسی ترجمے سورۂ فاتحہ کے بعد (جس کا ذکر مبسوط "سرخسی" میں صفحہ ۳۷ میں ہے) غالباً یہ پہلا مکمل ترجمہ تھا اس ترجمے کا ذکر یہاں بے محل نہ ہو گا۔

"ہندوستانی واقعات کے متعلق ہم سے ابوالحسن بن عمرو بن حمویہ بن خرام بن حمریہ الخبری نے بصرے میں بیان کیا کہ میں سنہ ۲۸۸ ہجری میں منصورہ (سندھ کا اسلامی پائے تخت) گیا ہوا تھا۔ وہاں بعض معتبر شیوخ نے مجھ سے کہا کہ علاقہ را کے راجا نے جو ہندی راجاؤں میں سب سے طاقتور

ہے اور جس کی عمل داری بالائی قشمیر (کشمیر) اور نشیبی قشمیر (پنجاب) کے مابین ہے اور جس کا نام مہروگ (مہراج) بن رائق ہے ۔ سنہ ۲۷۰ ھجری میں منصورہ کے حاکم عبداللہ بن عمرو بن عبدالعزیز کو ایک خط لکھا کہ شریعت اسلامی کی ھندی زبان میں تشریح کا اس کے لیے انتظام کیا جائے۔ حاکم منصورہ عبداللہ نے منصورہ ھی کے ایک آدمی کو بلا بھیجا جو عراقی الاصل اور تیز فہم اور سمجھدار اور شاعر تھا اور جس کی پرورش ھندی ممالک میں ہوئی تھی اور وہ وھاں کی مختلف زبانوں سے واقف تھا ۔ حاکم مذکور نے اس سے را کے راجا کی استدعا بیان کی ۔ اس نے ایک نظم لکھی جس میں تمام مطلوبہ چیزوں کا ذکر تھا اور وھی راجا کے پاس بھیج دی گئیں ۔ جب وہ راجا کو سنائی گئی تو اس نے اسے بہت پسند کیا اور حاکم منصورہ سے مراسلت کی کہ اس نظم نویس کو اس کے پاس بھیج دیا جائے۔ وہ وھاں گیا اور تین سال مقیم رہ کر واپس آیا ۔ واپسی پر حاکم منصورہ نے اس سے را کے راجا کے حالات پوچھے جو اس نے تفصیل سے بیان کیے اور کہا کہ جب بھی میں وہاں سے چلا ہوں تو اس نے دل اور زبان دونوں سے اسلام قبول کر لیا تھا ؛ البتہ حکومت اور ریاست ھاتھ سے چلے جانے کے خوف سے اس کا علانیہ اظہار نہیں کرسکتا تھا ۔ چنانچہ علاوہ اور واقعات کے راجا نے مجھ سے فرمائش کی کہ اسے قرآن مجید کی تفسیر ھندی زبان میں سناؤں اور میں نے ایسا ھی کیا اور جب سورۂ یاسین کی اس آیت پر پہنچا کہ ” اس نے کہا کہ کون ہے جو بوسیدہ ہو چکنے والی ھڈیوں کو زندہ کرے گا ۔ کہہ کہ ان کو وھی زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا ۔ اور وہ ھر قسم کی پیدا کاری سے واقف ہے “ اور میں نے اس آیت کی تفسیر کی تو وہ ایک

مرصع ، زرین ، جواہر نگار موتیوں سے آراستہ لا قیمت تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا ذرا پھر دہرانا۔ جب میں نے دہرایا تو وہ اس تخت سے نیچے اتر پڑا اور کھلی زمین پر آیا جہاں چھڑکاؤ ہو کر مٹی گیلی تھی ۔ وہاں وہ اپنا گال زمین پر رکھ کر اتنا رویا کہ اس کا چہرہ کیچڑ سے لت پت ہو گیا ۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ یہی رب معبود نور اول قدیم ہے جس جیسا کوئی اور نہیں ۔ پھر اس نے اپنے لیے ایک خاص گھر بنایا اور ظاہر کیا کہ وہ اہم معاملات کے لیے اس میں تخلیہ کرنا چاہتا ہے ۔ اس میں وہ خفیہ طور سے نماز پڑھا کرتا تھا تا کہ اس سے کوئی واقف ہونے نہ پائے اور یہ کہ اس نے تین دفعہ کر کے مجھے چھ سو سیر سونا انعام دیا ۔''

اس کتاب میں بہ کثرت دیگر دل چسپ تمدنی و قانونیاتی واقعات وغیرہ بھی ہندوستان کے متعلق ہیں ۔ بزرگ شہریار سے بھی پہلے کی بعض عربی تالیفیں جن میں ہند کے حالات ہیں ، اب دستیاب ہو رہی ہیں[1] ۔ ان میں شاید سب سے قدیم محمد بن حبیب (فوت سنہ ۲۴۵ ہجری) کی کتاب ''المحبر'' ہے جس میں عرب کے بعض میلوں میں اسلام سے بھی پہلے ہندی تاجروں کی آمد کا ذکر ہے ۔ دوسرا مولف ابن خرداذبہ تقریباً سنہ ۲۳۰ ہجری کا ہے جس کی جغرافیہ کتاب ''المسالک و الممالک'' میں ان معلومات کا ذکر ہے۔ اسے بطور افسر ڈاک خانۂ بغداد ، سندھ وغیرہ کے متعلق حاصل تھے ۔ سلیمان تاجر کا ایک گمنام سفر نامہ ہندوستان و چین ''سلسلة التواریخ'' کے نام سے سنہ ۱۸۱۱ع میں فارسی میں

۱- اس مضمون کا پروف پڑھتے وقت ڈاکٹر محمد حسین مینار کا انگریزی مقالہ ''دکن پر عرب جغرافیہ نویسوں کے معلومات'' چھپ کر آیا ہے ۔

چھپا ۔ اندرونی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ سلیمان تاجر کا زمانہ تقریباً سنہ ۲۳۷ ہجری کا ہے ۔ اس کتاب کا ضمیمہ یا تکمیلہ ابو زید الحسن اسیرانی (زمانہ تقریباً ۳۰۴ ہجری) نے لکھا ہے ۔ ان دونوں کتابوں نیز بزرگ بن شہریار کی کتاب سے ہند کے متعلق معلومات کی خاصی تفصیلی تحلیل ، مولانا سلیمان ندوی کی اردو کتاب ''عرب و ہند کے تعلقات'' میں ہے ۔ اسی طرح مسعودی ، اصطخری ابم حرقل بشاری ، مقدسی، البیرونی اور ابن بطوطہ کے معلومات بھی ۔ اس لیے ان کی مزید تفصیل یہاں غیر ضروری ہے ابو دلف مسعربن المہلہل الینبوعی کا سفر نامہ چوتھی صدی ہجری کے نصف اول سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا ایک ٹکڑا مولانا سلیمان ندوی کے بیان کے مطابق برلن میں چھپا ہے مگر انھیں کی طرح میں بھی اس کو دیکھنے سے محروم رہا ہوں ۔ ایک حالیہ اطلاع ہے کہ مشہد کے کتب خانے میں اس کا مکمل نسخہ دستیاب ہوگیا ہے ۔ الہمدنی (فوت ۳۳۴ ہجری) کی دس جلدوں والی جغرافیا ''کتاب الاکلیل'' تا حال پوری نہیں چھپی ہے ۔ معلوم نہیں اس میں ہند کا کیا کیا ذکر ہے ۔

(۷) اس سے غالباً سنہ ۱۹۰۶ع مراد ہے ۔ اس کے جون نمبر سے ''ملیبار کے ماپلے'' کے عنوان سے ۔ ایس ویدیا ناتھ ایر کا مضمون چھپنا شروع ہوا ہے ۔

(۸) یہاں وہ باب ختم ہوتا ہے جو ''سواحلی ہند پر اسلامی آبادی کا پہلا دور'' کہا جا سکتا ہے ۔ اس سلسلے میں اتنا اور اضافہ کر دینا چاہیے کہ بلاذری کی ''فتوح البلدان'' کے مطابق ہندوستان پر سب سے پہلا عربی حملہ حضرت عمر کے زمانے میں (سنہ ۱۵ ہجری میں) ہوا، پہلے تھانہ (بمبئی) اور بھروچ پر پھر دیبل کے قریب کراچی پر ۔ حضرت عثمان اور حضرت علی کے زمانے میں بھی مختلف کاروائیوں کا پتا چلتا ہے ۔ پھر امیر معاویہ ، پھر

یزید کے دور حکومت میں آخر حجاج بن یوسف کے زمانے میں لنکا سے آنے والے عربوں کے سندھ کے سمندروں میں لٹنے کے باعث محمد بن قاسم کا حملہ ہوا ۔ ان ابتدائی حالات کی خاص تفصیل قدامہ بن جعفر کی ''کتاب الخراج'' کے امر واحد ٹکڑے میں ہے جو استانبول کے کتب خانے کوبرولو میں مخطوطے کی صورت میں ہے ۔ یہاں ان حوالوں سے زیادہ تفصیل شاید غیر ضروری ہوگی ۔

(۹) قدیم شہر ظلفار کہتے ہیں کہ موجودہ ظلفار کے علاوہ کوئی اور جگہ ہے بہر حال سنہ ۱۳۵۰ ھجری میں موجودہ ظلفار سے آئے ہوئے متعدد حجاج سے مکۂ معظمہ میں دریافت پر پتہ چلا کہ وہاں اب ایسی کوئی قبر نہیں ہے بلکہ وہ سرے سے اس روایت ہی سے بے خبر پائے گئے ۔

(۱۰) سالیات اور چالیم ایک ہی چیز ہے اصل میں نام چالیت ہے ۔ ملیالم ناموں کے آخر میں عربی تنوین کے مماثل میم بڑھ جاتا ہے ۔ اس کو معرب کرکے سالیات کیا گیا ہے ۔ یہ تا حال چالیت کہلاتا ہے بڑا زر خیز باغات سے بھرا ہوا مقام ہے ۔ اور یہاں کے فاضل شہاب الدین احمد کرپا کے ہاں سنہ ۱۹۳۷ع میں میں نے ایک نفیس ذخیرہ عربی مخطوطات کا دیکھا ہے یہ دریائے بے پور میں جزیرہ ہے ۔

(۱۱) مجھے کولم (واقع کارومنڈل) کی مسجد مالک بن دینار اور ساحل ملیبار کی متعدد مساجد مالک بن دینار کے دیکھنے کا سنہ ۱۹۳۷ع میں دوسری مرتبہ موقع ملا ۔ میں تعمیریات اور مہندس سے نابلد ہوں لیکن مجھے یہ سب مساجد ایک ہی نمونے اور نقشے کی معلوم ہوئیں بلکہ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ملیبار کی عام مسجدوں کا نمونہ مساجد مالک بن دینار سے بالکل الگ ہے ۔ ملیبار کی ان مسجدوں کے ساتھ قبرستان ہیں وہاں بہت سے پرانے

کتبے بھی نظر آئے لیکن وقت کی کمی کے باعث ان پر جو صرف چند منٹ صرف کیے جا سکے، وہ ان مٹے گھسے ہوئے الفاظ کو پڑھنے کے لیے قطعاً نا کافی ہیں۔ البتہ مقامی طور پر ان پرانی قبروں میں کسی صحابہ و تابعین کی طرف منسوب کوئی چیز سننے میں نہیں آئی ، مزید یہ کہ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو بھٹکل میں بھی (جو منگلور اور گوا کے مابین ایک بندرگاہ ہے) ایک مسجد مالک بن دینار ہے ۔ یہ بہ ظاہر ایک خالص عربی آبادی ہے کیونکہ شہر میں صرف مسلمان ہیں ۔ غیر مسلم ایک بھی نہیں اور آبادی کے آداب مجلس بھی خالص عربی ہیں جو کہیں اور ہند میں دیکھنے میں نہیں آئے۔ ملیبار کی طرح شہر بھٹکل میں (جو شمال کنڑا میں ہے) شافعی مذہب عام ہے ۔

(۱۲) مولانا غوث مرحوم سابق مدرس مدرسۂ دینیات سرکار عالی حیدرآباد نے ۲۳ ۔ سپٹمبر سنہ ۱۹۳۱ع کے روز نامہ ''صحیفہ'' حیدرآباد میں جو مضمون شایع کیا اس میں اس کتبے کی عبارت یوں پڑھی ہے :

اسمعیل بن

مالک ۱۰۹

بن دینار

اور اس کا حوالہ جامعۂ پارسی کے کلیہ علوم اسلامیہ رسالے (R. E. I.) بابتہ سنہ ۱۹۳۹ع میں صفحہ ۱۰۴ پر آیا ہے ۔ اور وہاں مضمون نگار نے ''سنہ ۱۰۹ھ (سنہ ۲۰۹ ہجری)'' لکھا ہے ۔ حال میں اس کتبے کی پشت پر محمد غوث صاحب مرحوم کی مذکور قراءت بھی کندہ کرا دی گئی ہے جو نہایت بد خط ہے خوف ہے کہ چند روز بعد کہیں اس کو اصل کتبہ نہ سمجھ لیا جانے لگے ۔ اصل کتبہ دوسرے رخ پر بالکل مٹ چکا ہے اور کار کے جوسے کالے پتھر پر ہے ۔

(۱۳) (Nauta) ایک خاص لاطینی لفظ ہے جس کے معنی ملاح کے ہیں ۔ بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے شام میں امیر معاویہ وغیرہ کے زمانے میں جب عربوں نے جہازرانی اور جہازسازی سے دلچسپی لی تو یہ لفظ عربی اگھسا اور خلفاء ہی کے زمانے میں بحر ہند تک مسلمانوں نے اسے لا پہنچایا ۔

نوایت کے متعلق کچھ بحث عبدالجبار ملکا پوری کی تاریخ دکن میں ہے ۔ مگر ان کے متعلق عبدالجبار ملکا پوری کی تاریخ دکن ''محبوب الوطن'' صفحہ ۴۰ پر لکھا ہے کہ باعانت بار موافق و مخالف مختلف بنادر میں پہنچے ۔ ہنود اس نئی قوم کو دیکھ کر اترنے میں مانع ہوئے ۔ آخر میں نہایت عاجزی و التجا کے بعد عہد و پیمان لے کر اترنے کی اجازت ملی ، اولاً انہیں بنادر میں قول و قرار نامہ دے کے فروکش ہوئے ۔ اقرار نامہ اس بات کا تھا کہ ہنود کی طرز روش میں رہیں اور لباس بھی اس دیس کا اختیار کریں ۔ عربائے اسلام نے بامر لاچاری بہ مصداق ضرب المثل جیسا دیس ویسا بھیس ہنود کا لباس اختیار کیا اور اہل اصنام کے ساتھ مل جل کر شیر و شکر کی طرح رہنے لگے اور مقتضائے حال کے موافق ہر ایک نے ایک پیشہ و حرفہ اختیار کیا ۔ کمال ہوشیاری سے زندگی بسر کرتے تھے، اسلامی شعار نہایت احتیاط سے ادا کرتے تھے، اذان و قرات قرآن اس طرح پڑھتے تھے کہ کوئی فرد ہنود نہ سنے ۔''

بہتر سلوک بعد کے زمانے کی چیز ہوگی جب مسلمان مفید رعایا اور جاں باز مددگار ثابت ہوئے اور ان کی تجارت سے راجاؤں کی آمدنی بڑھ گئی ۔

(مجلہ ''طیلسانین'' جلد ششم شمارہ ۳ ۱۳ سنہ ۱۹۴۲ع)

مندرجہ بالا تفصیل سے بہ خوبی واضح ہو سکتا ہے کہ دکن میں مسلمان کہاں کہاں اور کب آئے اور انہوں نے کہاں کہاں

اقامت کر لی تھی۔

دکن میں مسلمان بڑے تزک و احتشام کے ساتھ سنہ ۷۲۲ ھجری۔ سنہ ۱۳۱۰ء میں آئے۔ اس کے بعد دوبارہ سنہ ۱۳۲۳ء میں ورنگل فتح ھوا، یعنی علاء الدین خلجی اور اس کے سپہ سالار ملک کافور کی فتوحات سے اسلام دکن کے انتہائی جنوبی ساحل راس کماری تک پہنچا تھا۔

اس موقع پر یہ ظاھر کرنا ضروری ھے کہ ۷۲۵ ھجری سنہ ۱۳۲۳ء سے پہلے بیسیوں صوفیا نے دکن میں اقامت کر لی تھی۔ دکن کے مختلف شہروں میں آج تک ان کے مزار زیارت گاہ عام و خاص بنے ھوئے ھیں۔

یہاں پر صرف ایک فہرست ان صوفیا کی پیش کی جاتی ھے جنھوں نے دکن کے بعض شہروں میں سکونت کر لی تھی، اپنے زھد و تقویٰ اور کردار کی بلندی سے بہترین نقش یہاں کے اصلی باشندوں کے دل پر چھوڑ گئے اور اس کی وجہ سے ھزاروں ھندؤں نے اپنا آبادئی مذھب چھوڑ کر دین اسلام قبول کیا تھا۔ آج بھی دکن میں ایک حصہ ان اصحاب کا ھے جن کے آبا و اجداد نے بڑے ذوق اور شوق سے اسلام قبول کیا تھا۔

فہرست اولیا دکن[1]

نمبرشمار	نام	سنہ انتقال	بمقام مدفن	کیفیت
۱-	حاجی رومی	سنہ ۵۵۵ھ	بیجاپور	
۲-	سید شاہ مومن عارف اللہ	سنہ ۵۹۷ھ	دولت آباد	

۱- اس کی ترتیب ''تذکرہ اولیا دکن'' عبدالجبار خان، ''گلزار آصفیہ''، ''تاریخ خورشید جاھی'' اور ''مشکوۃالنبوت سے'' کی گئی ھے۔

نمبر شمار	نام	سنہ انتقال	بمقام مدفون	کیفیت
۳-	سید علاءالدین	سنہ ۶۱۲ھ	خاندیس	
۴-	باباسیدمظہرعالم	سنہ ۶۲۲ھ	ترچنا پلی	
۵-	شاہ جلال الدین گنج روان	سنہ ۶۴۴ھ	خلد آباد	
۶-	سید احمد کبیر حیات قلندر	سنہ ۶۵۹ھ	منگلور	
۷-	شاہ علی پہلوان	سنہ ۶۷۲ھ	عالم پور	
۸-	شاہ حسام الدین حسینی تیغ برہنہ	سنہ ۶۸۰ھ	گلبرگ	
۹-	صوفی سرمست شیخ محمد	سنہ ۶۸۰ھ	سکر	خلیفہ نظام الدین
۱۰-	بابا شرف الدین	سنہ ۶۸۷ھ	حیدر آباد	
۱۱-	باباشہاب الدین	سنہ ۶۹۱ھ	شمس آباد	(حیدر آباد)
۱۲-	سید اعزالدین	سنہ ۶۹۹ھ	گلبرگہ	
۱۳-	منور بادشاہ	سنہ ۷۰۰ھ	سکر	
۱۴-	پیر مقصود	سنہ ۷۰۰ھ	بیجا پور	
۱۵-	پیر جمنا	سنہ ۷۰۳ھ	بیجا پور	
۱۶-	سید علی شہید	سنہ ۷۰۵ھ	بیجا پور	
۱۷-	شاہ منتجب الدین زر زری بخش	سنہ ۷۰۹ھ	خلد آباد	خلیفۂ اول نظام الدین
۱۸-	خواجہ محمد	سنہ ۷۰۹ھ	خلد آباد	
۱۹-	خواجہ شمس الدین غازی	سنہ ۷۳۰ھ	عثمان آباد	
۲۰-	پیر میٹھی	سنہ ۷۳۲ھ	بیجا پور	
۲۱-	پیرمبارک کاروان	سنہ ۷۳۴ھ	خلد آباد	

نمبر شمار	نام	سنہ انتقال	بمقام مدفون	کیفیت
۲۲-	سید خولد میر علاءالدین جوہری	سنه ۷۳۴ھ	دولت آباد	
۲۳-	سید یوسف شاہ راجو قتال	سنه ۷۳۶ھ	دولت آباد	
۲۴-	حاجی سیاح‌شاہ سعیدالدین	سنه ۷۳۶ھ	قندھار ضلع ناندیڑ	
۲۵-	غریب فریدالدین	سنه ۷۳۸ھ	خلد آباد	
۲۶-	شاہ برہان‌الدین غریب	سنه ۷۳۸ھ	دولت آباد	
۲۷-	نجم‌الدین سعدی ہند سنجری	سنه ۷۳۸ھ	خلد آباد	
۲۸-	شیخ ضیاءالدین	سنه ۷۳۹ھ	گلبرگه	
۲۹-	شیخ سعد زنجانی	سنه ۷۴۰ھ	گلبرگه	
۳۰-	شاہ بدرالدین	سنه ۷۴۱ھ	پرینڈہ	
۳۱-	شاہ حزم قتال	سنه ۷۴۳ھ	خالدیس	
۳۲-	خواجه حسین	سنه ۷۵۰ھ	خلد آباد	
۳۳-	شیخ ابراهیم‌ستکانی	سنه ۷۵۳ھ	بیجا پور	
۳۴-	شیخ منہاج‌الدین	سنه ۷۵۴ھ	گلبرگه	
۳۵-	شیخ صلاح‌الدین تمنی	سنه ۷۵۹ھ	پونه	
۳۶-	شیخ حسام‌الدین علاءالدین	سنه ۷۶۳ھ	پونه	
۳۷-	بابا شاہ کوچک	سنه ۷۶۵ھ	بیڑ	
۳۸-	لاڈلے انصاری‌شیخ قتال زنجانی	سنه ۷۷۰ھ	الند	

نمبر شمار	نام	سنہ انتقال	مقام مدفون	کیفیت
۳۹-	سید زین الدین	سنہ ۷۷۱ھ	خلد آباد	
۴۰-	شیخ قطب الدین	سنہ ۷۷۷ھ	گلبرگہ	
۴۱-	شیخ سراج الدین جنیدی	سنہ ۷۸۱ھ	گلبرگہ	
۴۲-	شیخ عبدالعزیز عرف بابو	سنہ ۷۹۱ھ	برار	
۴۳-	شیخ عبداللہ العزالی	سنہ ۷۹۳ھ	بیجاپور	
۴۴-	گنج علی عین الدین	سنہ ۷۹۵ھ	بیجاپور	
۴۵-	شیخ محمد معجز کھنڈات	سنہ ۸۰۰ھ	بیجاپور	
۴۶-	سید علاءالدین ضیاءالحسنی چشتی	سنہ ۸۰۱ھ	دولت آباد	
۴۷-	ضیاءالدین غزنوی	سنہ ۸۰۵ھ	بیجاپور	
۴۸-	سید محمد اکبر ابن خواجہ بندہ نواز	سنہ ۸۱۲ھ	گلبرگہ	
۴۹-	خاکی شاہ	سنہ ۸۱۳ھ	اوسہ	
۵۰-	سید احمد بخاری	سنہ ۸۲۰ھ	مرج	
۵۱-	ابوالبرکات سید شاہ حافظ	سنہ ۸۲۵ھ	بیجاپور	
۵۲-	خواجہ بندہ نواز سید محمہ گیسو دراز	سنہ ۸۲۵ھ	گلبرگہ	
۵۳-	بدرالدین محمد بن احمد مکی	سنہ ۸۲۷ھ	گلبرگ	
۵۴-	سید شاہ محمد اصغر محمد محمد حسین	سنہ ۸۲۸ھ	گلبرگہ	
۵۵-	شاہ رکن الدین تولہ	سنہ ۸۳۰ھ	گلبرگہ	

نمبر شمار	نام	سنہ انتقال	مقام مدفون	کیفیت
۵۶-	شیخ احمد مخدوم بزرگ جنیدی	سنہ ۸۳۳ھ	موضع کرنجی	
۵۷-	شیخ علاءالدین گوالیاری	سنہ ۸۳۴ھ	برہان پور	
۵۸-	شیخ عین‌الدین ثانی	سنہ ۸۳۵ھ	بیجاپور	
۵۹-	سید نظام‌الدین ادریس	سنہ ۸۳۶ھ	مونکی	اورنگ آباد
۶۰-	احمد شاہ بہمنی	سنہ ۸۳۸ھ	بیدر	
۶۱-	شیخ‌علی‌شاہ سانکرے سلطان مشکل آسان	سنہ ۸۴۶ھ	قندھار	
۶۲-	شیخ الاسلام مخدوم شیخ کنجکی	سنہ ۸۴۹ھ	کرنجگی بیجاپور	
۶۳-	شیخ یوسف	سنہ ۸۵۰ھ	برہان پور	
۶۴-	ابوالفضل شاہ حمزہ حسین	سنہ ۸۵۰ھ	بیجا پور	
۶۵-	شاہ یداللہ عرف قبول‌اللہ	سنہ ۸۵۲ھ	گلبرگہ	
۶۶-	شیخ ابراہیم ملتانی	سنہ ۸۵۴ھ	بیدر	
۶۷-	سید شاہ جلال‌الدین الملقب شاہ چیدا حسینی	سنہ ۸۵۸ھ	گوگی ضلع گلبرگہ	
۶۸-	شاہ حبیب‌اللہ کرمانی	سنہ ۸۶۴ھ	گلبرگہ	
۶۹-	شاہ موسیٰ قادری	سنہ ۸۷۳ھ	خاندیس	
۷۰-	شاہ صدرالدین	سنہ ۸۷۶ھ	قصبہ پیپری	
۷۱-	ابوالفیض سید شاہ نعمت‌اللہ حسینی	سنہ ۸۷۹ھ	بیدر	
۷۲-	سیداسماعیل کھوڑوالی	سنہ ۸۸۲ھ	بیدر	

نمبر شمار	نام	تاریخ انتقال	بمقام مدفون	کیفیت
۷۳-	شاہ نظام الدین	سنہ ۸۸۲ھ	برہان پور	
۷۴-	ملک شاہ محمد (محمود گاوان)	سنہ ۸۸۶ھ	بیدر	
۷۵-	نورالدین صادق اللہ عرف سید شاہ محمد حسین	سنہ ۸۹۳ھ	احمد نگر	
۷۶-	سید شاہ شمس عالم حسینی	سنہ ۸۹۸ھ	رانچور	

دوسرا باب

دکن میں مسلمانوں کی سلطنتیں

دکن میں مسلمانوں کی کئی سلطنتیں قائم ہوئیں اور چھ سو سال سے زیادہ عرصے تک شان و شوکت، جاہ و جلال، رواداری اور انصاف پسندی کے ساتھ حکومت کرتی رہیں۔ جو سلطنتیں دکن میں قائم ہوئیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) سلطنت معبر وغیرہ کی حکومت سنہ ۷۳۷ہجری ۱۳۳۶ع سے سنہ ۷۷۹ ہجری تک۔

(۲) بہمنی حکومت سنہ ۷۴۷ ہجری ۱۳۴۵ع سے سنہ ۹۱۹ ہجری ۱۵۲۷ع تک۔

(۳) عادل شاہی حکومت۔ سنہ ۸۹۵ ہجری سے سنہ ۱۰۹۷ہجری

(۴) قطب شاہی حکومت۔ سنہ ۹۱۶ ہجری سے سنہ ۱۰۹۸ہجری

(۵) نظام شاہی حکومت۔ سنہ ۸۹۵ ہجری سے سنہ ۱۰۴۳ہجری

(۶) برید شاہی حکومت۔ سنہ ۹۲۴ ہجری سے سنہ ۱۰۶۷ہجری

(۷) عماد شاہی حکومت۔ سنہ ۸۹۴ ہجری سے سنہ ۹۸۲ ہجری

(۸) کرنول اور سدھوت کی۔ سنہ ۱۱۰۷ہجری سے سنہ ۱۱۹۱ہجری حکومت

(۹) والا جاہی حکومت۔ سنہ ۱۱۵۷ہجری سے سنہ ۱۲۷۱ہجری ارکاٹ

(۱۰) حکومت حیدر علی ٹیپو سلطان سنہ ۱۱۷۷ہجری ۱۷۵۷ع سے سنہ ۱۲۱۳ہجری ۱۸۰۰ع

(۱۱) آصفی حکومت سنہ ۱۱۳۶ہجری سے سنہ ۱۳۶۸ہجری ۱۹۴۸ع

معبر کی حکومت بیجا نگر کی سلطنت میں ضم ہوئی، بہمنی حکومت کو اس کے پانچ صوبے داراں نے تقسیم کر لیا اور یہ پانچ سلطنتیں یکے بعد دیگرے مغلیہ حکومت میں شامل ہو گئیں ۔ کرنول سدھوت کو حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے ختم کیا ۔ ارکاٹ کی والا جاھی اور میسوری ٹیپو سلطان کی حکومتوں کو انگریز نے هضم کر لیا ۔ سلطنت آصفیه کو اولاً انگریزوں نے اپنا باج گزار بنایا اور بالاخر ہندوستان کی کانگریسی عوامی حکومت میں ضم ہو گئی ۔

دکن میں مسلمانوں کی حکومتوں کے آغاز کو سنه ۷۰۳ هجری سے شمار کیا جائے تو واضع ہوتا ہے که سنه ۱۳۶۸ هجری میں چھ سو سال سے زیادہ عرصے تک دکن کے مختلف حصوں پر مسلمان حکومت کی نوبت بجاتے رہے ۔ اس چھ سو سال کے عرصے میں ان کا کلچر پھولا پھلا اور برگ و بار پیدا ہوئے، اس کی مختصر صراحت صفحات آینده میں ملے گی ۔ اولاً مختصر طور پر ان سلطنتوں کا تاریخی حال قلم بند کرنا ضروری ہے تا که ان کے کلچر کی بخوبی وضاحت ہو سکے ۔

سواحل ہند کی مسلمان حکومتیں

اهل عرب جنوبی ہند کے مغربی ساحل کو ملیبار اور مشرق ساحل کو ''معبر'' کہتے تھے ۔ مغربی ساحل کے شہروں میں کوچین ، کالی کٹ ، سندا پور ، هنور وغیره ، مشرق ساحل میں مدراس ، پٹن ، نیگا پٹم اور رامیشورم وغیره مشہور شہر تھے ۔

سلطان علاءالدین خلجی اور اس کے سپه سالار ملک کافور کی فتوحات کے بعد دکن میں حالات بدلتے رہے ۔ سلطان محمد تغلق نے دھلی کے تخت پر متمکن ہونے کے کچھ عرصے کے بعد دیوگر (دولت آباد) کو اپنا پایۂ تخت بنایا مگر پھر دھلی کو واپس ہوئے ۔ اس افرا تفری

میں دکن میں بھی کئی سلطنتیں قائم ہوگئیں ان میں بعض مسلمانوں کی حکومتیں تھیں اور چند ہندو سلطنتیں بن گئیں ۔ معبر کی اسلامی سلطنت کا حال حکیم سید شمس اللہ قادری نے ''سلاطین معبر'' کے نام سے ایک تاریخ میں قلمبند کیا ہے ۔ معبر کی سلطنت کا بانی سید حسن کتھلی کے سادات سے تھا ۔ اس نے جلال الدین احسن اپنا لقب اختیار کیا تھا اور سنہ ۷۳۷ھجری ۱۳۳۶ع سے سنہ ۷۴۰ھجری ۱۳۳۹ع تک حکومت کرتا رہا ۔ اس کے بعد غیاث الدین پھر ناصر الدین یہاں کے بادشاہ ہوئے ۔ ان کا دارالسلطنت معبر کا مشہور شہر مدورا تھا[1]۔

ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامہ مدورا کا جو حال قلمبند کیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ بڑا شہر تھا ، کوچہ و بازار کشادہ اور وسیع تھے چنانچہ اس کی صراحت حسب ذیل ہے :

''مدورا ایک بڑا شہر ہے ۔ بازار اور کوچے نہایت وسیع ہیں ۔ اول ہی اول اس کو میرے خسر سید جلال الدین احسن نے اپنا دارلسلطنت بنایا تھا ، اور دھلی کی نقل پر اس کی بنیاد ڈالی اور اچھی اچھی عمارتیں بنوائیں[2]۔

اس موقع پر ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامے میں معبر کے بادشاہ کے عنوان سے جو صراحت کی ہے اس کا مختصر اقتباس یہاں موجب دلچسپی ہو گا جو حسب ذیل ہے :

فصل (۲) معبر کے بادشاہ

معبر کا بادشاہ غیاث الدین افغانی تھا وہ پہلے ملک مجیربن ابی الرجا کے سواروں میں نوکر تھا اور یہ امیر سلطان محمد تغلق

۱- ''سلاطین معبر'' صفحہ (۱۳)

۲- ''عجائب الاسفار'' صفحہ (۳٦۰)

کے خادموں میں سے تھا اس کے بعد سلطان جلال الدین کے بیٹے امیر حاجی کا ملازم ہو گیا اور اس کے بعد بادشاہ بن بیٹھا ۔ اس کو پہلے سراج الدین کہتے تھے ۔ جب بادشاہ ہو گیا تو اس نے سلطان غیاث الدین لقب اختیار کیا ۔ یہ معبر کا ملک پہلے سلطان دھلی کے ماتحت تھا ، لیکن اس سے میرا خسر شریف جلال الدین احسن شاہ باغی ہو گیا پانچ برس اس نے بالاستقلال حکومت کی پھر وہ قتل کیا گیا ۔ اسی کا ایک امیر علاءالدین خلجی بادشاہ ہوا ۔ ایک سال بعد اس نے کسی ہندو راجا پر چڑھائی کی اور بہت سا مال لوٹ کر اپنے ملک کو واپس آیا ۔ دوسرے سال پھر چڑھائی کی اور بہت سے کافروں کو مار کر ان کو شکست دی ۔ اس نے لڑائی میں ایک دن پانی پینے کے لیے اپنے سر پر خود اٹھایا اس وقت اس کے ایک تیر آ لگا فوراً مر گیا۔ اس کے بعد اس کے داماد قطب الدین کو بادشاہ بنایا گیا، لیکن وہ اچھی خصلت کا نہ نکلا۔ اس کو چالیس دن کے بعد مار ڈالا گیا ۔ اس کے بعد سلطان غیاث الدین کو بادشاہ بنایا گیا ۔ اس نے سلطان جلال الدین کی بیٹی کے ساتھ ، جس کی بہن کے ساتھ دھلی میں میرا نکاح ہوا تھا ، نکاح کر لیا ۔ جب میں کیمپ کے قریب پہنچا تو اس نے میرے استقبال کے لیے ایک حاجب کو بھیجا وہ لکڑی کے برج میں بیٹھا ہوا تھا۔ دستور ہے کہ بادشاہ کے روبرو کوئی بے موزے پہنے نہیں جا سکتا۔ میرے پاس اس وقت موزے نہ تھے۔ ایک ہندو نے مجھے موزے دیے حالانکہ بہت سے مسلمان موجود تھے ۔ میں نے اس ہندو کی مروت پر تعجب کیا ۔ میں بادشاہ کے سامنے گیا ۔ مجھے بیٹھ جانے کا حکم دیا اور قاضی حاجی صدرالزماں بہاءالدین کو بلوایا اور اس کے قریب تین خیمے مجھے ٹھہرنے کے لیے دیے اور فرش اور کھانا یعنی چاول اور گوشت بھجوائے ۔ اس ملک میں بھی ہمارے ملک کی طرح کھانے کے بعد دودھ کی لسی پیتے ہیں۔

پھر میں بادشاہ کے پاس گیا اور اس کو مالدیپ میں لشکر بھیجنے کی ترغیب دی ۔ اس نے ارادہ پختہ کر لیا ، جہاز بھی مقرر کردیے اور وہاں کی ملکہ کے واسطے تحفے اور امیروں اور وزیروں کے واسطے خلعتیں بھی تیار کیں ۔ مجھے ملکہ کی بہن کے ساتھ اپنا نکاح کرنے کے لیے وکیل مقرر کیا اور حکم دیا کہ تین جہازوں میں جزیرے کے محتاجوں کے لیے صدقہ روانہ کیا جائے اور مجھ سے کہا کہ پانچ دن کے بعد واپس آ جاؤ ۔ امیرالبحر خواجہ سرلک نے کہا کہ جزائر مالدیپ کی طرف تین مہینے تک سفر کرنا ممکن نہیں ۔ مجھے بادشاہ نے کہا کہ پٹن کو چلا جا اور جب یہ عرصہ منقضی ہو جائے تو دارلخلافہ مترا میں واپس آ جائیو اور پھر وہاں سے روانہ ہو جانا [1]۔

سلطنت معبر سنہ ۷۷۹ہجری ۱۳۷۷ع تک قائم رہی ۔ اس اسلامی ریاست کو دکن کی کسی اسلامی سلطنت سے مدد نہیں ملی ۔ اس زمانے میں راجگان بیجانگر کی قوت و شکوت عروج پر تھی ۔ انھوں نے اس سلطنت کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔[2] اس طرح معبر کی اسلامی حکومت ختم ہو گئی ۔

جیسا کہ قبل ازیں تذکرہ کیا گیا ہے کہ جنوبی ہند کے مغربی ساحل کو عرب ملیبار کہتے تھے ۔ یہاں کی اسلامی سلطنت کا حال ''تاریخ فرشتہ'' میں نہایت مختصر ہے چنانچہ اس نے جو صراحت کی ہے وہ حسب ذیل ہے ۔

''مالک بن حبیب نے مع دیگر مسلمانوں کے سب سے پہلے کدنکاور میں مسجد تعمیر کرائی ۔ مکانات و باغات تعمیر کر کے اس ملک میں فروکش ہوئے ۔ تھوڑے زمانے کے بعد مالک بن حبیب

۱- سفرنامے ابن بطوطہ عجائب الالشفاء ص ۳۵۵، ۳۵۶
۲- سلاطنین معبر صفحہ (۱۹)

اپنے عیال و فرزندان کے ہمراہ ملابار کی سیر کے لیے روانہ ہوئے۔ سب سے پہلے کولم میں وارد ہوئے۔ اس مقام پر بھی کدنکلور کی طرح مساجد و مکانات و باغات کا پورا انتظام کر کے اپنے عیال و اطفال کو کولم میں چھوڑا اور خود ہلی مارادی میں وارد ہوئے۔ یہاں بھی مناسب انتظام کر کے حزقین، قندریہ، فاکنور، منگلور و کالنجی کوٹ کی سیر کی اور ہر شہر میں مساجد و مکانات و باغات کا پورا انتظام کر کے ہر مقام پر مسلمانوں کو آباد اور ان کو صوم صلواۃ و اذان کی وصیت کر کے خود کولم واپس آئے۔ ملابار کے اکثر مسلمان شافعی مذہب ہیں، اس سے قیاس ہے کہ مالک بن حبیب وغیرہ تمام مسلمان امام شافعی کے مقلد تھے۔

غرض کہ رفتہ رفتہ مسلمانوں کی آمد و شد اس ملک میں زیادہ ہوئی اور ملابار کے اکثر حکام نے دین اسلام قبول کیا۔ ہند کرہ، دابل و جیولی وغیرہ کے راجاؤں نے بھی حکام ملابار کی تقلید کر کے عرب تاجروں کو سواحل دریا پر مساکین تعمیر کرانے کی اجازت دی اور ان کو نوایت کے لقب سے جس کے معنی خداوند یعنی صاحب و آقا کے ہیں مخاطب کیا۔[1]

ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامے میں سلطان جمال الدین کا تذکرہ کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہاں کے معاشرت وغیرہ پر بھی صراحت کی ہے، چنانچہ اس کی صراحت حسب ذیل ہے۔

فصل (۴) ھنور

دوسرے دن صبح کو ھنور میں پہنچے۔ یہ شہر ایک بڑی

۱۔ ترجمہ اردو ''تاریخ فرشتہ'' (جامعۂ عثمانیہ) جلد چہارم صفحہ ۸۳۰ و ۸۳۱۔

کھاڑی پر واقع ہے جس میں جہاز جا سکتے ہیں ۔ یہ سمندر سے لصف میل کے فاصلے پر واقع ہے۔برسات کے موسم میں سمندر بہت چڑھتا ہے ۔ اس میں طوفان آتا ہے تو چار مہینے تک کوئی شخص سوا مچھلی کے شکار کرنے کے سمندر میں نہیں جاتا۔ جب ہم ھنور میں پہنچے تو ایک جوگی ہمارے پاس آیا اور مجھے چھے دینار دے گیا اور مجھ سے کہا کہ جس برھمن کو تونے تسبیح دی تھی اس نے یہ دینار بھیجے ہیں۔ میں نے اس سے یہ دینار لے لیے اور اب میں اس کو کچھ دینار دینے لگا ، اس نے نہ لیے اور چلاگیا ۔ میں نے اپنے ھمراھیوں سے یہ بات کہی اور کہا کہ اگر تم چاھتے ہو تو اپنا اپنا حصہ لے لو ۔ انھوں نے کہا نہیں اور اس وقت مجھے بتلایا کہ پہلے جو چھے دینار تم نے ہم کو دئیے تھے ، اس میں ہم نے چھے دینار اور ملا کر اس جگہ جہاں جوگی بیٹھا ہوا تھا رکھ دیے ہیں ۔ مجھے اور بھی زیادہ تعجب ہوا اور یہ دینار میں نے احتیاط سے اپنے پاس رکھے ۔ شہر ھنور کے باشندے شافعی مذھب ہیں وہ دین‌دار ، نیک بخت اور بحری طاقت کے لیے مشہور ہیں ، سندا پور فتح ہونے کے بعد ان کو زمانے نے خوار کردیا ۔ اس کا ذکر میں عنقریب کروں‌گا ۔ اس شہر کے عابدوں میں سے شیخ محمد ناگوری ہیں ۔ انھوں نے میری دعوت اپنی خانقاہ میں کی ۔ وہ اپنا کھانا آپ پکاتے ہیں تا کہ غلام اور لونڈی کے ناپاک ہاتھ نہ لگیں ۔ فقیہ اسماعیل جو کلام اللہ پڑھاتے ہیں ۔ اس شہر میں رھتے ہیں وہ نہایت پرھیزگار ، خوش خلق اور فیاض ہیں ۔ اس شہر کا قاضی نورالدین علی ہے ۔ خطیب کا نام مجھے یاد نہیں رہا ۔ اس شہر کی عورتیں اور اس ساحل کی تمام عورتیں سلا ہوا کپڑا نہیں پہنتیں ، بلکہ بے سلا ہوا کپڑا اوڑھتی ہیں ۔ چادر کے ایک آنچل سے تمام بدن لپیٹ لیتی‌ہیں اور دوسرے

آنچل کو سر اور چھاتی پر ڈال لیتی ہیں ۔ یہ عورتیں خوبصورت اور باعفت ہوتی ہیں ۔ اس شہر میں تیرہ مکتبیں لڑکیوں کے اور تیئیس مکتبیں لڑکوں کے دیکھے ۔ سوا اس شہر کے یہ بات میں نے کہیں نہیں دیکھی ۔ یہ لوگ فقط تجارت بحری سے گزارہ کرتے ہیں ، زراعت نہیں کرتے ۔ مالابار کے لوگ بھی سلطان جمال الدین کو کچھ معین خراج دیتے ہیں کیونکہ اس کے پاس بحری طاقت بہت بڑی ہے اور چھ ہزار پیادہ اور سوار بھی رکھتا ہے ۔ یہ بادشاہ جمال الدین محمد بن حسن بڑا نیک بخت ہے ۔ وہ ایک ہندو راجا کا ماتحت ہے ۔ جس کا نام ہریب ہے اس کا ذکر میں انشاءاللہ تعالیٰ عنقریب کروں گا ۔ سلطان جمال الدین ہمیشہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا ہے ۔ اس کا دستور ہے کہ صبح ہونے سے پہلے مسجد میں چلا جاتا ہے اور صبح ہونے تک تلاوت کرتا رہتا ہے ۔ اول وقت نماز پڑھتا ہے ۔ پھر شہر کے باہر سوار ہوکر چلا جاتا ہے ۔ چاشت کے وقت واپس آتا ہے، پہلے مسجد میں دوگانہ پڑھتا ہے پھرمحل میں جاتا ہے ایام بیض کے روزے رکھتا ہے ۔ جب میں اس کے پاس ٹھہرا ہوا تھا تو افطار کے وقت مجھے بلا لیتا تھا ۔ علی (ب تمی) اور فقیہ اسماعیل بھی موجود ہوتے تھے ۔ زمین پرچار چھوٹی کرسیاں ڈال دیتے تھے ان میں سے ایک پر وہ خود بیٹھ جاتا تھا اور باقی تین پر ہم تینوں ۔ کھانوں کی ترتیب یہ تھی کہ اول تانبے کے دستر ، خوان جس کو خونچہ کہتے ہیں ، لاتے تھے۔ اس پر ایک طباق تانبے کا رکھتے ہیں۔ اس کو طالم کہتے ہیں۔ اس کے بعد ایک کنیز ریشمی کپڑے پہنے آتی ہے اور کھانے کی دیگچیاں لاتی ہے ۔ بڑے بڑے تانبے کے چمچے بھی لاتی ہے ۔ چاولوں کا ایک ایک چمچ بھر کر طباق میں ڈالتی ہے ۔ اس کے اوپر گھی ڈالتی ہے اور اس طباق میں دوسری

طرف مرچوں کا اچار ، ادرک کا اچار ، لیموں کا اچار اور آم کا اچار رکھ دیتی ہے ۔ ایک ایک لقمے کے پیچھے اچار کھاتے ہیں ۔ جب یہ چاول ہو چکتے ہیں تو دوسرا چمچہ بھر کر طباق میں ڈالتی ہے اور اس پر مرغے کا گوشت سرکے میں پکا ہوا ڈالتی ہے ۔ اس کے ساتھ چاول کھا لیے جاتے ہیں جب یہ چاول ہو چکتے ہیں تو تیسرا چمچہ ڈالتی ہے ۔ اس پر مرغی کا گوشت دوسری طرح کا پکا ہوا ڈالتی ہے ۔ پھر طرح طرح کی مچھلی ہر ایک چمچے کے ساتھ ڈالی جاتی ہے ۔ پھر سبزی گھی میں پکی ہوئی لاتی ہے جو چاولوں کے ساتھ کھائی جاتی ہے ۔ جب یہ سب کھانے ہو چکتے ہیں تو کوشان یعنی دھی یا لسی لاتی ہے ۔ اس پر کھانا ختم ہو جاتا ہے ۔ جب یہ دھی لاتی ہے تو جاننا چاہیے کہ سب کھانے ختم ہو چکے۔ اس کے بعد گرم پانی پیتے ہیں کیونکہ برسات میں ٹھنڈا پانی مضر ہوتا ہے ۔ میں اس بادشاہ کے پاس دوسری دفعہ گیارہ مہینے ٹھہرا تھا اور اتنے دن تک کبھی روٹی نہیں کھائی کیونکہ ان لوگوں کی خوراک فقط چاول ہے ۔ اس طرح جب تک میں جزائر مالدیپ ، سلان ، ملیبار اور معبر میں تین برس رہا تو سوا چاول کے اور کچھ نہ کھایا یہاں تک کہ میں ان کو پانی کے ساتھ نگلتا تھا ورنہ منہ میں نہیں چلتے تھے ۔ یہ بادشاہ ریشم اور باریک کتان کے کپڑے پہنتا ہے ، کمر میں چادر باندھتا ہے ، رضائیاں ایک پر دوسری لگا کر اوڑھتا ہے ، اپنے بالوں کوگوندھا ہوا رکھتا ہے اور اس پر چھوٹا سا عمامہ باندھتا ہے ۔ جب سوار ہوتا ہے تو قبابھی پہن لیتا ہے اور اس کے اوپر رضائی اوڑھ لیتا ہے ۔ اس کے آگے لوگ نقارے اور طبل بجاتے ہیں اور بجاتے ہوئے جایا کرتے ہیں ۔ اس دفعہ ہم اس کے پاس فقط تین دن ٹھہرے تھے ۔ اس نے ہمیں

زاد راہ دیا'' ۱ ـ ـ ـ ـ

فصل (۵) ملیبار

وہاں سے چل کر ہم تین دن کے بعد ملیبار ' کی حد میں پہنچے یہ وہ ملک ہے جہاں سیاہ مرچ پیدا ہوتی ہے ۔ اس ملک کا طول دو مہینے کا رستہ ہے اور دریا کے کنارے کنارے سنداپور سے کولم تک چلا گیا ہے ۔ سڑک پر برابر دو رویہ درخت ہیں پھر نصف میل کے بعد ایک لکڑی کا مکان آتا ہے ۔ جس میں دوکانیں اور چبوترے بنے ہوئے ہیں اور ہر مسافر ہندو ہو یا مسلمان آرام کرتا ہے ۔ ہر ایک گھر کے پاس کنواں ہے ، جس پر ایک ہندو پانی پلاتا ہے ۔ ہندوؤں کو برتن میں پانی پلاتا ہے اور مسلمانوں کو اوک سے پلاتا ہے ۔ اس کے ہاتھوں پر جو وہ منہ کے سامنے کر لیتا ہے پانی ڈالتا رہتا ہے ۔ جب وہ اشارے سے منع کرتا ہے ۔ تو بند کر دیتا ہے ۔ ملیبار میں دستور ہے کہ مسلمان کو گھر میں نہیں آنے دیتے اور نہ اپنے برتنوں میں کھانا کھلاتے ہیں۔ اور اگر کھلاتے ہیں تو وہ برتن توڑ ڈالتے ہیں ، یا کسی مسلمان کو ہی دے دیتے ہیں ۔ جس جگہ مسلمان نہ ہو تو وہ مسلمان کے لیے کھانا پکا دیتے ہیں اور کیلے کے پتے پر رکھ دیتے ہیں ۔ اس پر سالن ڈال دیتے ہیں جو باقی بچتا ہے اس کو پرندے اور کتے کھا لیتے ہیں ۔ اس رستے میں تمام منزلوں پر مسلمانوں کے گھر ہیں ۔ ان کے پاس مسلمان مسافر جا اترتے ہیں اور وہ ہر ایک چیز خرید کر ان کے لیے کھانا پکا دیتے ہیں ۔ اگر مسلمانوں کے گھر نہ ہوتے تو اس ملک میں

---

۱ ''عجائب الاسفار'' ص ۲۷۸ تا ۲۸۰

مسلمانوں کے لیے سفر کرنا مشکل تھا ۔ اس دو مہینے کے رستے میں ایک چپہ بھر بھی زمین ایسی نہیں جو آباد نہ ہو ۔ ہر ایک شخص کا گھر علیحدہ علیحدہ ہے اور اس کے گرد چمن ہوتا ہے اور ہر ایک چمن کے گرد لکڑی کی دیوار ہوتی ہے ۔ کل سڑک باغوں کے درمیان سے گذرتی ہے ، جب ایک باغ ہو چکتا ہے تو اس کی دیوار میں سیڑھیاں لگی ہوئی ہوتی ہیں ۔ اس سے چڑھ کر دوسرے باغ میں پہنچتے ہیں ۔ کوئی شخص اس ملک میں گھوڑے یا کسی اور جانور پر سوار ہوکر نہیں چلتا ۔ گھوڑے پر فقط بادشاہ سوار ہوتا ہے ۔ اکثر لوگ یا تو ڈولے (پالکی) پر سوار ہوتے ہیں، جس کو مزدور یا غلام اٹھا کرلے جاتے ہیں یا پیدل چلتے ہیں خواہ کوئی ہو ۔ اگر کسی شخص کے پاس اسباب تجارت وغیرہ یا ساز و سامان زیادہ ہو تو وہ مزدور کرائے پر کر لیتا ہے ، وہ اپنی سروں پر اسباب لے جاتے ہیں ۔ چنانچہ بعضے سوداگر ایسے نظر آئیں گے کہ ان کے ساتھ سو سو آدمی اسباب اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں ۔ ہر ایک مزدور کے ہاتھ میں ایک موٹا عصا ہوتا ہے ، جس کے نیچے لوہے کی میخ لگی ہوتی ہے اور اوپر لوہے کا آنکڑا ہوتا ہے ۔ جب وہ تھک جاتا ہے اور کوئی دوکان ٹھہرنے کے واسطے قریب نہیں ہوتی تو زمین میں اپنا عصا گاڑ دیتا ہے اور اس پر اسباب کی گٹھری لٹکا دیتا ہے ۔ جب سانس لے چکتا ہے تو اسباب اٹھا کر چل پڑتا ہے ۔ میں نے کسی رستے میں ایسا امن نہیں دیکھا جیسا کہ اس رستے میں' [1]۔

دکن کی بہمنی حکومت

اس امر کا تذکرہ ہو چکا ہے کہ دکن میں پہلے پہل مسلمان

۱۔ ''عجائب الاسفار'' ص ۲۸۱ ، ۲۸۲

تبلیغ اسلام کے لیے آئے تھے اس کے بعد شمال کے حلمے ہوئے اور دکن مسلمانوں کی حکومت میں آگیا ۔

دکن کے کچھ حصے کو علاء الدین خلجی کے سپہ سالار ملک کافور نے سنہ ۱۳۱۰ع میں فتح[1] کرکے راس کماری تک پہنچا دیا تھا۔ اس کے بعد سنہ ۷۲۲ھجری (سنہ ۱۳۲۳ع) میں ورنگل دوبارہ فتح ہوا ، اس کا نام سلطان پور رکھا گیا[2]۔ پھر وہ زمانہ آتا ہے جب کہ محمد تغلق نے دیو گڑ دولت آباد کو ہندوستان کا پایۂ تخت قرار دیا ، اس طرح دکن محمد تغلق کے زیر نگین رہا ۔

مگر محمد تغلق کے عہد میں ہی پایہ تخت دولت آباد سے دھلی کو منتقل ہوگیا ۔ محمد تغلق کے آخری زمانے میں سارے ملک میں انتشار پیدا ہوگیا اور سلطنت دھلی کے گویا حصے بکھرے ہونے لگے ۔ دکن میں بہمنی سلطنت قائم ہوگئی ۔ ظفر خاں علاءالدین بہمنی شاہ کے لقب سے خود مختار بادشاہ بن گیا[3]۔

علاءالدین حسن نے اپنی فتوحات سے سلطنت کو بہت وسعت دی ۔ انتقال کے وقت بہمنی سلطنت کے حدود شمال میں ماندا سے شروع ہو کر جنوب میں دریائے تنگبھدرا تک اور مشرق میں مھونگیر تک اور مغرب میں گوا تک وسیع ہوگئے تھے[4] ۔

علاءالدین حسن ایک اچھا علم دوست بادشاہ تھا ۔ اس کے دربار میں مولانا لطیف اللہ ، ملا اسحاق سر ھندی ، ملا حکیم علیم الدین تبریزی ، حکیم نصرالدین شیرازی ، شریف سمرقندی ۔ اور رضی الدین جگاجوت جیسے نامی عالم جمع تھے[5]۔

۱- ترجمہ ''تاریخ فرشتہ'' جلد اول صفحہ ۳۹۹ تا ۴۰۰ ۔
۲- ترجمہ ''تاریخ فرشتہ'' جلد ۲
۳- ''بہمنی سلطنت'' صدیقی صاحب
۴- ''بہمنی سلطنت'' صدیقی صاحب ۔
۵- ''بہمنی سلطنت'' صدیقی صاحب

مولانا عصامی بھی سلطان محمد تغلق سے ناراض ہو کر بہمنی دربار میں آگئے تھے اور بادشاہ کی سر پرستی میں ایک مبسوط تاریخ نظم میں لکھی جو ''فتوح السلاطین'' کے نام سے موسوم کی گئی تھی ۔ یہ تاریخ محمود غزنوی سے شروع ہو کر علاءالدین حسن پر ختم ہوتی ہے[1]

علاءالدین حسن بہمنی شاہ کا انتقال سنہ ۱۳۵۸ع میں ہوا [2] ۔

محمد شاہ ثانی سنہ ۱۳۵۸ع میں مسند نشین ہوا [3] ۔ یہ بانی سلطنت علاءالدین حسن کا پوتا تھا ۔ مورخین نے اس کے اخلاق و عادات کی بڑی تعریف کی ہے ۔ اس کے زمانے میں سلطنت اچھے سلیقے سے چلتی رہی ۔ قانون کی پابندی اور عدل و انصاف کا بول بالا رہا ۔ علم و فن کی ترقی ہوئی ۔ محمد شاہ خود علم دوست تھا ۔ بچپن سے اس کو علم و فن سے دلچسپی تھی ۔ علامہ فضل اللہ انجو جیسے صاحب علم و دنیائے اسلام کے مشہور علامہ جو سعد الدین تفتا زانی کے شاگرد رشید تھے، اس کے زمانے میں شیراز سے دکن آئے، ان کے علم و فضل کی بادشاہ نے بڑی قدر کی [4] ۔ علامہ فضل اللہ کی وجہ سے کئی اور علماء دکن میں جمع ہوگئے ۔ شعراء کی قدر دانی ہونے لگی ۔ خواجہ حافظ کو دکن آنے کی دعوت دی گئی ، مگر خواجہ صاحب سمندر کے سفر سے ڈر گئے، دکن آنے کا ارادہ ترک کر دیا ، محمد شاہ کی عطیے کے شکریے میں ایک غزل ارسال کر دی[5] ۔

اس غزل کا مطلع اور مقطع درج کیا جاتا ہے ۔

دمے باغم بسر بردن جہاں یک سر نمی ارزد
بہ مئے بفروش دلق ما کزین بہتر نمی ارزد

۱- ''تاریخ فرشتہ'' ۔
۲- ''بہمنی سلطنت'' ۔
۳- ''بہمنی سلطنت'' ۔
۴- ترجمہ ''تاریخ فرشتہ'' جلد سوم صفحہ (۷۲)
۵- ''بہمنی سلطنت'' ۔

چو حافظ در قناعت کوش و از دنیائے دون بگذر
که یک جوسنت دو ناں به صله من زر نمی ارزد

سلطنت بہمنیہ کے بڑے بڑے شہروں مثلاً گلبرگہ ، بیدر ، قندھار ، دولت آباد ، جنیر ، ایلچپور اور دابیل وغیرہ میں مدرسے قائم کیے گئے تھے ، جہاں قابل اساتذہ درس دیتے تھے ۔ طلبا کے لیے وظایف جاری تھے[1] ۔

بہمنی سلطنت کا دوسرا علم دوست ، صاحب علم فرمان روا فیروز شاہ ہے ۔ سنہ ۱۳۹۷ع (سنہ ۸۰۰ ہجری) میں مسند حکومت پر جلوہ گر ہوا اور کم و بیش پچیس سال تک حکومت کرتا رہا ۔ اس کا دور حکومت سلطنت بہمنی کے عروج کا زمانہ ہے ۔ اس کے زمانے میں سیاسی تدبر اور تدبر مملکت سے ملک کو بلند منزل پر پہنچایا گیا اور دوسری طرف پاکیزہ تمدن اور بہترین کلچر سے ملک کو زینت دی گئی ۔

فیروز شاہ اپنی علمی قابلیت میں مشہور تھا ۔ اس نے میر فضل اللہ کی شاگردی میں اس زمانے کے تمام علوم متداول کی تحصیل کی تھی ۔ وہ تحصیل علوم کے ساتھ ساتھ دنیا کی کئی زبانوں سے واقف تھا ۔ عربی ، فارسی ، ترکی کے علاوہ ہندوستان کی کئی زبانوں اور یورپین زبانوں میں گفتگو کرتا تھا ۔ اگر ایک طرف تفسیر ، حدیث ، فقہ کا عالم تھا تو دوسری طرف ریاضی ، ہندسہ ، طبعی اور اخلاق علوم سے بھی باخبر تھا ۔ خصوصاً ریاضی سے اس کو بڑی دلچسپی تھی[2] ۔

فیروز شاہ کا آخری زمانہ اس کے لیے ساز گار ثابت نہیں ہوا ۔ اس نے اپنے فرزند حسن خان کو اپنا ولی عہد بنایا تھا ۔ مگر عوام اس کے بھائی احمد خان المخاطب خان خاناں کے طرف دار تھے ۔ حسن بصری ایک عراقی تاجر اس کی مدد کر رہا تھا ۔ بہرحال بادشاہ

۱- ''بہمنی سلطنت'' صفحہ ۹۲ - ۹۳ -
۲- ''تاریخ فرشتہ'' صفحہ ۹۰ و ۱۰۹

کے مقابلے میں عوام کو غلبہ حاصل ہوگیا ۔ گلبرگہ کے قریب فیروز شاہ اور احمد خان کی لڑائی ہوئی مگر عین لڑائی کے موقع پر فیروز شاہ پر غشی طاری ہوگئی اور اس کے مرنے کی خبر مشہور ہوئی ۔ اس کے دو امیر عین الملک اور نظام الملک مریض بادشاہ (فیروز شاہ) کی پالکی کو قلعے کے اندر لے بھاگے ۔ قلعے کے قریب فیروز شاہ کو ہوش آ گیا ۔ ادھر کی تمام شاہی فوج احمد خان کے علم کے نیچے آ گئی اور احمد خان کے بادشاہی کا اعلان ہوگیا ۔ فیروز شاہ نے قدرت کے اس فیصلے کے سامنے اپنی تدبیر کو ناکام پا کر قدرت کے فیصلے پر سر جھکا دیا اور اپنے بیٹے کو چچا کی اطاعت کرنے کی ہدایت کی ۔ احمد خان بھائی کے پاس حاضر ہوا ۔ فیروزشاہ بڑی خوشی کے ساتھ بھائی سے ملا اور کہا کہ میں نے اپنے بیٹے کے لیے جو کچھ کیا وہ میرا فطرتی تقاضا تھا ، لیکن خدا کی یہ مرضی نہیں تھی ۔ تم دراصل سلطنت کے مستحق اور قابل ہو ۔ احمد خان الخاطب خان خانان ۵ شوال سنہ ۸۲۵ ھجری ۱۴۲۲ء کو تخت نشین ہوا[1] اور دس روز کے بعد یعنی ۱۵ شوال کو فیروز شاہ کا انتقال ہوگیا ۔

سلطان احمد شاہ بہمنی سنہ ۸۲۵ ھجری میں تخت نشین ہوا اور بارہ سال کی حکمرانی کے بعد سنہ ۸۳۷ ھجری (سنہ ۱۴۳۴ء) میں انتقال کیا[2] ۔ اس نے اپنا دارالسلطنت گلبرگہ کے بجائے ''بیدر'' کو بنایا ۔ زمانۂ مابعد میں اس شہر نے بڑی ترقی کی اور دنیا کے مشہور شہروں کے مد مقابل بن گیا ۔ شہر کی مغربی جانب قلعہ اور شاہی محلات تعمیر ہوئے یہ محلات بہت بلند ، وسیع اور کشادہ تھے۔ ان کی بلندی دیکھ کر لوگ ششدر ہو جاتے تھے ۔ جس محل میں

---

۱ ۔بہمنی سلطنت ''تاریخ فرشتہ'' جلد سوم صفحہ ۱۳۸ ۔

۲۔ ''بہمنی سلطنت'' ۔

تخت فیروزہ تھا اس کو تخت محل سے موسوم کیا گیا تھا اور ملک الشعراء آذری نے اس محل کے لیے حسب ذیل قطعہ موزوں کیا تھا :

حبذا قصر مشید کہ زفرط عظمت
آسمان سدہ از پایہ ایں درگاہ است
آسمان ہم نتواں گفت کہ شرط ادب است
قصر سلطان جہاں احمد بہمن شاہ است

احمد شاہ اپنے بھائی کی طرح ذی علم اور علم دوست تھا ۔ اس کے زمانے میں جو لڑائیاں ہوئیں وہ کامیاب ثابت نہیں ہوئیں ، جس کی وجہ سے بہمنی سلطنت کو نقصان پہنچا اور وقار کو دھکا لگا ۔ لیکن تمدنی لحاظ سے ملک کو ترقی ہوئی ۔

احمد شاہ بہمنی کے بعد اس کا فرزند علاء الدین ثانی ، پھر ہمایوں شاہ ، اس کے بعد نظام شاہ اور نظام شاہ کے بعد محمد شاہ ثانی بیدر کے تخت بہمنی پر جلوہ گر ہوئے ۔ علاء الدین نے اپنی حکومت کے زمانے قلمرو بہمنی میں شفا خانے تعمیر کیے ۔ جہاں مریضوں کا علاج ہو ۔ ان کو دوا اور غذا مفت دی جاتی تھی ۔ ہندو طبیبوں کو تنخواہیں دی جاتی تھیں ۔ ان امور کے لیے کئی گاؤں وقف کر دیے تھے[1] ۔

سلطان علاءالدین بڑا فصیح اور بلیغ تھا ، فارسی بہت اچھی جانتا تھا ۔ دوسرے علوم میں بھی کافی مہارت رکھتا تھا ۔ کبھی کبھی جمعہ اور عیدین میں جامع مسجد میں خود خطبہ پڑھتا تھا[2] ۔

سنہ ۸۶۲ ہجری میں علاء الدین[3] کا انتقال ہوا ۔ ہمایوں شاہ اپنے جور و ظلم کے باعث بہمنی سلطنت کا بدنام بادشاہ ہے ، مگر

۱۔ ترجمہ ''تاریخ فرشتہ'' جلد سوم صفحہ ۱۳۴
۲۔ ترجمہ ''تاریخ فرشتہ'' جلد سوم صفحہ ۱۳۹
۳۔ ترجمہ ''تاریخ فرشتہ'' جلد سوم صفحہ ۱۸۰

اس کے زمانے میں بھی علم کی ترقی ہوئی ۔ ظاہر شاہ استر آبادی ، ملا محمد تقی اور نظری اس کے درباری شعراء تھے ۔ ہمایوں کے بعد نظام شاہ بادشاہ ہوا ۔ دو سال میں انتقال کر جانے سے محمد شاہ ثانی بہمنی تخت و تاج کا ملک بنا ۔

ملک التجار خواجہ محمود گاواں اور خواجہ جہاں ترک، سلطنت کے زبردست مشیر اور امیر تھے ۔ صدر جہاں شوستری جو اس زمانے کے بہت بڑے عالم تھے ، کمسن بادشاہ کی تعلیم کے لیے مامور کیے گئے، جس کی وجہ سے بقول فرشتہ فیروز شاہ بہمنی کے بعد خاندان بہمنی کا علم دوست، ذی علم اور شائستہ بادشاہ محمد شاہ ثانی ھی تھا ۔ چند روز کے بعد خواجہ جہاں نے غداری شروع کر دی اور مخدومہ جہاں نے جو نوجوان بادشاہ کی صاحب فہم و فراست ماں تھی ، اس فتنے کو بڑھنے نہیں دیا ۔ خواجہ جہاں قتل کر دیا گیا ، اب ملک التجار محمود گاواں خواجہ جہاں کے خطاب کے ساتھ امیر الامرا اور وکیل مطلق کی خدمت پر مامور ہوا ۔ اس طرح اس کا مرتبہ اور رتبہ بلند ہو گیا ۔

بہمنی سلطنت میں سیف‌الدین غوری کے بعد محمود گاواں ھی زبردست وزیر اعظم ثابت ہوا جو تمام سلطنت پر چھا گیا تھا ۔ محمد شاہ کے زمانے کا ایک افسوس ناک واقعہ دکھنی و غیر دکھنیوں کی کش مکش ھے ۔ جو علاء الدین کے زمانے سے ھی آغاز ہو چکی تھی ۔ اب محمود گاواں کے باعث پردیسیوں کی (غیر دکھنی) سرپرستی ہونے لگی[1] دونوں کے نفاق کے باعث سلطنت کو سخت نقصان پہنچا اور بالآخر سلطنت بہمنی ختم ہو گئی ۔

محمد شاہ ثانی کے عہد میں محمود گاواں کے تدبر اور فراست

۱- ''بہمنی سلطنت'' ۔

کے باعث ملک کو وسعت حاصل ہوئی ۔ بہمنی قلمرو کے حدود بہت بڑھ گئے اس لیے قلمرو بہمنی کو چار صوبوں کے بجائے آٹھ صوبوں میں تقسیم کیا گیا اور آٹھ صوبے دار "طرف دار" کے ناموں سے مقرر کیے گئے ، جن میں سے عماد الملک برار پر ، یوسف عادل شاہ بیجا پور پر ، قطب الملک گولکنڈہ (تیلنگانہ) پر ، اور نظام الملک جنیر (احمد نگر) پر متعین ہوئے تھے[۱] ۔ اس دور کا افسوس ناک واقعہ محمود گاواں کا قتل ہے اس کے بعد سلطنت کو زوال ہونے لگا ۔

محمد شاہ ثانی کے بعد اس کا لڑکا محمود شاہ ثانی اور احمد شاہ اور اس کے بعد علاء الدین سوم بادشاہ ہوئے۔ لیکن ان کی حکومت برائے نام تھی ۔ علاء الدین سوم کے بعد ولی اللہ کلیم اللہ بھی بہمنی سلسلے میں منسلک ہیں ، جن کا حکومت پر کوئی اقتدار نہیں تھا بلکہ بریدی شاہی حکمران حکومت کرتے تھے اور برائے نام ان کو بادشاہ رکھا گیا تھا ۔

کلیم اللہ کے مرنے پر سنہ ۹۳۴ ھجری (سنہ ۱۵۲۷ع) بہمنی حکومت کا خاتمہ ہو گیا ۔[۱]

(۳) بیجا پور کی عادل شاہی حکومت

بیجاپور کی عادل شاہی حکومت کا بانی یوسف عادل شاہ ہے ، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ سلاطین عثمانیہ ترکی کے خاندان سے تھا ۔ بہمنی حکومت کے دور میں بیجاپور کا صوبے دار تھا ۔ بہمنی حکومت کے کم زور ہونے پر سنہ ۸۹۵ ھجری میں یوسف عادل شاہ نے بیجاپور میں حکومت قائم کر لی ۔ یکے بعد دیگرے نو اشخاص حکومت کرتے رہے ۔ بالآخر سکندر عادل شاہ کے دور

۱- ترجمہ "تاریخ فرشتہ" جلد سوم ص ۲۶۵

میں عالمگیر نے بیجاپور کو فتح کرکے حکومت عادل شاہی کا خاتمہ کر دیا ۔

یوسف عادل شاہ اپنی قابلیت کے لحاظ سے اپنے عہد میں ممتاز تھا ۔ فارسی شاعری میں مہارت رکھتا تھا اس کے ساتھ فن موسیقی سے بھی دلچسپی تھی ۔ دور دور سے علماء اور اصحاب علم کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دیتا اور ان کو قیمتی تحائف ارسال کرتا تھا ۔ مشہور مورخ فرشتہ نے اس کے علم دوستی اور علما کی سرپرستی کی بڑی تعریف کی ہے ۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ''اس دور میں حنفی ، شافعی اور شیعی علما بڑے خلوص اور محبت سے ملتے تھے اور باہم کسی طرح کا بغض اور کینہ نہ رکھتے تھے[۱] ۔'' آگے چل کر اس مورخ نے حسب ذیل صراحت کی ہے :

''یوسف عادل شاہ دور اندیش اور تجربہ کار فرماں روا تھا یہ بادشاہ شجاعت ، سخاوت ، عدالت ، اور علم وغیرہ اور دوسرے محاسن کا مجموعہ تھا ۔ ذاتی اوصاف کے علاوہ علمی کمالات سے بھی عاری نہ تھا ۔ علاوہ خوش‌خط ہونے کے علم و شاعری کا بھی اچھا ماہر تھا - بادشاہ کو علم موسیقی میں کمال پورا حاصل تھا ۔ طنبور و عود کو نہایت عمدگی سے بجاتا اور اس فن کے استادوں کی بے حد قدر کرتا تھا [۲] ''

یوسف عادل شاہ کی ملکہ ایک مرہٹہ سردار مکٹ راؤ کی بہن تھی ۔ اس کو اس نے پونجی خانم کے نام سے موسوم کیا تھا ۔ اس ملکہ سے یوسف کو ایک لڑکا اسماعیل عادل شاہ اور تین لڑکیاں تولد ہوئیں ۔ ایک برہان نظام شاہ کو بیاہی گئی ، دوسری شیخ علاء الدین عمادالملک اور تیسری احمد شاہ بہمنی سے بیاہی گئی ۔

---

۱ - ۲ ترجمہ ''تاریخ فرشتہ'' جلد سوم صفحہ ۲۶۵
ترجمہ ''تاریخ فرشتہ'' جلد سوم صفحہ ۲۷۲

سنہ ۹۱۶ ہجری میں یوسف عادل شاہ کا انتقال ہوا ۔

یوسف کے بعد اس کا فرزند اسماعیل مسند حکومت پر جلوہ گر ہوا اور طویل حکمرانی کے بعد سنہ ۹۴۱ ہجری میں وفات پائی ۔ باپ کی طرح یہ بھی علم دوست اور صاحب علم اور شاعر تھا ۔ وفائی اس کا تخلص تھا ۔ چنانچہ اس کے عمدہ کردار کے متعلق فرشتہ نے حسب ذیل صراحت کی ہے :

"اسماعیل عادل شاہ برد بار کریم اور سخی تھا ۔ اس کی عالی ہمتی سے ملک کی آمدنی اخراجات کے لیے کافی نہ ہوتی تھی ۔ بادشاہ عفو تقصیر اورخطا کاروں کے گناہ پرچشم‌پوشی کرنا زیادہ پسندکرتا تھا ۔ عمدہ کھانا کھانے اور اچھا کپڑا پہننے کی کوشش کرتا تھا ۔ بادشاہ فحش الفاظ کبھی زبان سے نہیں نکالتا تھا اور ہمیشہ عالموں اورفاضلوں کے پاس بیٹھتا اور ان کے مرتبے کو اچھی طرح سمجھتا تھا ۔ علم موسیقی اور شاعری کو اسماعیل عادل شاہ ہمیشہ دوست رکھتا تھا ۔ بادشاہ کا تخلص وفائی تھا اور سچ یہ ہے کہ دکن کے کسی بادشاہ نے اسماعیل عادل شاہ کے سے لطیف اور متین اشعار نظم نہیں کیے[۱] "

اسماعیل کے بعد ملوکی کی چند ماہی حکومت کے بعد ابراہیم عادل شاہ اول سنہ ۹۴۱ ہجری میں بادشاہ ہوا ۔ اپنے باپ دادا کی طرح صاحب علم اور علم دوست تھا ۔ اس نے اپنے باپ دادا کے مذہب شیعہ کو ترک کر کے سنی مذہب اختیار کیا، اس کی وجہ سے ایرانی اثر دربار میں کم ہو گیا ۔ دکن کے ارباب کمال اس کے مقرب بن گئے ۔ اس کی وجہ سے دکھنی زبان کو عروج ہوا اسماعیل کے متعلق فرشتہ نے جو صراحت کی ہے وہ یہ ہے :

" ابراہیم عادل شاہ بڑا بہادر تھا اپنی مردانگی اور شجاعت

---

۱ - ترجمہ "تاریخ فرشتہ" جلد چہارم صفحہ ۳۴

کی وجہ سے کسی بات کو خیال میں نہیں لاتا تھا اور سیلاب کے مانند نشیب ہو یا فراز سر پٹ دوڑتا ہواچلا جاتاتھا ۔ اس کے قہر و غضب کی شہرت بھی اس کی بردباری کی طرح دنیا کے ہر گوشے میں پھیلی ہوئی تھی'' [۱] ۔

ابراھیم کے بعد اس کا فرزند علی عادل شاہ اول مسند حکومت عادل شاہ پر سنہ ۹۶۵ ھجری میں متمکن ھوا ۔ اپنے باپ دادا کی طرح یہ بھی صاحب علم تھا۔ اس کو مطالعے کا ایسا شوق تھا کہ سفر میں بھی چار سو صندوق کتابوں کے ساتھ رھا کرتےتھے ۔ اس کے کتب خانے میں بیسیوں کاتب ، خوش نویس ، مجدول اور نقاش مامور تھے ۔ اس نے سنی مذھب ترک کر کے شیعہ مذھب اختیار کر لیا جو اس کے دادا اور اجداد کا مذھب تھا ۔ ملا فتح اللہ شیرازی جن کو اھل عراق عقل ھادی عصر کے لقب سے یاد کرتے ھیں ۔ زر کثیر دے کر طلب کیا - بادشاہ کے ساتھ اس کا وزیر افضل خان شیرازی بھی صاحب علم تھا ۔ بادشاہ اور وزیر کے مکانوں میں علمی جلسے ھوا کرتے تھے۔ محمد علی استاد کار ، سید مصطفےٰ خان ، شاہ عبدالحسن اور شاہ ابو القاسم رنجو جیسے علماء اس کے درباری زینت بنے ھوئے تھے ۔ ملا محمد رضا مشھدی المتخلص بہ رضائی درباری شاعر تھا ۔ علی عادل شاہ کے متعلق فرشتہ نے یہ صراحت کی ھے :

''علی عادل شاہ بڑا سخی تھا ۔ ابراھیم عادل شاہ نے ایک کرور طلائی اور بے شمار قیمتی جواھرات اور موتی خزانے میں چھوڑے تھے ۔ علی عادل شاہ نے باپ کا تمام اندوختہ اور نیز خود اپنے عہد کی تمام دولت ایران ، توران ، عرب و روم اور دیگر ممالک کے فضلاء اور مستحقین کو عطا کر دی ۔ بادشاہ کی وفات کے وقت خزانے میں سوا زر کرناٹک کے جو آخری عہد میں مصطفےٰ خان کی کوشش سے حاصل ھوا تھا

---

۱ - ترجمہ ''تاریخ فرشتہ'' جلد چہارم صفحہ ۳۶

اور کوئی دولت موجود نہ تھی بلکہ اس رقم کا بھی ایک بہت
بڑا حصہ درویشوں محتاجوں کے نزر ہو چکا تھا۔ "[۱]

سنہ ۹۸۸ھ میں علی عادل شاہ اول شہید ہوگیا اور اس کی جگہ اس کا بھتیجا ابراہیم ثانی عادل شاہی حکومت کا فرمان روا ہوا۔ اس کی کم سنی کے باعث اول تو کئی سال تک نایب حکومت کرتے رہے۔ ان امرا کی وجہ سے جو نائب مقرر ہوئے سلطنت کا شیرازۂ حکومت پریشان ہوتا رہا۔ مگر جب ابراھیم نے حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی تو اس کو اپنے ہمسایوں سے کئی جنگیں کرنی پڑیں۔ مگر اس کے ساتھ ھی علم اور ادب کو ترقی ہوتی رھی۔ نہ صرف احمد نگر سے کئی ارباب علم بیجا پور آگئے بلکہ ایران ، توران اور حجاز سے بھی اصحاب علم اور ارباب سلوک بیجاپور میں آتے رہے۔

دکن کا مشہور مورخ فرشتہ اس کے عہد میں بیجاپور آیا تھا۔ ابراھیم کے کردار کے بڑی تعریف کرتا ہے۔ دوسرے مورخین ابراھیم کے علم و فضل اور اصحاب علم کی سرپرستی کی تعریف کرتے ھیں۔ ابراھیم کو شاعری اور موسیقی سے بڑی دلچسپی تھی ان دونوں دلچسپیوں کا ثبوت اس کی کتاب "نورس" سے ملتا ہے۔ لفظ 'نورس ، سے اس کو بڑی دلچسپی تھی اسی نام پر ایک شہر آباد کیا ، قلعہ بنایا ، درباری شاعر عبدالقادرکو نورس کا لقب دیا ، شاھی مہر پر 'نورس' کندہ تھا۔ بدو ابراھم کو خوش خطی سے بھی دلچسپی تھی۔ بادشاہ کے مختلف صفات کی وجہ سے اس کو عوام نے "جگت گرو" کا خطاب دیا۔ چنانچہ مولف "بساتین السلاطین" نے حسب ذیل صراحت کی ہے :

"درمیان عالم۔ بجگت گرو مشہور گردیدہ این لفظ دراصل
دکھنی است مردم برصورت و سیرت آں بادشاہ حمیدہ خصال
پسندیدہ افعال بجان راضی خوش حال بودہ در باب او این لفظ

۱- ترجمہ "تاریخ فرشتہ" جلد چہارم صفحہ ۸۷ -

باستعمال آورند ۔ معنی آن شاہ جہان است''۔

مخطوطہ صفحہ (۳۸)

سنہ ۱۶۲۸ع میں ابراہیم کا انتقال ہوا اور اسی کی جگہ اس کا فرزند محمد عادل شاہ مسند حکومت بیجاپور پر جلوہ گر ہوا ۔ ۱۰۶۷ھ (۱۶۵۶ع) تک حکمرانی کی نوبت بجاتا رہا ۔ محمد عادل شاہ کی حکومت میں اس کے باپ کی طرح ایک طرف جنگ و جدل اور معرکہ آرائیوں سے مملو ہے تو دوسری طرف علم و فن کی ترویج اور آبیاری کے لیے مشہور ہے ۔

محمد عادل شاہ کا دور حکمرانی کئی وجوہ سے اہمیت رکھتا ہے ۔ ایک طرف جنگ و جدل کی ہنگامہ آرائی ہوتی رہی اور دوسری طرف علم و فن کی آبیاری سے بیجاپور کی علمی دولت میں اضافہ ہوتا رہا ۔ احمد نگر کی نظام شاہی حکومت نے دو مرتبہ فوج کشی کی مگر دونوں مرتبہ ناکام لوٹنا پڑا[1] ۔

محمد عادل شاہ کو نہ صرف اپنی ہمسایہ احمد نگر کی حکومت سے معرکہ آرائی کرنی پڑی بلکہ مغلیہ سلطنت کے بھی حملے ہوئے ۔ جہانگیر اور شاہ جہاں نے عادل شاہی سلطنت کو نیچا دکھانے کی کوششیں کیں[2] ۔

حکومت عادل شاہی کو ملک کے بعض باغی اور خود سر امیروں کی بغاوت کا بھی سامنا کرنا پڑا ۔ ان میں شاہ جی اور اخلاص خاں کی بغاوتیں خصوصیت رکھتی ہیں[3] ۔

ان لڑائیوں کے علاوہ محمد عادل شاہ نے ملک گیری بھی کی چنانچہ سلطنت کے حدود وسیع ہو گئے ۔ نہ صرف کرناٹک کا حصہ

۱۔ ''بساتین السلاطین'' مطبوعہ مطبع سیدی حیدر آباد صفحہ ۲۸۳ و ۲۸۵ ۔

۲۔ ''بساتین السلاطین'' صفحہ ۲۹۳ و ۲۹۴ و ۳۱۴ ۔

۳۔ ''بساتین السلاطین'' صفحہ ۳۹۰ ۔

بلکہ تلنگانہ کا ایک حصہ بھی فتح ہوگیا اور قلعۂ چنجی سر ہوکر[1] موجودہ صوبۂ مدراس کا ایک حصہ عادل شاہی حکومت کا جزو بن گیا تھا۔

یہ امر واقعہ ہے کہ محمد عادل شاہ کو اپنے باپ کے ورثے میں جو سلطنت ملی تھی اس کو اس نے اپنی فتوحات سے وسیع کر لیا تھا۔ اگرچہ ملک کا ایک حصہ مغلیہ سلطنت میں شامل ہو جانے سے عادل شاہی حکومت کے حدود کم بھی ہوگئے۔

محمد عادل شاہ کے بعد علی عادل شاہ ثانی کا دور حکومت شروع ہوا سنہ ۱۰٦۷ھ (سنہ ۱٦۵٦ع) علی عادل شاہ نے صرف انیس سال کی عمر میں عادل شاہی حکومت کی عنان اپنے ہاتھ میں لی تھی درباری شاعر عبدالنبی نے

"نوبت شاہی زدہ بعد محمد علی"

سے تاریخ[2] نکالی۔ محمد عادل شاہ کی طرح علی عادل شاہ کا دور حکمرانی بھی جنگ و جدل سے لبریز ہے۔ چنانچہ شاہ جہان کی طرف سے اورنگ زیب عالمگیر نے حملہ کرکے بیدر اور کلیانی وغیرہ پر قبضہ کر لیا[3]۔ اب بیجاپور کی باری تھی مگر شاہ جہان کی علالت کے باعث عالمگیر عارضی صلح کرکے دہلی کو واپس ہوگیا۔[4]

اورنگ زیب کی صلح کے بعد عادل شاہی حکومت ابھی سنبھلنے نہیں پائی تھی کہ پھر جنگ کے بادل منڈلانے لگے۔ سیواجی نے سرتابی کی۔ افضل خان کا دھوکے سے مارا جانا تاریخ کا ایک دردانگیز واقعہ ہے۔ اس جرم کی سزا دینے کےلیے سدی جوہر المخاطب صلابت خان بھیجا گیا مگر سیوا جی سے صلابت خان ہموار ہوگیا۔

۱۔ "بساتین السلاطین" صفحہ ۳۲۸۔
۲۔ "بساتین السلاطین" صفحہ ۳٦۴۔
۳۔ "بساتین السلاطین" صفحہ ۳٦۵۔
۴۔ "بساتین السلاطین" صفحہ ۴۲۳۔

اس لیے اب خود بادشاہ کو اپنے باغی امیروں کی بیخ کنی کی جانب متوجہ ہونا پڑا ۔ صلابت خاں قلعۂ پنالہ میں محصور ہوکر طالب عفو ہوا اور پھر سرتابی کی آخر شکست کھا کر اپنی بغاوت کی پاداش میں مر گیا[۱] ۔

علی عادل شاہ کے مصائب کا سلسلہ اس پر ختم نہیں ہوا۔ سلطنت عادل شاہی اعداء کے نرغے میں تھی لیکن نوجوان سلطان نے اپنی فراست ، دانشمندی اور قابلیت کے بل بوتے ان مشکلات پر غالب آنے کی کوشش کی ۔ چنانچہ سلطنت میں کچھ علاقے بھی شامل ہو گئے ۔ بدنور اور ملیبار وغیرہ فتح ہو گئے[۲] ۔

اب سیوا جی نے پھر سر اٹھایا ۔ اورنگ زیب کے حسب خواہش علی عادل شاہ نے اس کے قلع قمع پر کمر باندھی ۔ عالمگیر نے جے سنگھ کی سپہ سالاری میں سیوا جی سے لڑنے کے لیے فوج روانہ کی ۔ مگر اس فوج کے پہلے ہی عادل شاہ نے سیواجی کو شکست دے دی تھی اور وہ پونہ کی جانب فرار ہوگیا ۔ پونہ کا محاصرہ جے سنگھ نے کیا ۔ مگر دونوں ساتھی بن کر بیجاپور پر حملہ آور ہوئے دو سال کی مسلسل جد و جہد کے بعد مغلیہ فوج ناکام واپس ہوگئی[۳] ۔

پھر سیواجی نے حملہ کیا مگر صلح ہو گئی اس عرصے میں علی عادل شاہ کی عمر کا پیمانہ لبریز ہوگیا پینتیس سال کی عمر میں سفر آخرت پیش آیا ۔

''بادشاہ دین علی کرد وطن بر جناں''[٤]

تاریخ وفات ہے ۔

۱۔ ''بساتین السلاطین'' از صفحہ ۳۶۹ تا ۳۷۹ ۔
۲۔ ''بساتین السلاطین'' از صفحہ ۳۹۰ تا ۳۹۳ ۔
۳۔ ''بساتین السلاطین'' از صفحہ ۳۹۶ تا ۴۲۸ ۔
۴۔ ''بساتین السلاطین'' صفحہ ۴۳۷ ۔

علی عادل شاہ کے بعد اس کا کم سن فرزند سکندر عادل شاہ کو مسند حکومت پر بٹھایا گیا ۔ اس کے چودہ سالہ حکومت میں سیواجی کے حملے اور اورنگ زیب کے معرکے خصوصیت سے قابل تذکرہ ہیں ۔ مغلیہ تاجدار نے دکن کو پوری طرح قلم رو مغلیہ میں شامل کرنے کا تہیہ کر لیا تھا ۔ چنانچہ اس سلسلے میں سنہ ۱۰۹۷ھ[1] (سنہ ۱۶۸۶ع) میں بیجاپور فتح ہوا اور عادل شاہی دو سو سالہ حکومت کا خاتمہ ہوگیا ۔

علمی اور ادبی پس منظر

عادل شاہی حکومت کے زیر بحث سوسالہ علمی اور ادبی خدمات کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ گذشتہ سو سال کی طرح اس سو سال میں بھی علمی سرپرستی ہوتی رہی ۔ ادبی کارناموں کی حوصلہ افزائی کا سلسلہ برابر جاری رہا ۔ ادبی شہ کار فارسی اور اردو زبان میں مرتب و مدون ہوتے رہے ۔ بیسیوں کتابیں لکھی گئیں جن میں سے بعض زندگی جاوید کی مستحق ثابت ہوئیں ۔

محمد عادل شاہ کے زمانے میں آتشی نے ''خمسہ نظامی'' کے جواب میں پانچ مثنویاں لکھیں ۔ ظہوری کے فرزند ملا ظہور نے ''محمد نامہ'' مرتب کیا ۔ ملا محمد حسین نے رفیع‌الدین شیرازی کی کتاب ''احوال السلاطین'' کا تکمیلہ کیا ۔ محمد ابراہیم صنعتی ۔ قاضی نوراللہ ، مقیمی، مرزا دولت کی علمی کاوشیں منظرعام پر آئیں[2]۔

محمد عادل شاہ کی ملکہ خدیجہ سلطانہ شہر بانو کی علم دوستی اور ادب نوازی کے باعث رستمی اور ملک خوشنود کے تصانیف عالم وجود میں آئے ۔

محمد عادل شاہ کے زمانے میں تعلیم کو وسعت ہوئی ۔ مدارس

۱- ''بساتین السلاطین'' صفحہ ۵۳۹

۲- ''بساتین السلاطین'' صفحہ ۳۳۳ تا ۳۳۵

کھولے گئے طلبا کو وظائف جاری ہوئے[1]۔ اصحاب علم کو فکرمعاش سے مستغنی کیا جاتا رہا ۔

علی عادل شاہ علم کی آبیاری اور اصحاب علم و فن کی قدردانی میں اپنے باپ دادا سے کم نہیں رہا ۔ علماء فضلاء فکر معاش سے مستغنی ہوکر علم کی خدمت کرتے رہے شعراء اور ادیب سلطان کے دست کرم سے نہال ہوئے۔ قاضی نوراللہ نے ''تاریخ عادل شاہ'' قلمبند کی ۔ نصرتی نے ''علی نامہ'' اور ''گلشن عشق'' جیسی بلند پایہ کتابیں تصنیف کیں ۔ اس کے عہد کے مورخ قاضی نوراللہ کے علاوہ دوسرے مورخ بھی سلطان کی علمی سر پرستی اور فنون لطیفہ کی مہارت ۔ موسیقی ۔ شاعری خصوصاً اردو شاعری سے دلچسپی لینے کا تذکرہ کرتے ہیں۔ چنانچہ مولف ''بساتین‌السلاطین'' لکھتا ہے۔

اماچون طبع همایون بادشاه اکثر میل بجانب لغت خاص خویش یعنی زبان دکھنی داشت ۔ بر طبق الناس علی دین ملوکہم ۔ شعرائے ہندی گوبسیار از خاک بیجا پور برخاسته اند خانه بخانه هنگامه شعر تازه گوئی گرم داشته اند ازاں طبقه یکے میان نصرتی است که بر نصرت طبع وقار و مساعدت ذهن ثاقب تیغ زبان برکشیده فتح اقلیم سخنوری کرده بملک الشعرائے

چون[2] کہ بادشاہ کو اپنی خاص زبان یعنی دکھنی (قدیم اردو) سے رغبت تھی اور بقول اس مقولے کے کہ عوام بادشاہ کے طریقے پر چلتے ہیں اس‌لیے خاک بیجا پورسے بہت سارے دکھنی‌گو شاعر پیدا ہوئے جنھوں نے بازار شاعری گرم کر رکھا تھا ان میں سے ایک میاں نصرتی ہے اس نے''گلشن‌عشق'' اور''علی‌نامہ'' قلمبندکیا ۔ دوسرے میاں ہاشمی ہیں جو شاہ ہاشم کے فیض سے

١۔ ''بساتین لسلاطین'' صفحہ ٣٣٦

٢۔ تاریخ کی اصل عبارت فارسی ہے اس کا ترجمہ یہاں پیش کیا گیا ہے ۔

مسلم شد اشعار تازه مضامین و
خیالات مطبوع و رنگین او مقبول
بر دیده رضا گذشته بر صدق این
مطالب در نتیجه طبعے وقادش یکے
گلشن عشق که در عشق بازی
منهر کشور و بد مالتی باز بسته
است دوم ''علی نامه'' که در
فتوحات ممدوح عهد خود علی
عادل شاه برداشته است ۔

. . . . نیز از جمله هندی
گویان آن زمان یکے میان هاشمی
است که به فیض سعادت دهن
مبارک حضرت شاه هاشم قدس
سره زبان شیرین بیان کشاده . . . .
یکے از شعرائے آن زمان میرزا
مرثیه خوان است که زبان
خود وقف حمد رب العالمین و
نعت حضرت سیدالمرسلین و
منقبت ائمه طاهرین و مرثیه
سید الشهدأ شهدائے کربلا
نموده هرگز زبان خویش را مدح
اهل دین از شاه و گدایان بود
و مرثیه هائے او در ان زمان
مقبول خاص و عام و مشهور
بلاد دکهن بود . . . . شاه
ابوالمعالی و ملا عبدلرزاق رفعت

مستفید ہوئے۔ تیسرا مرزا ہے
جس نے سوائے مرثیہ اور نعت
کے کوئی اور صنف سخن میں طبع
آزمائی نہیں کی ابوالمعالی، ملا
عبدالرزاق رفعت، عبدالقادر،
عبداللطیف اور عبدالنبی ان کے
علاوہ فارسی اور اردو کے کئی
اوربلند شاعر موجود تھے ۔

و عبدالقادر و عبدالطیف و
عبدالنبی و سوائے اینہا شعرائے
چند از اہل ایران و عجم نیز
بودا ند . . .'

علی عادل شاہ کی علمی دلچسپی اور اس کے بہترین کردار کا تذکرہ اور تو اور خود عالمگیری مورخ خافی خان نے حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے ۔

"بادشاہ بود باہوش سپاہ دوست و در سخاوت و شجاعت و وسعت خلق مشہور فضلاء وصلاء را دوست داشتے وشاعران را حرمت نمودے ۔ خصوصاً در حق شاعران ہندی زیادہ مراعات می فرمود ۔
(از اردوے قدیم بحوالہ "منتخب اللباب" جلد دوم۹۰۳)

ایک ایسا بادشاہ تھا جو فوج کو عزیز رکھتا تھا سخاوت شجاعت اور وسعت اخلاق کے باعث مشہور تھا ۔ فضلاء اور وصلاء کو دوست رکھتاتھا شاعروں کی قدر کرتا تھا خصوصاً اردو کو شعرا کی بڑی قدر دانی کیا کرتا تھا ۔

مصنف "فتوحات عادل شاہی" نے بھی علی عادل شاہ کے علمی شغف کی داد دی ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے :

"بادشاہے بود سلیم النفس کریم الطبع صوفی وضع بے تقلید بے تکلف در کمال مہربانی و شفقت با خلق اللہ درکرم و بخشش نظر خرد نداشت چو آوازہ جود و سخا او در عرصہ ربع سکون

ایک ایسا بادشاہ تھا جو سلیم النفس اور کریم الطبع اور صوفی منشی کے باعث مشہور تھا ۔ بے تقلید بے ضرر رعایا پر مہربان سخاوت اور بخشش میں اپنی آپ نظیر تھا ۔ چونکہ

۱۔ "بساتین السلاطین" صفحہ ۴۳۰ تا ۴۳۳

شہرت کرد از اقطاع عالم ارباب استعداد بر آورند"[1]	اس کی جود و سخا کا شہرہ تمام دنیا میں پھیل گیا تھا ۔ اس لیے ہر ملک سے قابل اشخاص آتے تھے ۔

علی عادل شاہ کے بعد جب سکندر عادل شاہ مسند نشیں ہوا تو اس کے دور میں اگرچہ جنگی مصائب کا ایک سیلاب امنڈ آیا تھا مگر اس کے باوجود علم کی گرم بازاری میں فرق نہیں آیا نصرتی نے "تاریخ اسکندری" قلمبند ۔ کی دوسرے کئی اصحاب علم نے ادبی کارنامے پیش کیے ۔ جن میں بیسیوں اردو تصانیف شامل ہیں ۔ بہرحال عادل شاہوں کے آخری سو سال بھی ماسبق سو سال کی طرح علمی کاوشوں ، ادبی شہ پاروں ' تاریخی دستاویزات کی تصنیف کے علاوہ شاعری' موسیقی اور مصوری جیسے فنون لطیفہ کی سرپرستی کے لحاظ سے تاریخ میں یادگار ہے ۔ ان کے زمانے کے ادبی شاہ کار آج تک موجود ہیں اور اپنی گوناگوں خوبیوں کے لحاظ سے خراج تحسین حاصل کرتی ہیں ۔ اس دور کے ادیبوں اور شاعروں نے جو نقش چھوڑے ہیں ان کو زمانہ مٹا نہیں سکتا اور حوادثات محو نہیں کر سکتے ہیں ۔ اس دور کے اردو کارنامے بہت زیادہ دستیاب ہوتے ہیں جن کی صراحت آگے آتی ہے ۔

تمدنی و معاشرتی پس منظر

اس دور کے تمدن' تہذیب' کلچر اور معاشرت پر نظر ڈالی جائے تو واضع ہوتا ہے کہ دکن کی اسلامی حکومت نے جو روایات چھوڑے تھے اور جس کی نشو و نما عادل شاہوں کے ابتدائی سو سال میں ہوتی رہی وہی ، تمدن و تہذیب پروان چڑھا ۔ کھانے پینے ، پہننے اوڑھنے' رہنے سہنے کے جو طریقے رواج پا گئے تھے وہ باقی

۱- صفحہ ۲۳۳ قلمی انڈیا آفس۔

رہے اس تمدن و تہذیب میں اگر ایک طرف اسلامی روایات، ایرانی، مغل اور ترکی مراسم نے جگہ لی تھی، تو دوسری طرف ہندی روایات بھی شامل ہوگئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں اور ہندوؤں کے طریقۂ معاشرت اور رسم و رواج میں کچھ فرق بھی نظر آتا ہے۔ اس زمانے کے جو مرقعے ملتے ہیں، ان سے صاف واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے لباس، کھانے پینے اور رہنے سہنے کے طریقے جدا گانہ تھے۔

مسلمان مرد لمبی قبا، تنگ آستین کی استعمال کرتے تھے۔ بعض اوقات ایک نیم آستین کی قبا اس کے اوپر ہوتی تھی۔ پائجامہ کبھی تنگ اورکبھی گھیر دار استعمال ہوتا تھا۔ عام طور پر عمامہ باندھا جاتا تھا، جس پر کبھی پھندنا بھی ہوتا تھا۔ جنگ کے وقت خود، زرہ اور بکتر استعمال ہوتے تھے۔ عورتوں کے لباس میں لہنگا، دامن اور چولی کا رواج تھا۔ پیٹ نظر آتا تھا اورکبھی سینے کا حصہ بھی کھلا رہتا تھا۔ پردے کا رواج تھا۔ بعض عورتیں فنون حرب سے رغبت رکھتی تھیں۔ گھوڑے کی سواری، تیر اندازی اور سیر و شکار سے دلچسپی لیا کرتی تھیں۔

ہندو عوام دھوتی باندھا کرتے تھے۔ ہندو عورتیں ساڑی کو پیچھے ٹوب دیا کرتیں تھیں (جس طرح آج بھی مہاراشٹر میں رواج ہے)۔

مذہب کو زندگی کا جزو لاینفک تصور کرتے، دعا مانگی جاتی، اور اس کو اثر پذیر خیال کیا جاتا۔ دستر خوان پر کھانا کھاتے تمام قسم کے کھانے کے لوازمات؛ نمکین اور شیریں، دسترخوان پر چنے جاتے تھے۔ ملازم تول سے مکھی اڑایا کرتے، صراحی بردار پیچھے ایستادہ ہوتے تھے۔ ملاقات کے وقت بغلگیر ہوتے تھے۔ موسیقی کا عام رواج تھا، رقص بھی ہوتاتھا۔ زمین پر فرش، مسند کے ساتھ تخت اور کرسیوں کا طریقہ موجود تھا۔ نجوم پر اعتقاد اس حد تک تھا کہ کوئی کام بلا نجوم کے نہیں ہوتا تھا، ماتم کرنے کا دستور تھا اور ماتم کے وقت عورتیں سر کے بال کھول دیا کرتی تھیں۔ بادشاہ اور امیروں کے

سوتے وقت لونڈیوں سے کسی قسم کا حجاب نہیں ہوتا تھا ۔ ان کی موجودگی میں بادشاہ اور امیر اپنی ملکہ اور بیگمات کے ساتھ ایک پلنگ پر آرام کرتے تھے[1]۔ سواری کے لیے گھوڑے، ھاتھی، بیل گاڑیاں، میانے اور رتھ تھے۔ سیرو شکار مردوں کی زندگی کا جزو ہوتا تھا۔ عورتیں بھی باغوں میں جا کر لطف زندگی اٹھاتی تھیں ۔ جھولے ڈالے جاتے، پکوان ہوتا اور گیت گائے جاتے تھے ۔ مخلوط محفلوں کا طریقہ نہیں تھا، مرد اور عورتوں کی محفلیں جداگانہ ہوتی تھیں۔ مردانہ کھیل اور فوجی کرتب ہوتے تھے، جس میں عوام بھی دلچسپی لیتے تھے ۔

موسیقی کا عام رواج تھا۔ رقص ہوتا تھا گانے والے، گانے والیاں رقاصہ اور مخصوص پیشہ ور ہوتے تھے، ان کی عزت کی جاتی تھی ۔ آلات موسیقی کئی ایک تھے۔ یہ اور اسی قسم کی باتیں اس وقت کی تہذیب و معاشرت میں نظر آتی ھیں ۔ اس سے واضح ہوتا ھے کہ اس وقت کا ماحول کیسا تھا اور کیسی فضا تھی ۔

(۴) گولکنڈہ یا حیدرآباد کی قطب شاہی

دکن میں بہمنی سلطنت کے بعد آندھرا کے قطب شاھوں کا تذکرہ آتا ھے ۔

سلطان قلی بہمنی دور میں تلنگانے کا طرف دار (صوبے دار) تھا ۔ دوسرے صوبے داروں کی طرح بہمنی حکومت کے زوال پر اس نے بھی سنہ ۱۵۱۸ع میں گولکنڈہ میں اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی تھی[2]۔

خود مختار ہونے کے بعد اس نے قرب و جوار کے علاقے فتح کر کے اپنی قلمرو کو وسیع کیا، ساٹھ ستر قلعے فتح کیے اور اپنی سلطنت کو ورنگل کی سرحد سے بندرگاہ مچھلی پٹم تک پہنچا

۱۔ ''مقالات ھاشمی'' مطبوعہ صفحہ ۵۲ تا ۵۴ ۔
۲ ۔ ''تاریخ گولکنڈہ'' صدیقی صفحہ ۴۵ ۔

دیا [1] اور اپنی حکومت کو ایک باعظمت اور شاندار سلطنت بنا دیا ۔ سلطان قلی کا تمام وقت اپنی سلطنت کو مستحکم بنانے اور وسیع کرنے کے لیے میدان جنگ میں بسر ہوا ۔ تمدن و تہذیب کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونے کی نوبت نہیں آئی، تاہم ہم کو یہ معلوم ہے کہ اس نے آتش خانے کے نام سے ایک خاص محل تعمیر کیا تھا، جہاں شعراء اور ادیب جمع ہوئے تھے اور سلطان قلی ان کے کلام سے مستفید ہو تا تھا [2] ۔

سلطان قلی نے تلنگانہ میں پچاس سال حکومت کی، جس میں سے ابتدائی ۲۴ سال صوبے دار کی حیثیت سے اور باقی ۲۶ سال ایک خود مختار بادشاہ کی حیثیت سے حکومت کرتارہا ۔ سلطان قلی کی وفات کا باعث اس کا فرزند جمشید تھا ۔ کیونکہ اس کے اشارے سے سلطان قلی کا قتل ہوا [3] ۔

سلطان قلی کے بعد جمشید قلی بادشاہ ہوا اور سات سال تک حکومت کرتا رہا ۔ اس کو شعر و سخن سے دلچسپی تھی ۔ جمشید اس کا تخلص تھا ۔ اس کے قصیدے اور غزلیات ہم دست ہوتے ہیں [4] ۔

جمشید قلی اپنی شجاعت اور خود داری کے باعث شہرت رکھتا ہے ۔

جمشید قلی کے بعد اس کا فرزند سبحان قلی صرف چند ماہ حکومت کر سکا ۔ بالآخر اُمرائے ملک نے جمشید کے بھائی ابراهیم قلی کو جو اپنے بھائی جمشید کے خوف سے وجیانگر میں مقیم تھا طلب کر کے مسند قطب شاہی پر متمکن کیا [5] ۔

---

۱ ۔ ”تاریخ قطب شاہی“ صفحہ ۵۰ ۔
۲ ۔ ”اردو شہ پارے“ ۔
۳ ۔ ترجمہ ”تاریخ فرشتہ“ صفحہ ۳۱۸ ۔
۴ ۔”اردو شہ پارے“ صفحہ ۸۱ ۔
۵ ۔ ”تاریخ گولکنڈہ“ صفحہ ۳ ۔

ابراھیم قطب شاہ کا دور حکومت قطب شاھی سلطنت کے لیے بڑا مبارک اور مسعود ثابت ھوا ۔ گولکنڈہ کی ذھنی اور ادبی تعمیر کا کام شروع ھوا ۔ ملک میں امن وامان تھا ۔ سوداگر تو سوداگر ایک بوڑھیا بھی سارے قلمرو قطب شاھی میں بغیر تعرض کے سونا اچھالتی جا سکتی تھی کیونکہ ابراھیم نے چوروں ڈاکوؤں اور لٹیروں کی بیخ کنی کر دی تھی [1] ۔

سنہ ۹۸۸ ھجری ۱۵۸۰ع میں ابراھیم کی وفات پانے پر اس کا فرزند سلطان محمد قلی قطب شاہ گولکنڈہ کے تخت پر متمکن ھوا ۔ اس کا دور حکومت قطب شاھی سلطنت کے عروج کا زمانہ ھے ۔

اس کے زمانے میں جنگ و جدل ، لڑائی جھگڑوں کی خونی فضا بدل گئی ۔ امن و امان صلح اور آشتی کا دور دورہ رھا ۔ بیجا پور کے مشہور مورخ فرشتہ نے اس کی بڑی تعریف کی ھے اور ظاھر کرتا ھے کہ محمد قلی میں چند باتیں ایسی جمع ھوگئی تھیں جو بہت کم بادشاھوں کو نصیب ھو تی ھیں ۔ یعنی محمد قلی اپنے بھائیوں کو بے حد عزیز رکھتا تھا اور ان کو اپنا مصاحب و ھم نشیں بنا کر بے خوف و خطر ان سے ملتا اور باتیں کرتا تھا۔ حکومت کے طویل زمانے میں وہ کبھی اپنے بھائیوں سے ناراض نہیں ھوا ۔ دوسرے یہ کہ میر محمد مومن استر آبادی جیسے قابل اور لائق شخص اس کے دربار میں معزز و محترم بنے رھے ۔ پچیس سال تک وکیل سلطنت کی خدمت انجام دی ۔ ان کی مسلمہ قابلیت اور ھمہ گیر لیاقت کے باعث نظم و نسق حکومت میں کوئی خرابی نہیں آئی [2] ۔

سلطان محمد قلی کے زمانے میں شمالی ھند سے مغلوں کے حملے دکن پر شروع ھوگئے۔ یورشوں کی روک تھام اور دکن کی آذادی،

---

۱ - ”تاریخ گولکنڈہ“ ازصدیقی صفحہ ۸۲ -
۲ - ترجمہ ”تاریخ فرشتہ“ صفحہ ۲۳۰ -

سلطنت گولکنڈہ کا مطمح نظر بنا رہا ۔ سلطان محمد قلی کی نظر سلنطت گولکنڈہ کے چاروں طرف پڑتی رہی۔ اس کی کوشش رہی کہ سلنطت کے دور دور حدود بھی مستحکم اور محفوظ رہیں ۔ چنانچہ وہ اس کوشش میں کامیاب رہا ۔ اس نے سلطنت کی اچھی تنظیم کی، جس میں اس کو میر محمد مومن کی وجہ سے بخوبی کامیابی ہوئی ۔ سلطان محمد قلی کا طویل عہد حکومت ارتقائے تمدن و تہذیب اور کلچر کے لحاظ سے ایک زرین دور کہا جا سکتا ہے ۔ ابراهیم قطب شاہ کے عہد میں جس دکنی تمدن کا آغاز ہوا تھا اس کا ارتقا اس کے عہد میں ہوا اور دکنی کلچر یعنی قطب شاہوں کا تمدن پیدا ہوا جس پر آندھرا دیش ہمیشہ فخر کر سکتا ہے ۔

اس نے شہر حیدرآباد آباد کیا اور اس کو عالی شان عمارتوں، خوبصورت ایوانوں ، سرسبز و خوش نما باغوں اور نہروں سے آراستہ کیا ۔ اس شہر کی تنظیم اور عمرانی لوازم کو نہایت سلیقے اور ہنر مندی کے ساتھ جمع کرایا ۔ شہر حیدرآباد میں اس زمانے کے لحاظ کے مطابق کشادہ راستے بنائے گئے، شہر کے وسط میں چار مینار تعمیر ہوا ، جو ایک کالج کی حیثیت رکھتا تھا ۔ شاہی عمارتیں اپنی وسعت ، بلندی ، خوبصورتی اور شان و شوکت کے لحاظ سے ممتاز تھیں ۔ مریضوں کے لیے دار الشفا ، سودا گروں کے لیے کاروان سرا اور وسیع بازار بنائے گئے۔ دل بستگی ، شگفتگی اور زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے باغات لگائے گئے، حمام تعمیر ہوئے اور تلنگانہ کے طول و عرض میں بہترین اجتماعی زندگی کی بنا ڈالی، اس کو فنون لطیفہ کی ہر ایک شاخ سے دلچسپی تھی- جس کی وجہ سے زندگی میں شگفتگی پیدا کرنے کے اسباب جمع کیے گئے۔ شاعری اور موسیقی سے دلچسپی تھی ۔ خوبصورت عالی شان قصر و ایوان تعمیر کر کے ان میں نقش و نگار اور مصوری کے شہ کار جمع کر دیے گئے تھے ۔

سلطان قلی کے دور میں نہ صرف علوم اسلام کو فروغ ہوا

عربی اورفارسی کے شہ کار مرتب ہوئے بلکہ دکھنی اور تلنگی ادب کو بھی ترقی ہوئی ۱۔ اس نے دکھنی اور تلنگی ادب کی نہ صرف سرپرستی کی بلکہ خود بھی ان زبانوں میں شعر موزوں کر کے شاعری کو زندگی جاوید عطا کی۔

"۔ جنوری سنہ ۱۶۱۱ع میں اس کا انتقال ہوا ۲، جب کہ اس کی عمر صرف اڑتالیس سال کی تھی۔ سلطان محمد قلی کا مقبرہ اپنی شان و شوکت کے لحاظ سے قابل دید ہے۔ اب کئی سال سے ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے اس کا سالانہ عرس کر و فر کے ساتھ منایا جاتا ہے۔

سلطان محمد تغلق کے بعد اس کا داماد اور بھتیجا سلطان محمد اس کا جانشین ہوا۔ چونکہ سلطان محمد قطب شاہ اپنے علم و فضل اور پاکیزہ زندگی کی وجہ سے ملک میں بہت مقبول تھا۔ اس لیے اس کی مسند نشینی پر بڑی خوشی منائی گئی۔ قطب شاہی تاریخ میں سلطان محمد کا عہد ایسا مبارک اور مسعود عہد ہے کہ تمام ملک میں سکون اور امن رہا کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ سلطان محمد قلی کے انتظام سلطنت اور بے مثل نظم و نسق کی وجہ سے سلطنت نہ صرف ہر قسم کے فتنہ و فساد سے مامون رہی بلکہ سیاسی تلاطم سے بھی محفوظ ہو گئی تھی۔ سلطنت کی فضا خوش گوار اور ملک بالکل مطمئن تھا۔[۳]

سلطان محمد قطب شاہ اپنے اعلی کردار اور حسن سیرت کی وجہ سے اپنے تمام زمانۂ حکومت میں نیک نام اور مقبول رہا۔ اس کی چودہ سالہ حکومت ملک کی علمی اور عمرانی دولت میں اضافہ کرتے

---

۱ - "تاریخ گولکنڈہ" صفہ ۱۱۰ -
۲ - "تاریخ گولکنڈہ" صفحہ ۱۱۱ -
۳ - "تریخ گولکنڈہ" صفحہ ۱۱۷ -

گزری ۔ علمی ، تمدنی اور کلچرل ترقی ہوئی ۔

سلطان محمد قطب شاہ مذہب پرست، پاکیزہ اخلاق اور صاحب فہم و فراست بادشاہ تھا ۔ مکہ مسجد کی تعمیر اس کا بڑا کارنامہ ہے[1] حیدرآباد سے چار میل مشرق کی جانب ایک شہر سلطان‌نگر کی بنا ڈالی ۔ پرانی عید گاہ بھی اسی کی تعمیر کردہ ہے ۔ ایک محل امان محل کے نام سے تعمیر کیا ۔

سلطان محمد قطب شاہ کو علم و فن سے بڑی دلچسپی تھی ۔ ''تاریخ قطب شاہی'' اسی کے عہد میں مرتب ہوئی ۔ بادشاہ کو شاعری سے بھی شغف تھا ۔ فارسی اور دکھنی زبان میں طبع آزمائی کرتا تھا۔ ظل آلہ اس کا تخلص تھا ۔ اس کے زمانے میں اردو کو خاص ترقی ہوئی ۔ غواص ، قطبی ، ابن نشاطی اور جنیدی وغیرہ اسی دور کے نامور شعرا ہیں جن کے کارنامے آج بھی موجود ہیں ۔[2]

تمام خاندان قطب شاہی میں سلطان محمد قطب شاہ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے خود اپنے علم و فن کا بڑا سرمایہ چھوڑا ہے ۔ اس کی سر پرستی کی وجہ سے اس کے زمانے کے علما اور شعرا نے بہت کام کیا جن کے علمی کارنامے اور تصانیف آج بھی ہمدست ہوتے ہیں ۔

قطب شاہی سلطنت کی یہ بڑی بدقسمتی تھی کہ ایسا نیک بادشاہ صرف چودہ سال کی حکمرانی کے بعد چونتیس(۳۴) سال کے سن میں ۱۳-جمادی الاول سنہ ۱۰۳۵ ھجری مطابق سنہ ۱۶۲۶ع میں انتقال کر گیا ۔[3] اور اپنے بعد صرف بارہ سال کے لڑکے کو چھوڑا ۔

اب عبداللہ قطب شاہ کو مسند نشیں کیا گیا ۔ اس کی کم سنی

۱- ''تاریخ گولکنڈہ'' صفحہ ۱۱۹ -

۲- ''دکن میں اردو'' دور قطب شاہی طبع چہارم

۳- ''تاریخ گولکنڈہ'' صفحہ ۱۱۹ -

کے لحاظ سے ملک میں فتنہ و فساد اور بدامنی کا اندیشہ تھا ۔ مگر اس کی ماں اور دادی یعنی حیات بخش بیگم اور خانم آغا نے حکومت کی باگ اپنے ہاتھوں میں لے لی ۔ منصور خاں، ملک الماس اور ملک یوسف انتظام ملک کے لیے مقرر کیے گئے ۔ مسند نشینی کی تاریخ کئی شعرا نے نکالی ۔ چنانچہ مولانا رونقی نے ''مزین شد جہان از جلوس شاہ عبداللہ'' اور فقیر سراج نے ''شد شاہ دکن قطب زمان عبداللہ'' سے تاریخیں نکالیں (سنہ ۱۰۳۵ع) ۔

انتظام سلطنت کے لیے ایک مجلس بنائی گئی تھی ۔[1] مگر اس کی روح رواں حیات بخش بیگم تھی ۔ بادشاہ کی تعلیم و تربیت کا بھی انتظام کیا گیا۔ شاہ محمد جو عبداللہ کا پھپا تھا پیشوا بنایا گیا۔ چونکہ ان میں اس بڑے عہدے کی قابلیت اور اہلیت نہیں تھی، اس لیے علامی شیخ محمد ؛ جو ابن خاتون کے نام سے مشہور ہوئے، ایران کی سفارت سے واپس آنے پر نائب پیشوا کے عہدے پر مامور کیے گئے ۔ کچھ عرصے کے بعد اعلی عہدے داروں میں ان بن ہو گئی۔ اس لیے شاہ محمد کے بجائے علامی شیخ محمد ابن خاتون ہی پیشوا بنا دیے گئے اور تمام انتظام ان کے تحت کر دیا گیا ۔ ان کی پیشوائی کے زمانے میں کئی قابل افراد جو باہر سے آئے تھے ان کو ترقی دی گئی ۔ مولانا اویس دبیر بنائے گئے، مرزا قاسم، حکیم نظام‌الدین ، حکیم جبرئیل ، اخلاص خاں وغیرہ اعلی عہدوں پر مامور ہوئے۔

سلطان عبداللہ اول تو کم سنی کی وجہ سے امور سلطنت انجام نہیں دے سکا اور جب شعور آیا تو اس میں سیاسی‌تدبر اور بیدار مغزی کا فقدان تھا، اس کے ساتھ ہی اس کو سیر و شکار اور عیش وعشرت سے دلچسپی تھی ۔ ہمیشہ رقص و سرور، نغمہ و طرب اور نشاط کے جلسوں میں مصروف رہا ۔ خود غرض امرا اپنے مفاد کے مد نظر تن آسان

۱۔ ''تاریخ گولکنڈہ'' صفحہ ۱۲۳ ۔

و سہل انکار بن گئے۔ ان امور کا انجام یہ ہوا کہ شمال سے مغلوں کے حملے شروع ہوگئے اور احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت ختم ہوگئی ، پھر بیجا پور کی عادل شاہی اور گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت پر یورش ہونے لگی ۔ گولکنڈہ پر حملہ ہوا لیکن حیات بخش بیگم (والدۂ سلطان عبداللہ) کی وجہ سے بالآخر مغلوں سے صلح ہوگئی اور اب قطب شاہی حکومت مغلوں کی ایک باج گزار حکومت بن گئی ۔

لیکن کرناٹک پر حملہ کر کے قطب شاہی حکومت کے حدود میں اضافہ ہوا مشرقی کرناٹک کے ساحل سمندر تک قلمرو قطب‌شاہی پھیل گئی ۔[1]

۱۰۸۳ ہجری میں سلطان عبداللہ قطب شاہ کا انتقال ہوا اور اس کی جگہ سلطان کا داماد ابوالحسن تانا شاہ مسند حکومت قطب شاہی پر متمکن ہوا ۔

تانا شاہ کا دور حکمرانی مغلوں کے حملوں اور بالآخر سلطنت کے خاتمے کی وجہ سے افسوس ناک ہے ، لیکن ملک کی ترقی کے لیے اس کے زمانے میں جو امور انجام دیے گئے وہ فراموش نہیں کیے جاسکتے۔ زراعت کو فروغ دینے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے گئے۔ تمام ملک میں جدید باؤلیاں ، تالاب اور کنٹے بنائے گئے ۔ وصول مالگزاری کا جو بے ڈھنگا طریقہ رائج تھا اس کو بند کر دیا گیا ۔ کیونکہ اس میں کاشتکاروں پر ظلم و ستم ہوتا تھا ۔ جو دیہات ویران ہو گئے تھے ان کو از سر نو آباد کیا گیا ۔ اجارہ داری کے طریقے کو موقوف کرکے مستقل تنخواہ یاب ملازم مامور کیے گئے ۔ اوقاف کا انتظام بہتر طریقے سے کیا گیا ۔ جن اوقاف کے انتظامات اچھے نہیں تھے ان کو شریک خالصہ کر لیا گیا ۔ معدنیات کی کھدائی جو بند ہو گئی تھی وہ از سر نو شروع کی گئی ۔ معدنوں میں کام کرنے والوں کی اجرت

۱۔ ''تاریخ گولکنڈہ'' صفحہ ۱۴۴ ۔

میں اضافہ کیا گیا ۔ اس طرح ملک کی خوش حالی میں اضافہ ہوا ۔[1]

غرض حیدرآباد کے تمدن و سماجی تاریخ میں گولکنڈہ کی سلطنت نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ مٹ نہیں سکتے ۔ در اصل دکنی کلچر کا آغاز اور مسلمانوں کے تمدن اور تہذیب میں تلنگانہ کے کلچر کو داخل کرنے کا بڑا سہرا قطب شاہی سلطنت کے سر ہے ۔ خصوصیت سے ابراهیم عادل سے محمد قلی قطب شاہ تک اس کے ہیرو قرار دیے جا سکتے ہیں ۔

(۵) احمد نگر کی نظام شاہی حکومت

نظام شاہی سلطنت کا بانی ملک احمد ہے ' جو دکن کے ان مسلمانوں کی اولاد میں شامل ہے جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا ۔ اس کا باپ بہمنی امرا میں شامل تھا ۔ ملک احمد کو بہمنی حکومت کی جانب سے احمد نگر میں صوبے دار مقرر کیا گیا تھا ۔ اس کی اولاد نظام شاہی کے نام سے احمد نگر میں تقریباً دو سو سال تک حکومت کرتی رہی ۔ اس خاندان کا حکمران ملک احمد نظام شاہ بحری ہے ۔ اس کا باپ حسن وبجا نگر کے ایک معزز برہمن خاندان سے تعلق رکھتا تھا ۔ محمد شاہ بہمنی کے دور میں اس کو نظام الملک کا خطاب ملا اور منصب سر لشکری سے سرفراز ہوا ۔ بہمنی سلطنت کے جب حصے بخرے ہوئے تو حسن المخاطب به نظام الملک کا فرزند ملک احمد نے خود مختار ہو کر نظام شاہی سلطنت قائم کی ۔ اس خاندان کے چودہ بادشاہ سن ۸۹۲ھ (۱۴۹۰ع) سے سن ۱۰۴۳ھ (۱۶۳۵ع) تک حکومت کرتے رہے[1] ۔

ملک احمد نظام الملک نہایت متقی اور پرہیزگار تھا ۔ اپنے

۱۔ ''تاریخ گولکنڈہ'' صفحہ ۱۹۶ ۔

اچھے کردار اور قابل تعریف عادتوں کی وجہ سے نیک نام رہا۔ اس نے تلوار کے کرتب اور شمشیر بازی کو اپنے ملک میں رواج دیا[۱]۔ اس کا فرزند برہان نظام شاہ صغیر سنی میں مسند نشین ہوا۔ اس کے عہد میں ملا شاہ طاہر یزدی اسماعیلی نے ایران سے آ کر اس کو مذہب امامیہ میں شامل کر لیا۔

احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت بھی دکن کی دوسری سلطنتوں کی طرح علم و فن کو ترویج دیتی رہی۔ بیجاپور کے کئی مشاہیر علماء اور اصحاب علم اولاً احمد نگر میں ہی آئے تھے۔

نظام شاہی سلطنت سے نہ صرف اپنے ہمسایہ حکومتوں کی لڑائی ہوتی رہی۔ بلکہ سب سے پہلے شمال کی مغلیہ حکومت نے بھی دکن میں اسی سلطنت پر حملہ کیا۔ اکبر کے دو فرزند یکے بعد دیگرے احمد نگر پر حملہ آور ہوئے۔ گجرات کے بادشاہوں سے بھی نظام شاہوں کو معرکے کرنے پڑے۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ تو بہادر شاہ والیٔ گجرات نے احمد نگر پر اپنا قبضہ بھی کر لیا تھا[۲]۔

نظام شاہی حکومت میں برہان نظام شاہ اور حسین نظام شاہ خصوصیت سے قابل تذکرہ ہیں۔ ان کے زمانے میں ایک طرف جنگ و جدل کے معرکے ہوتے رہے اور دوسری طرف علم و فن کی بھی قدر دانی ہوتی رہی۔

دکن کی سلطنتیں آپس کی رقابت اور امراء کی سازشوں سے کمزور ہوتی گئیں، چنانچہ احمد نگر میں یہی ہوا۔

جب مرتضیٰ نظام شاہ احمد نگر میں مسند نشین ہوا تو اس کے بھائی برہان نے اپنے بھائی کے خوف سے اکبر کے پاس شمالی ہند جا کر پناہ لی تھی۔ مرتضیٰ نظام شاہ دماغی فتور کے باعث اپنے فرزند

---

۱ - ۲ - "تاریخ فرشتہ"

کو قتل کرنا چاھتا تھا مگر خود ھی لقمۂ اجل ھوگیا - میراں حسین جو اس کا فرزند تھا باپ کی جگہ نظام شاھی مسند حکومت پر متمکن ھوا - یہ بڑا ظالم بادشاہ تھا اس وجہ سے رعایا اور امرا مخالف ھو گئے اور میراں حسین کی جگہ برھان کے فرزند کو جو نظر بند تھا اسماعیل کے لقب سے مسند نشین کیا[1]-

جب برھان کو اس کی اطلاع ھوئی کہ اس کے بیٹے کو مسند حکومت پر جگہ دی گئی ھے ، تو وہ واپس آ کر بیٹے کی جگہ تخت نشین ھوا - برھان نظام شاہ کو یہ معلوم تھا کہ آپس کے جھگڑے تباھی کا باعث ھوتے ھیں، اس لیے اس نے اپنی چار سالہ حکومت میں اس طرح امن و امان قائم کیا کہ نظام شاھوں کی کھوئی ھوئی عظمت و شوکت دوبارہ حاصل ھوگئی - برھان صرف چار سال کے بعد انتقال کر گیا اس کی جگہ ابراھیم تخت نشین ھوا ، مگر چند ماہ بعد ھی ایک تیر کے لگنے سے فوت ھوا[2]- اس کے انتقال پر احمد نگر میں افراتفری پھیل گئی - امرا کی رقابت رنگ لائی - شہنشاہ اکبر نے احمد نگر کو فتح کرنے کے لیے اپنے فرزند شہزادہ مراد کو روانہ کیا - یہ حالت دیکھ کر بیجاپور سے چاند بی بی احمد نگر آئی اور کم سن بادشاہ کی جانب سے حکومت کرنے لگی - چاند بی بی نے بڑی بہادری اور شجاعت سے مغلوں کی فوج کا مقابلہ کیا - بالاخر صلح ھوگئی اور نظام شاھی قلمرو کے بعض قلعے مغلیہ حکومت کو مل گئے - اکثر امراء چاند بی بی کے مخالف ھو گئے اور آپس میں لڑنے لگے - اس حالت کو دیکھ کر اکبر نے اپنے دوسرے فرزند شہزادہ دانیال کو احمد نگر فتح کرنے کے لیے روانہ کیا - دانیال کے ساتھ مغلیہ فوج نے احمد نگر کا محاصرہ کر لیا -

---

۱- ''تاریخ فرشتہ''

۲- ''تاریخ دکن'' ھارون خان شروانی صفحہ ۷۰ -

اس وقت بھی چاند بی بی نے احمد نگر کو مغلوں کو دے کر صلح کر لینے کی رائے دی مگر ایک حبشی سردار چیتہ خان نے جو اس وقت احمد نگر میں برسر اقتدار تھا ' عوام کو چاند بی بی کا مخالف بنا دیا ۔ یہاں تک کہ جاہل عوام شاہی محل میں گھس گئے اور چاند بی بی کو شہید کر دیا[1] ۔

جب اکبر کے شہزادے دانیال نے قلعۂ احمد نگر فتح کر لیا تو کچھ عرصے تک ملک عنبر نے نظام شاہی سلطنت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی اور کھڑکی (اورنگ آباد) کو پائے تخت بنایا ۔ ملک عنبر کی زندگی میں نظام شاہی حکومت کھڑکی میں قائم رہی، پھر جب مغلیہ تخت پر جہانگیر اور اس کے بعد شاہ جہاں سر پر آرائے سلطنت ہوئے تو پھر سے دکن پر مغلیہ حملوں کی تجدید ہوتی رہی ۔ بالآخر شاہ جہاں کے سپہ سالار مہابت خان نے دولت آباد اور کھڑکی فتح کر کے ملک عنبر کے فرزند فتح خان اور نظام شاہی بادشاہ حسین نظام شاہ کو قید کر لیا ۔ اس طرح سنہ ۱۰۴۳ ہجری سنہ ۱۶۳۳ ع میں حکومت نظام شاہی کا خاتمہ ہو گیا[2] ۔

(٦) بیدر کی برید شاہی حکومت

بہمنی حکومت کا شیرازہ پراگندہ ہونے پر جہاں دوسرے

---

۱ - چاند سلطانہ کے متعلق دو رائے ہیں؛ احمد نگر کے بعض مورخ کہتے ہیں کہ اس نے تیزاب سے لبریز کنویں میں گر کر جان دی لیکن بیجا پوری اور مغلیہ مورخوں نے صراحت کی ہے کہ ایک امیر چیتہ خاں نے اس کو قتل کر دیا ۔ اگرچہ مقامی مورخوں کو عموماً ترجیح دیجانی چاہیے' مگر جن واقعات سے حکومت کے ارباب حل و عقد پر حرف آنے کا موقع ملتا ہے تو ایسے واقعات کے متعلق مقامی مورخ غلط واقعات کو اجاگر کرتے ہیں اس لیے خود کشی کی رائے غلط معلوم ہوتی ہے ۔

۲ - ''تاریخ دکن'' ہارون خان شروانی صفحہ ۸۰ ۔

صوبے داروں نے خود مختاری کی نوبت بجائی وہاں خود بہمنوں کے دارالسلطنت بیدر میں ایک علیحدہ حکومت قائم ہوگئی۔ قاسم برید پہلا برید شاہی فرماں روا تسلیم کیا جاتا ہے۔

اس کے خاندان کے اور پانچ شخص یکے بعد دیگرے بیدر میں حکومت کرتے رہے ۔ ہم سایہ حکومتوں میں سے عادل شاہوں کے ان سے معرکے ہوتے رہے، کبھی ان کو اور کبھی آن کو غلبہ حاصل ہوا ۔ محمد عادل شاہ کے زمانے میں بیدر عادل شاہی حکومت میں شامل ہوا اور پھر سنہ ۱۰٦۷ ہجری ١٦٥٧ع میں شہر بیدر پر شاہ حیات کا قبضہ ہوگیا ۔ اس طرح برید شاہی حکومت ختم ہوگئی[1]۔

برید شاہوں کی حکومت کا آغاز سنہ ۱۴۹۲ع سے شمار کیا جاتا ہے اور سنہ ۱۵۷۲ع میں ان کی حکومت کا خاتمہ ہوا ۔ اس طرح اسی (۸۰) سال تک اس خاندان نے حکومت کی ۔

اس مختصر عرصے میں اس خاندان نے علم و فن کی خدمت کی اور دکن کلچر کو فروغ دیتے رہے ۔

(۷) برار کی عماد شاہی حکومت

فتح اللہ جو عماد الملک کے خطاب سے سر بلند تھا، یہ بھی دکنی سپوت تھا ۔ سلطان محمود بہمنی کے زمانے میں محمود گاواں کی وجہ سے صوبۂ برار کا صوبے دار بنایا گیا ۔ جب دوسرے صوبے داروں نے اپنی حکومت قائم کرلی ، تو اس نے بھی اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا ۔ لیکن بعض مورخ اس امر کی صراحت کرتے ہیں کہ بادشاہی کا اعلان عمادالملک نے نہیں کیا ، بلکہ اس کے انتقال کے بعد جب علاءالدین حکمراں ہوا تو اس نے بادشاہی کا اعلان کیا[2] ۔

۱۔ ”تاریخ دکن“ پروفیسر ہارون خان شروانی صفحہ ۸۰ ۔

۲۔ ”تاریخ دکن“ پروفیسر ہارون خان شروانی صفحہ ۵۸ ۔

اس کے زمانے میں گجرات کے حکمران بہادر شاہ نے براز پر فوج کشی کی اور علاءالدین نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔

اس کا فرزند دریا عماد شاہ نے ہمسایہ دکنی حکومتوں کے ساتھ جنگ و جدل کو ختم کرنے کے لیے اپنی دختر کی شادی حسین نظام شاہ سے کر دی اور کچھ عرصے تک براز میں امن و امان رہا۔

دریا عماد شاہ کے بعد برہان عماد شاہ مسند نشین کیا گیا۔ لیکن یہ بہت کم سن تھا - ایک امیر تفال خان بادشاہ کو نظر بند کرکے خود بادشاہ بن بیٹھا۔ چونکہ نظام شاہی حکمران سے عماد شاہی حکومت کی رشتے داری قائم ہو چکی تھی اس لیے مرتضیٰ نظام شاہ نے براز پر فوج کشی کی اور سنہ ۱۵۷۲ع میں پورا علاقۂ براز اپنی حکمرانی میں شامل کر لیا[1]۔

(۸) ارکاٹ کی والا جاہی حکومت

اس امر کی صراحت ہوچکی ہے کہ جنوبی ہند کے مشرق و مغربی ساحل، ملیبار اور معبر کے نام سے موسوم تھے۔ محمد تغلق کے زمانے میں جس طرح دکن کے بڑے حصے پر خود مختار بہمنی حکومت قائم ہوئی' اسی طرح وجیانگر پر ایک ہندو ریاست قائم ہوگئی جو اپنی شان و شوکت کے لحاظ سے دکن کی عظیم الشان ہندو سلطنت شمار ہوتی ہے۔

دکن کے متحدہ مسلمانوں کی حکومتوں نے ویجانگر راج کو ختم کر دیا اور اس سلطنت کے حصے بخرے ہوکر چھوٹی چھوٹی ریاستیں؛ انا کندی، ادھونی، میسور اور معبر وغیرہ قائم ہوگئیں۔ پھر سیواجی نے کرناٹک کا رخ کیا۔ چنجی اور ویلور سے بیجاپور کی عادل شاہی فوج نکال دی گئی۔ اس طرح سنہ ۱۰۰۰ ہجری کے

۱۔ ''تاریخ دکن'' هارون خان شیروانی صفحه ۶۲۔

اواخر میں ملک کرناٹک عادل شاهی ، قطب شاهی اور سیواجی کے راج میں منقسم هوگیا ۔ جب اول الذکر دونوں سلطنتوں پر عالمگیر کا قبضه هوگیا تو مغلیه فوج کرناٹک کی طرف بهی متوجه هوئی ۔ اسد خان کی نیابت میں حمله هوا اور نصرت جنگ ادهر متوجه هوا (سنه ۱۱۰۳ هجری) کئی سال تک مغلیه فوج ادهر متوجه رهی، آخر قلعه چنجی فتح هوا ۔ اس طرح ملک کرناٹک مغلیه قلم رو کا جزو بن گیا اور نواب سعادت الله خان کو یهاں صوبے دار مقرر کیا گیا۔

سعادت الله خان کے بعد علی دوست خان یهاں کا صوبے دار بنا اور پهر صفدر علی خان صوبے دار هوا ۔ مگر اپنے رشتے دار غلام مرتضٰی خان جاگیردار ویلور کے هاتهوں قتل هوا فتنه و فساد کی آگ روشن هوگئی ۔ اس زمانے میں آصف جاه اول جو دکن کے صوبے دار هوچکے تهے ۔ (سنه ۱۱۳۲ھ) رفع فساد کے لیے ادهر متوجه هوئے انوز الدین خان کو یهاں کا صوبے دار مقرر فرمایا ۔ سلطنت مغلیه کی طرف سے بهی منظوری صادر هوگئی[1] ۔ (سنه ۱۱۵۷ هجری)

یه وه زمانه هے جب که انگریز اور فرانسیسی تجارت سے گذر کر ملک گیری کی طرف متوجه هوگئے تهے اور هندوستان میں اپنی سلطنت قائم کرنے کا مستحکم اراده کر لیا تها ۔ هر وقت توسیع حکومت اور وسعت ملک کا خیال ان کے دامن گیر تها ۔

سنه ۱۱۵۰ هجری میں جب نواب انور الدین خان گوپاموی کرناٹک کے صوبے دار مقرر هوئے تو اس وقت مدراس میں انگریزی اثر صاف طور سے محسوس هو رها تها ۔ انگریزی کمپنی کے لیے یه امر اب عملی سیاسیات میں شامل تها که نواب نورالدین خان سے

۱۔ ''قصر والا جاهی''

راہ و رسم پیدا کرے ، چنانچہ انگریزی ارباب حل و عقد نے اس پر بہت کافی توجہ کی ۔ ان کو نواب انور الدین خاں کے پاس فرانسیسیوں کی بہ نسبت زیادہ تقرب حاصل ہوگیا ۔

اسی اثناء میں انگلستان اور فرانس میں جنگ چھڑ گئی اور اس کا اثر ان کی ہندوستانی عمل داریوں میں بھی رونما ہوا ۔ فرانسیسیوں نے مدراس پر حملہ کر دیا اور اس پر ان کا قبضہ ہوگیا ۔ اب انگریزی حکام دربار انوری کی جانب تائید اور اعانت کے لیے رجوع ہوئے ۔ اس موقع پر نواب انور الدین خاں کی توجہ کی بدولت مدراس پر پھر انگریزی قبضہ ہوگیا ۔

اس سلوک پر اهل انگلستان نے اپنی بڑی ممنونیت ظاہر کی نواب کرناٹک اور شاہ انگلستان سے براہ راست سلسلۂ نامہ و پیغام شروع ہوا [1] وعدہ کیا گیا کہ سلطنت انگلستان اس حسن سلوک کے عوض اس امر کا لحاظ رکھے گی کہ ریاست کرناٹک خاندان انوری میں نسلاً بعد نسل قائم و برقرار رہے ۔

اسی اثناء میں آصف جاہ اول نے داعی اجل کو لبیک کہا ۔ مرحوم کی جانشین کے لیے سر زمین دکن میں جو ہنگامۂ محشر برپا ہوا اس میں انگریزی اور فرانسیسی دونوں اقوام کو قسمت آزمائی کا بہترین موقع ہاتھ آیا ۔

ہدایت محی الدین خاں مظفر جنگ (آصف جاہ اول) کے نواسے کو یہ مناسب معلوم ہوا کہ فرانسیسیوں کو اپنی فوج میں شامل کر لیں ۔ انور الدین خان کی زندگی تک ابھی انگریزوں کو فوج میں دخل حاصل نہیں ہوا تھا' لیکن ان کی شہادت کے ساتھ نواب والا جاہ کے لیے ضروری تھا کہ ایک مغربی قوم کے مقابلے کے لیے دوسری مغربی قوم کو سامنے لائیں ۔ اس کے بعد دکن و کرناٹک کی سر زمین

۱۔ خطوط در انڈیا آفس ۔

ہر وقت بوقت حالات اس سرعت سے بدلتے گئے کہ انگریزی فوج جو پہلے نوکروں کی حیثیت سے داخل ہوئی تھی اب خود آقا ہونے لگی۔ اس زمانے کی تاریخ پر ابھی بہت تاریکی چھائی ہوئی ہے ۔

نواب انور الدین خان کی شہادت کے بعد نظامت ارکاٹ کے لیے حسین دوست خاں ؑ چندا صاحب اور والا جاہ فرزند انور الدین خان میں نزاع برپا ہوئی ۔ فرانسیسی فوج نے حسین دوست خان کا ساتھ دیا ۔ نواب والا جاہ نے جاگیریں دے کر انگریزی فوج کو بلوایا ۔ بالآخر حسین دوست خاں مارے گئے ۔ نواب والا جاہ نہ صرف ناظم ارکاٹ بلکہ کرناٹک کے خود مختار حاکم تسلیم کر لیے گئے ۔ اور آگے چل کر دربار مغلیہ اور آصفی سے بھی اس کی سند عطا ہوگئی[1] ۔

فرانسیسی ارباب سیاست نے نواب حسین دوست خان کے بعد بھی اپنی حکومت قائم کرنے کے لیے ھاتھ پیر مارے' لیکن وندی واش کے تاریخی معرکے کے بعد ان کی قوت میں بالکلیہ ضعف آ گیا ۔ بعد ازاں اس سلسلے میں نواب والا جاہ نے پانڈے چری پر بھی قبضہ کر لیا ۔

اب انگریزی تفوق روز بروز بڑھنے لگا ' تا آنکہ خود والا جاہ کی زندگی میں انگریز ھی حاکم بن بیٹھے ۔ سنہ ۱۲۱۰ ھجری[2] میں والا جاہ کا انتقال ہوا ۔ ان کی جگہ ان کے فرزند عمدۃ الامراء مسند نشین ہوئے ' صرف چند سال کی حکومت کے بعد سنہ ۱۲۱۶ ھجری میں انتقال فرمایا[3] ۔ اب انگریز کمپنی کی قوت نہایت مستحکم ہوگئی تھی ۔ لارڈ ویلزلی کا دور دورہ تھا ۔ عمدۃ الامراء کے جانشین

۱۔ ''گلزار آصفیہ''

۲۔ ''مخطوطہ حکومت ارکاٹ''

۳۔ ''مخطوطہ حکومت ارکاٹ''

تاج الامراء کی خدمت میں چند شرایط کمپنی کی جانب سے پیش ہوئیں، جن کو انھوں نے منظور نہیں کیا - اس جرم میں وہ نظر بند کر دیے گئے - والا جاہ کے ایک دوسرے پوتے عظیم الدولہ کو ارکاٹ کا حکمراں بنایا گیا - جنھوں نے کمپنی کی شرایط منظور کر لیں - یعنی سالانہ بارہ لاکھ نقد اور ۱/۵ محاصل پر قناعت کر لی سلطنت پر کمپنی کا عملاً قبضہ ہوگیا (سنہ ۱۲۱۶ ھجری)[1]

عظیم الدولہ کے انتقال پر اعظم جاہ (۱۲۳۴ ھجری) اور پھر ان کے انتقال پر غلام محمد غوث خاں (سنہ ۱۲۴۱ ھجری) مسند حکومت پر متمکن ہوئے - غدر کے دو سال پہلے سنہ ۱۲۷۱ ھجری (۱۸۵۵ع) میں ان کا انتقال ہوا - ان کے مرنے پر اس برائے نام حکومت کا بھی خاتمہ ہوگیا -

اس موقع پر ڈاکٹر محمد غوث صاحب کا ایک مفصل مضمون نقل کیا جاتا ہے جس سے ارکاٹ کی والا جاہی حکومت کی تاریخی وضاحت بخوبی ہو جاتی ہے -

خاندان والا جاہی کی حکومت کا خاتمہ

”ہندوستان میں ہم نے اپنے ملک کی - بھلائی کے واسطے انگلش حکومت قائم کی - ہندوستان میں انگلش حکومت میں ہم اور وہ مثل قینچی کے دو پلڑوں کے شریک تھے - کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان دونوں میں کس نے زیادہ کام کیا ہے“ - یہ الفاظ سرسید نے ایک مرتبہ ایک تقریر میں کہے تھے - ان پر از حقیقت الفاظ کی اصلی مصداق اگر کوئی جگہ نظر آتی ہے، تو وہ قطعہ کرناٹک ہے - خاندان والا جاہی نے انگلستان کے ایک حلیف اور ایک سچے دوست کی حیثیت میں وہ سب کچھ کیا جو حلیفی اور دوستی کا مقتضی ہے -

---

۱- ”توزک والا جاہی“

جن اصحاب نے تاریخ کرناٹک کی فارسی کتابیں پڑھی ھیں ان پر یہ حقیقت آشکارا ھے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی مدراس میں ابھی صرف تاجرانہ کار و بار کے نشیب و فراز سے دو چار تھی کہ فرانسیسی حکمت عملی کے ایک استاد دوپلے نے انگریزی تاجروں کو مدراس سے بے دخل کر دیا ۔ محض کمپنی کی درد بھری التجاؤں پر اس وقت کے حاکم صوبۂ کرناٹک نواب انور الدین خاں شہید نے، جن کا مستقر حکومت ارکاٹ تھا، فرانسیسی کار پردازوں کی قرار واقعی تنبیہ کی اور یکے بعد دیگرے اپنے فرزندوں؛ نواب محمد محفوظ خاں اور نواب محمد علی خاں والا جاہ کو فرانسیسی فوج سے مقابلے کے لیے روانہ کیا، بالآخر مدراس کو فرانسیسی اقتدار سے آزاد کرا کے پھر انگریزی کمپنی کے سپرد کر دیا[1] ۔ نواب انورالدین خاں کی شہادت کے بعد فرانسیسیوں نے انگریزی کمپنی اور اس کے اثر کا نام و نشان تک مٹا دینا چاھا ۔ اس نازک وقت میں نواب محمد علی خاں والا جاہ نے اپنی قوت کا جو مظاہرہ کیا اس سے فرانسیسی اقتدار کی کمر ٹوٹ گئی ۔ اسی زمانے میں مدراس کے انگریزی تاجروں کی کمپنی آھستہ آھستہ زمینداری، اجارہ داری اور جاگیر داری کے مراتب طے کرتی جا رھی تھی[2] ۔ نواب والا جاہ نے متعدد مواضع ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپرد کیے، چنانچہ میلا پور کی سپردگی کے وقت جو سند دی گئی اس کا اقتباس یہ ھے ۔

''مرقوم غرہ شہر ذی قعدہ سنہ ۱۱۶۲ ھجری آنکہ دریں والا بندر میلا پور تعلقہ کرناٹک پایاں گھاٹ۔ صوبہ فرخندہ بنیاد حیدر آباد بشرط رفاقت و فدویت کہ ھرگاہ برائے کار ھائے سرکار طلب داشتہ

۱۔ ''توزک والا جاھی'' مخطوطہ کتب خانۂ سعیدیہ

۲۔ ملاحظہ ھوں ''توزک والا جاھی''، ''قصر والا جاھی'' اور ''تحفۃ الاخبار'' ۔

شود با جمعیت و سر انجام خود را به حضور رسیده شرایط رفاقت بجا آرند ـ سپرد انگریزان چناپٹن و دیو نام پٹن حسب الضمن مقرر گشته باید که به خاطر جمع در فدویت و اطاعت سرکار حاضر و سرگرم باشد[1] ـ

جب کونٹ لالی نے دوبارہ مدراس کا محاصرہ کیا تو اس خوف و خطر سے مملو وقت میں نواب والا جاہ نے فوج کی کمانڈ کی ـ رسد اور مال بے دریغ مہیا کیا گیا ـ ونڈی واش کے تاریخی معرکے میں اور پھر پانڈے چری کو فتح کرکے فرانسیسی امنگوں کو ھندوستان میں ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے میں بھی، نواب والا جاہ نے اپنی فوج کی قیادت کی ـ کرناٹک کے سورخوں کا یہ دعویٰ ہے کہ خود بنگالہ میں بھی کلایو کے ساتھ نواب والا جاہ کی نئی تربیت یافتہ فوج نظر آ رہی تھی ـ اس سے قطع نظر سلطنت کے ساتھ مشہور آفاق تاریخی دوستی کی ابتداء کے وقت سفراء انگریزی کے پشت پناہ نواب والا جاہ ھی تھے[2] ـ غرض برطانیہ کے کنگ اورکرناٹک کے ناظم میں بالراست روابط قائم ہوئے، جس کی نظیر اس وقت طول و عرض ھندوستان میں کسی اور جگہ موجود نہیں تھی ـ ''توزک والا جاھی'' کے الفاظ میں:

''سرشتہ و داد و اتحاد فی مابین حضرت اعلیٰ نواب والا جاہ و ھر دو بادشاہ انگلینڈ یعنی جارج ثانی و ثالث بآں مرتبہ محکم گردیدہ رابطۂ دوستیٔ طرفین بآں حد رسید کہ بہ پیمان برادری انجامید'' ـ ـ ـ

''توزک والا جاھی'' میں ایک دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ:

''قوم انگریز مجدواً از وقوع اعانت وقت مشکل ممنون و مشکور

۱ـ کتب خانۂ سعیدیہ میں اس کی نقل موجود ہے ـ

۲ـ ''قصر والا جاھی'' ـ

و متفق و یکدل با حضرت اعلیٰ گردیده چنانچه تا حال . . . . .
اتحاد و ارتباط حضرت اعلیٰ قوم انگریز جاریست . . . . . . چنانچه
دو بادشاه جزیرهٔ انگلانڈ ملقب بجارج دویم و سیوم . . . . نامه
هائے موافقت بالقاب برادر بحضرت اعلیٰ باین مضمون فرستادند
که تا قیام سلطنت انگلانڈ در اولاد خود ریاست کرناٹک
بحضرت اعلیٰ بطناً بعد بطن قائم و برقرار مسند و تخت هر دو دولت
تا سلسلهٔ اولاد طرفین از محبت و الفت جانبین باقی و پائیدار
خواهد بود'' . . .

سنہ ۱۱۶۲ ھجری سے سنہ ۱۱۷۳ ھجری تک کا زمانہ وہ ہے'
جب کہ نواب والا جاہ نے ایک طرف چندا صاحب وغیرہ سے لبرد
آزمائی کر کے کرناٹک میں اپنی حکمرانی کی بنیاد مضبوط' کی تو
دوسری طرف انگریزوں کی تائید و اعانت میں حق رفاقت پوری طرح
ادا کیا۔ اس پورے زمانے کی روبداد سنانے کا اس وقت کوئی موقع نہیں
ہے۔ بہر حال نواب والا جاہ اس وقت انگریز دوستی کا دم بھرتے اور
انگریزوں سے اپنی کاوبراری کا موقع ڈھونڈتے رہتے تھے۔ اس زمانے
میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارپردازوں کی جانب سے جو عرایض نواب
والا جاہ کی خدمت میں گزرانے جاتے تھے اور جو اقرار وعہد کیا
جاتا تھا اس کے چند نمونے اس موقعے پر پیش کرنا بر محل ہے:

گورنر سانڈرس نے ربیع الاول سنہ ۱۱۶۳ ھجری کو لکھا کہ:
ما. .....از سرکار جاگیر یافتم که در کارهائے سرکار معاونت
بعمل آزیم لنهذا او را همه وقت به حتی‌المقدور مراتب اعانت بعمل
خواهم آورد ''۔

۲۱-رمضان سنہ ۱۱۶۳ ھجری کو گورنر ترچنا پٹن بہ اجلاس
کونسل نے حسب ذیل تحریر روانہ کی:
''بران صاحب نیز روشن خواهد بود که کمترین درهم اوقات
لوازم اخلاص مندی درکار آن صاحب به تقدیم رسانیده فی‌الحقیقت

فتح صاحب فتح خود می داند و شکست را هم بدستور می داند ۔ یقین تصور فرمائید کہ حتی المقدور استحکام کارہائے قصور نخواہد کرد ۔ بعد شہید شدن نواب ناصر جنگ آن صاحب بخیریت بمکان ترچنا پلی رسیدہ اند ۔ ازاین معنی بسیار خوش وقت شد بہ مجرد رسیدن خط اول......خوبی ہائے آن صاحب وہم بنا بر اظہار وفاداری انگریزان ....سواران بمعہ سامان سرکردگی مشرکوپ برائے کمک آن صاحب روانہ ساختیم "۔

طویل مراسلت ہے جو یہاں متروک کی گئی ۔[1]

غرض عہود و مواثیق اور تدبیر فرزانگی کے جو مراہت کرناٹک کی سر زمین میں طے ہوئے وہ یکسر ایک داستان عبرت خیز ہے ۔ ایک قطعۂ کرناٹک پر کیا موقوف ہے ارض ہندوستان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس زمانے میں فتنوں نے سر اٹھایا تھا ۔ ارباب ہمت کی ہوس اقتدار باہمی جنگ و جدل اور دغا و فریب کی شرم ناک صورت اختیار کر لیتی تھی باہمی نزاعوں کا بول بالا تھا ۔ قحط الرجال کی جو شکایت شاہ خلد مکان اورنگ زیب کے زمانے میں شروع ہوئی تھی وہ اب عالمگیر ہو چکی تھی ۔ خود سری کے تخیل نے کچھ اس طرح تسلط حاصل کر لیا تھا کہ ہر طرف اس کی کار فرمائی تھی ۔ باہمدگر جھگڑنے والے مدعیان حکومت کو اقوام مغرب سے مدد لینے کا خیال پیدا ہوا ۔ ان مدد لینے والوں نے خیال نہ کیا کہ غیر ملکی اور کرائے کی فوج مدد دیتے دیتے جب یہ دیکھے گی کہ اب اس کی قوت بادشاہ گری کر سکتی ہے تو فوراً وہ موقعے کو اپنے موافق بنا لینے میں کچھ پس و پیش نہ کرے گی ،

۱۔ یہ تمام اقتباسات ان کاغذات سے ماخوذ ہیں جو کتب خانۂ سعیدیہ میں "افراد نقول فقرات گورنران" کے نام سے موجود ہیں ۔

جیسے کہ عباسی دور خلافت میں غلامان ترک نے مثال قائم کی تھی۔ کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت بھی بعض بقیۃالسیف مشرقی ارباب دانش و بینش حالات کی نزاکت سے سہمے جاتے تھے۔ لیکن ان کے ہاتھ اس قدر قوی نہیں تھے کہ آنے والے طوفان کو روک دیتے۔ اس زمانے میں یا زمانۂ مابعد میں طول وعرض ہندوستان میں لوگوں نے کئی عبرت انگیز مظاہر دیکھے۔ کرناٹک میں جو منظر نظر آیا اس کی رویداد یہ ہے۔

۲۲[1]۔ سفر سنہ ۱۲۱۶ ھجری مطابق ۵۔جولائی سنہ ۱۸۰۱ع کو نواب والا جاہ کے فرزند اور جانشین نواب عمدۃ الامرا حالت نزع میں مبتلا ہوئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج (۴) توپوں (۵۰۰) سے زیادہ جوانان (۲۳۳) سوار اور توپ سواروں کے ساتھ نواب صاحب کے سکونتی باغ واقع چیپاک[2] میں کرنل میکلین کی ماتحتی میں داخل ہوئی اور باغ کے دروازوں پر اپنے پہرے قائم کر دیے۔ ۳ ربیع الاول سنہ ۱۲۱۶ ھجری کو سوا دس بجے نواب عمدۃ الامرا نے آخری سانس لی، ساتھ ہی گورنر مدراس کی جانب سے مسٹر ویب چیف سیکریٹری اور کرنل کلوس حاضر ہوئے۔ محمد تقی علی خان بہادر بہرام جنگ، نجیب خان بہادر سالار جنگ اور نواب عمدۃ الامرا کے پرتگیزی دیوان کرنل بارڈ سے کہا کہ اگر نواب صاحب نے کچھ وصیت کی ہے تو ظاہر کی جائے نواب صاحب کے عہدے داروں نے جواب دیا کہ تحریری[3] وصیت نامہ موجود ہے۔ جس کو نواب

۱۔ ان واقعات کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہوں ''تحفہ الاخبار'' و ''سوانح ممتاز'' جس کا انگریزی ترجمہ ابھی حال میں مدراس یونیورسٹی نے شائع کیا ہے۔

۲۔ اس مکان اور باغ میں اب گورنمنٹ کا ریوینیو ڈی پارٹ منٹ قائم ہے۔

۳۔ اصلی وصیت نامہ کتب خانۂ سعیدیہ میں محفوظ ہے۔

صاحب نے اپنے فرزند نواب تاج الامرا ولی عہد کو تفویض کیا ہے۔ بعد ایام غم اس کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ دونوں انگریزی عہدے داروں نے مجبور کیا کہ اسی وقت وصیت نامہ دکھایا جائے۔ ان کے اصرار پر وصیت نامہ دکھایا گیا۔ دونوں انگریزی عہدے داروں نے مارکوئیس ولزلی کے ایک خط کی نقل دکھائی، جو انھوں نے نواب عمدة الامرا مرحوم کے نام تحریر کیا تھا اور یہ بات ظاہر کی کہ مارکوئیس ولزلی کو اس امر کا علم ہونے کے بعد کہ نواب عمدة الامرا نے ٹیپو سلطان کے ساتھ مراسلت کی تھی، یہ حکم دیا تھا کہ یہ خط نواب صاحب کو دکھا کر ملک کرناٹک ضبط کر لیا جائے۔ جس وقت مارکوئیس ولزلی کا یہ خط آیا، نواب صاحب مرحوم کا مزاج علیل تھا۔ اس لیے ہم نے ان کی صحت یابی کا انتظار کیا۔ اب جب کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے، وہی صورت حال پرنس تاج الامرا کے ساتھ بھی باقی ہے۔ ٹیپو سلطان کے ساتھ مراسلت ثابت ہو جانے کے بعد ریاست کے تمام حقوق سورنٹی (sovereignty) اورکمپنی کی پناہ جو نواب والا جاہ اور نواب عمدة الامرا کو حاصل تھی ختم ہو گئی اور سنہ ۱۷۹۲ء کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔ اس وجہ سے کہ اہل حکومت ملک کرناٹک ضبط کر لیں گے۔ لارڈ صاحب اپنی اس مہربانی کی وجہ سے جو ان کو پرنس تاج الامرا کے ساتھ ہے چاہتے ہیں کہ پرنس کرناٹک کی تمام سر زمین کمپنی کو دے دیں۔ اگر پرنس اس طرح عمل کریں تو لارڈ صاحب (گورنر مدراس) ان کی جانشینی کا اعتراف کریں گے اور کچھ حصہ پرنس اور ان کے خاندان کے لیے مقرر کر دیں گے۔ بہرام جنگ اور سالار جنگ نے جواب دیا کہ نواب عمدة الامرا کو ٹیپو سلطان سے دو پشت کی دشمنی تھی، نواب عمدة الامرا اور نواب والا جاہ کے ساتھ ٹیپو سلطان اور ان کے والد نے جو کچھ لڑائی کی اور نقصان پہنچا وہ سب پر ظاہر ہے، لیکن جس وقت مارکوئس کار نوالس نے خاندان ٹیپو سلطان کو قلعے میں لا رکھا تو نواب

والا جاہ سے ان کی ملاقات کرائی ، سفارش کی اور یہ کہا کہ ان کے ساتھ جو کچھ مراعات کیے جائیں گے ان کو میں خیال کروں گا کہ میرے ساتھ عمل میں لائے جا رہے ہیں۔ اس پر نواب والا جاہ نے ٹیپو سلطان کے فرزندوں کے ساتھ محبت آمیز برتاؤ کیا ، مارکوئیس کارنوالس نے یہ بھی کہا کہ ٹیپو سلطان کے ساتھ کمپنی نے دوستی اور مصالحت کر لی ہے، اس لیے نواب والا جاہ کو بھی اب ٹیپو سلطان کے ساتھ دوستانہ مراسلے کا سلسلہ جاری رکھنا ضروری ہے ۔ اس بنا پر نواب والا جاہ اور ان کے بعد نواب عمدۃ الامرا نے ٹیپو سلطان کے ساتھ دوستی کا سلسلہ جاری اور قائم رکھا - جو خطوط ٹیپو سلطان کو بھیجے جاتے تھے بر وقت ان کے نقول گورنر مدراس کے پاس بھیج دیے جاتے تھے۔ وہ تمام خطوط یا تو تعزیت کے ہیں یا تہنیت کے دونوں انگریزی عہدےداروں نے ایک خط کی نقل دکھائی، اس کے دیکھنے کے بعد سالار جنگ اور بہرام جنگ نے کہا کہ یہ خط شادی کی مبارک باد کا ہے' ضرور اس کی نقل گورنر کے دفتر میں موجود ہو گی ۔ اس خط سے کیا قباحت لازم آتی ہے؟ اس کے بعد دونوں انگریزوں نے ایک فرد کی نقل دکھائی اورکہا کہ اصل فرد ٹیپو سلطان کے دفتر سے برآمد ہوئی ہے، جن میں نواب والا جاہ اور نواب عمدۃ الامرا کے رموز درج تھے' اس کے بموجب کمپنی کی دشمنی میں مراسلت ہوا کرتی تھی ۔ سالارجنگ اور بہرام جنگ نے کہا کہ اگر اصل فرد نواب والاجاہ یا نواب عمدۃالامرا یا ان کے کسی منشی کے ہاتھ کی ہو تو دکھائی جائے۔ یہ بات قسم کھا کر کہی جا سکتی ہے کہ دونوں صاحبوں نے کمپنی کے خلاف کوئی مراسلت ٹیپو سلطان کے ساتھ نہیں کی ۔ ہندوستان کے رئیسوں سے ان کی مراسلت کمپنی کے ذریعے سے ہوا کرتی تھی ۔ اگر یہ فرد ٹیپو سلطان کے دفتر سے برآمد ہوئی ہے تو ممکن ہے کہ دغابازوں نے کمپنی کی دوستی میں خلل ڈالنے کے لیے کوئی سازش کی ہو گی مسٹر ویب اور کرنل کلوس نے کہا کہ

هم عدالت کے محکمے میں نہیں آئے ہیں، اصل کاغذ دکھانے یا قسم لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔ اس وقت صرف دو باتیں کہنی ہیں ایک تو یہ کہ دوستانہ طریقے سے تمام ملک کرناٹک کمپنی کو دے دیا جائے، اس وقت لارڈ صاحب اپنی مہربانی سے پرنس کی جانشینی کا اعتراف کریں گے اور ان کے لیے اور ان کے خاندان کے لیے کوئی چیز مقرر کر دیں گے ۔ دوسری یہ کہ اگر اس بات کو قبول نہ کیا جائے تو لارڈ صاحب چونکہ حکم کے تابع ہیں اس لیے وہ تمام ملک ضبط کر لیں گے اور اس وقت انجام نیک نہ ہو گا ۔ اس کا جواب اسی وقت دیا جائے ۔ بہرام جنگ اور سالار جنگ نے کہا کہ نواب صاحب کی میت بلا تجہیز و تکفین پڑی ہوئی ہے اور ہر طرف سے درد و غم کی آواز بلند ہے' ہمیں سوال و جواب کا ہوش و حواس نہیں ہے ۔ اس قدر مہلت مطلوب ہے کہ نواب صاحب کا تابوت روانہ کر دیں اور کل آپ کے سوال کا جواب دیں ۔ بہت بحث و تکرار کے بعد دونوں صاحبوں نے بات قبول کی اور چلے گئے ۔

دوسرے روز دونوں صاحب پھر آئے اور گذشتہ روز کی تقریر کا اعادہ کیا ۔ بہرام جنگ اور سالار جنگ نے کہا کہ تمام ملک کمپنی کو دے دینا ان کے اقتدار سے زیادہ ہے۔ اس بات کو چھوڑ کر باقی دوستانہ سوال و جواب جس میں کمپنی کے فوائد ملحوظ ہوں بیان کیے جائیں، حتی المقدور کمپنی کو خوش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اگر ملک کا کوئی جدید نقشہ بنایا گیا ہے تو دکھایا جائے دونوں صاحبوں نے کہا کہ جدید نقشہ یہی ہے کہ کرناٹک کی تمام زمین کمپنی کو دے دی جائے۔ اس وقت لارڈ صاحب پرنس کی جانشینی کا اعتراف کریں گے اور ان کے لیے حصہ معین کریں گے ۔ بہرام جنگ اور سالار جنگ نے دریافت کیا کہ حصہ کیا چیز ہے ۔ جواب ملا کہ پہلے قبولیت دی جائے اس کے بعد لارڈ صاحب غور کریں گے، ورنہ ملک ہر طور سے کمپنی ضبط کر لے گی ، پرنس کی جانشینی کا اعتراف نہ کیا جائے گا۔ اس کے انجام پر نظر ڈالی جائے اس کے جواب میں یہ بتایا گیا کہ نواب

صاحب گریٹ برٹن کے بادشاہ ، کمپنی اور قوم انگریز کے قدیم دوست تھے ۔ انھوں نے اپنے فرزند کو اسی دوستی کی پناہ میں چھوڑا ہے ۔ ہم لوگ پوری طرح اس باانصاف قوم سے مطمئن ہیں ۔ لارڈ صاحب پرنس حال کے لیے ان کے والد کے مقام پر ہیں ۔ ان سے پوری امید ہے کہ پرنس کے ساتھ وہ کسی قسم کی برائی نہ کریں گے ۔ کمپنی کے دونوں عہدے داروں نے جواب دیا کہ کمپنی کی پناہ ، نواب صاحب کی قدیم دوستی اور سنہ ۱۷۹۲ع کا معاہدہ سب ختم ہو گئے ۔ لارڈ صاحب حکم کے مطابق ضرور ملک ضبط کر لیں گے اور پرنس کا انجام برا ہو گا ۔ نواب تاج الامرا کے دونوں وکلاء نے دریافت کیا کہ کیا انجام بد یہی ہے کہ ان کا ملک ضبط کر لیا جائے گا اور لارڈ صاحب ان کی جانشینی کا اعتراف نہ کریں گے ۔ دونوں انگریز عہدے داروں نے کہا کہ اس سے زیادہ بھی ہو گا ، ان کا تمام مال ضبط کر لیا جائے گا ۔ پرنس کے وکلاء نے جواب دیا کہ نواب صاحب کے پاس مال کچھ نہیں ہے ۔ مسٹر دیب اور کرنل کلوس نے کہا کہ اس کے سوا برا انجام اور بھی ہے ۔

نواب تاج الامرا کے وکلاء نے خود ، نواب تاج الامرا ، ان کے خاندان اور اعلیٰ عہدہ داران ریاست سے رات میں مشورہ کر کے ایک نقشہ اور اپنے حقوق کے متعلق جو دلائل مرتب کیے تھے ، وہ دونوں صاحبان انگریز کو دکھائے گئے ۔ ان لوگوں نے دیکھ کر ڈال دیا اور کہا کہ صرف دو باتوں میں سے ایک بات اختیار کی جائے ، یا تو کرناٹک کی ساری زمین کمپنی کو دے دی جائے یا خود لارڈ صاحب سارے ملک کو ضبط کر لیں گے ۔ اس حالت میں انجام برا ہے ، پرنس کے لیے کوئی چیز معین نہ ہو گی نواب صاحب کے سکونتی باغ پر کمپنی کی پناہ باقی نہ رہے گی ، قرض خواہان اور عدالت کے لوگ آئیں گے ، ان کا جو جی چاہے گا وہ کریں گے ، اور پرنس کی حالت اس وقت مثل ایک عام آدمی کے ہو جائے گی ۔

جواب دیا گیا کہ دونوں نوابان سابق اور پرنس جو اپنے والد کے جانشین اور ولی عہد ہیں ، بادشاہ معظم ، گر یٹ برٹن ، کمپنی اور وفادار قوم انگریز کے دوست رہے ہیں ۔ ہمیں پرنس کے دوستوں سے خوبی کی امید ہے ۔ تمام ملک کمپنی کو دے کر اگر ہم اپنے آقا کے حقوق برباد کر دیں تو پرنس ، ان کا خاندان اور عامہ خلائق کو ہم کیا جواب دیں گے ۔ اگر لارڈ صاحب اپنے اختیار اور حکومت کی بنا پر ملک ضبط کر لیں اور وہ تمام امور جو رحم و انصاف سے دور ہیں عمل میں لائیں ، تو ہم سے بجز اس کے کہ مثل گدائیوں کے انگریزی جھنڈے کے نیچے رہ کر جب تک ہماری جان ہے جاں نثاری کریں اورکیا ہو سکتا ہے ۔ آپ مہربانی فرما کر اس نقشے کو جو مرتب کیا گیا ہے لارڈ صاحب کو ملاحظہ کرائیں ، ان کی خدمت میں ہماری جانب سے اور واجب الرحم پرنس کی جانب سے ہماری عاجزانہ درخواست پیش کر دیں ۔ دونوں صاحبوں نے جواب دیا کہ یہ خواهش کبھی منظور نہ ہو گی ۔ سالار جنگ اور بہرام جنگ نے کہا کہ کمپنی کو خوش کرنے اور اس کی دوستی قائم رکھنے کے لیے ہم سے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ لارڈ صاحب کو اسے دکھلا دیجیے ۔ ہم بھی نواب صاحب کے خاندان اور دوسرے عہدےداروں پر آپ کے بیان کو ظاہر کر کے کل جواب دیں گے ۔ بڑی منت سماجت کے بعد دونوں صاحب رخصت ہوئے ۔

تیسرے روز دونوں اصحاب پھر آئے اور پھر اپنے مطالبے پر اصرار کیا ۔ ان سے دریافت کیا گیا کہ جو جدید نقشہ مرتب کیا گیا تھا اس کے بعد گورنر صاحب نے کیا کہا ؟ ۔ جواب ملا کہ ہم نے پہلے کہہ دیا ہے کہ یہ نقشہ منظور نہ ہو گا ۔ نواب تاج الامرا کے نائبوں نے اس موقعے پر یہ امر واضح کیا کہ ہم نے نواب صاحب کے اہل خاندان اور عہدے داران ذمہ دار کو جمع کر کے مشورہ کیا اس بات پر اتفاق رائے ہے کہ مرتبہ نقشے میں جو ملک کمپنی کو دینا تجویز کیا گیا

ہے اس سے زیادہ ملک دینا ہمارے اقتدار سے باہر ہے ۔ یہ سن کر کمپنی کے دو اور عہدے داروں نے کہا کہ اب اس صورت میں مزید سوال و جواب کی ضرورت باقی نہیں رہی ، ہم پھر نہیں آئیں گے ۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ سوال و جواب کو منقطع کرنا منشا نہیں ہے، مقدور بھر کمپنی کو خوش کرنا پیش نظر ہے ۔ البتہ یہ مطالبہ کہ ملک کرناٹک سارے کا سارا دے دیا جائے یہ مقدور سے زیادہ ہے اور یہ کام ہرگز نہ ہو سکے گا ۔ اس نوبت پر صاحبان انگریز نے اصرار کیا کہ خود نواب تاج الامرا کی خدمت میں ان کو پیش کیا جائے تاکہ ان کا منشا بالمشافہ دریافت کر لیا جائے ۔ اس خواہش کے جواب میں نواب صاحب کے دونوں وکلاء نے بتایا کہ اگر خود پرنس کو سوال و جواب کی طاقت ہوتی تو نواب صاحب مرحوم کی جانب سے ہم لوگ کیوں ایجنٹ اور نائب مقرر ہوتے ۔ اول تو ان کی عمر بالمشافہ ایسے اہم سوال و جواب کی مقتضی نہیں ہے ۔ اس کے علاوہ اپنے شفیق باپ کی جدائی سے وہ بہت ملول ہیں ۔ اس لیے بالراست ان سے گفت و شنید کرنے کو معاف رکھا جائے تو موجب ترحم ہے ۔ دونوں انگریز صاحبوں نے اپنی بات پر اصرار کیا اور آخر میں کہا کہ بہ لحاظ اس اقتدار کے جو لارڈ صاحب کو حاصل ہے حکم دیا جاتا ہے کہ پرنس کو بلایا جائے ۔ بدقت تمام ایک روز کی مہلت لی گئی ۔ چوتھے روز نواب تاج الامرا کا مزاج درست نہیں تھا پانچویں، روز سالار جنگ اور بہرام جنگ نے کمپنی کے عہدے داروں کو طلب کیا اور نواب سے جو غمگین تھے ان کی ملاقات کرائی ۔ دونوں صاحبوں نے اپنے مرکوز خاطر کو ظاہر کیا ۔ ترغیب اور تخویف کے دونوں پیرائے اختیار کیے ۔ نواب تاج الامرا نے ظاہر کیا کہ میرے نائبوں نے کمپنی کے خوش کرنے کے لیے جو نقشہ میری رضا مندی سے طے کیا ہے اس سے زیادہ کے لیے مجھے قدرت نہیں ہے ۔ اس موقعے پر دونوں صاحبوں نے گورنر کو ایک چٹھی لکھی ۔ اس کا جواب آنے

پر ظاہر کیا کہ لارڈ صاحب اس خیمے میں جو نواب صاحب کے باغ میں کرنل میکلن کے لیے نصب کیا گیا ہے آگئے ہیں ۔ نواب تاج الامرا کو ان کے پاس چلنا چاہیے۔ چنانچہ نواب تاج الامرا ، سالار جنگ اور بہرام جنگ گورنر کے پاس خیمے میں گئے۔ تعارف کے بعد گورنر نے دونوں وکلاء کو علیحدہ خیمے میں بھیج دیا اور خود نواب تاج الامرا سے دیر تک گفتگو کی ۔ گورنر کے چلے جانے کے بعد نواب تاج الامرا نے اپنے مشیروں سے بیان کیا کہ وہی حالات پیش آئے جو اب تک بہرام جنگ اور ان کے ساتھ سالار جنگ کو پیش آ چکے ہیں ۔ گورنر نے کرناٹک کا سارا ملک کمپنی کو دے دینے کی درخواست کی ، سوال و جواب سے تنگ آکر میں نے کہا کہ کل تجویز کر کے کہوں گا۔

دوسرے روز جو گفتگو کا چھٹا روز تھا مسٹر ویب اور ان کے ساتھی پھر آئے اور نواب صاحب سے ملاقات کی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ گورنر سے ملنا بہتر ہے ۔ نواب تاج الامرا نے ان لوگوں پر واضح کیا کہ میں نے اس معاملے میں غور و تامل کیا ہے ۔ میری خواہش ہے کہ جہاں تک مجھ سے ممکن ہے کمپنی کو فایدہ پہنچاؤں اور خوش کروں ۔ لیکن میرے دونوں مشیروں نے جو نقشہ مرتب کیا ہے اس سے زیادہ ملک دینا میری قدرت سے باہر ہے ۔ اس حالت میں اگر میں لارڈ صاحب کے پاس جاؤں تو اسی امر کو ظاہر کرنے کے سوا کوئی اور صورت نہیں ہے ۔ لارڈ صاحب میرے شفیق باپ کے مقام پر ہیں ، مجھے فکر ہے کہ وہ میرے اس جواب سے ناخوش ہو جائیں گے ۔ اگر مجھے چلنے سے معاف رکھا جائے تو میں ممنون رہوں گا ۔ دونوں صاحبان انگریز نے چلنے پر مجبور کیا ۔ بالآخر نواب تاج الامرا اپنے دونوں مشیروں کے ساتھ خیمے میں گئے جہاں گورنر مذکور موجود تھے ۔ انھوں نے نواب صاحب سے تخلیے میں گفتگو کی ۔ ملاقات کے اختتام پر نواب تاج الامرا نے بیان کیا کہ انھوں نے گورنر کو وہی جواب دیا جو دونوں عہدے داروں کو دیا

تھا ۔ گورنر نے نواب صاحب سے کہا کہ آپ اسباب دولت اپنے ہاتھ سے کھو رہے ہیں ۔ آج سے آپ کے ساتھ گفت و شنید منقطع ہوچکی ۔ نواب تاج الامرا نے کہا کہ لارڈ صاحب آپ میرے بہترین باپ کے مقام پر ہیں مجھے کوئی خوف نہیں ہے آپ سے شفقت پدری کی توقع ہے ۔

نواب عمدۃ الامرا کے انتقال کے ساتویں روز نواب تاج الامرا نے اس مکان کا معاینہ کیا جو نواب والا جاہ کے زمانے میں دربار کے لیے کام میں لایا جاتا تھا ۔ واپسی کے وقت کرنل میکلن نے کہا کہ سنا ہے کہ آپ لوگوں نے ارادہ کیا ہے کہ پرنس کو مسند پر بٹھائیں اور نذر پیش کریں ۔ جواب میں یہ بات واضح کی گئی کہ مسند نشینی کی رسم خاندان کے دستور کے مطابق نواب عمدۃ الامرا کے انتقال کے تیسرے روز انجام پذیر ہوچکی ہے ۔ نذریں گذر چکی ہیں ، البتہ چند ماتحت متصدیوں وغیرہ کی نذریں ہونی ہیں ۔ یہ انتظام کیا گیا ہے کہ کل یا پرسوں یہ لوگ بھی اپنی اپنی نذر دے دیں ۔ کرنل میکلن یہ سن کر گورنر مدراس کے پاس گئے اور یہ کہا کہ اس انتظام پر عمل آوری نہ ہونی چاہیے۔ اس موقعے پر کرنل میکلن نے گورنر مدراس کی جانب سے یہ حکم دیا کہ جہاں نواب صاحب کے علاقے کے جوانوں کا پہرہ ہے اس کے بجائے سولجروں کا پہرہ قائم کیا جائے۔ اس حکم پر نواب صاحب کی جانب سے یہ عذر کیا گیا کہ زنانی ڈیوڑھی پر اور ان مقامات پر جو زنانی ڈیوڑھیوں سے متصل ہیں سولجروں کا پہرہ رکھنا مناسب نہیں ہے ۔ دوسرے مقامات پر اگر گورنر صاحب کا حکم ہے تو مجبوری ہے - کرنل صاحب نے کہا مجھے جو حکم ہے میں ضرور اس کی تعمیل کروں گا۔ اس کے بعد انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ سرکاری جوانوں کو جو جا بجا پہرے پر ہیں موقوف کردیا جائے۔ نواب صاحب کے عہدے داروں نے کہا کہ یہ ہو نہیں سکتا ۔ باقی زبردستی جو

چاہے کرلو ۔ کرنل صاحب نے تمام سرکاری جوانوں سے بندوقیں چھین لیں اور ان کو پہرے سے علیحدہ کرکے ہر جگہ سولجروں کے پہرے قائم کر دیے ۔ اس انتظام کے بعد کرنل میکلن نواب تاج الامرا کے چچیرے بھائی نواب عبدالعلی خان عظیم الدولہ کے پاس گئے ، ان سے سالانہ بارہ لاکھ روپے اور پنجم حصۂ آمدنی پر معاملات طے کر لیے ۔ دوسرے روز ان کو اپنے خیمے میں بلوا کر مسٹر ویب اور کرنل میکان سے ان کی ملاقات کرائی ۔

بعد ازاں ہر روز ان کی آمد و رفت شروع ہوگئی ۔ نواب تاج الامرا حزن و ملال سے علیل ہوگئے ۔ ان کے یورپین ڈاکٹر کی رائے سے کرنل میکلن نے باغ کے اندر ہوا خوری کی اجازت دی ۔

نواب عمدۃ الامرا کے انتقال کے دسویں روز کرنل میکلن نے کہا کہ گورنر مدراس کا حکم ہے کہ [فتح چوکی پر جو پرنس کی نشست کا مکان ہے سولجروں کی گارڈ مقرر کیا جائے گا ۔ ہر چند عذر کیا گیا لیکن کرنل نے فتح چوکی کے اندر اور باہر سولجروں کا پہرہ بٹھا دیا اور دفتر میں جا کر کرنل بارڈ اور دوسرے عہدےداروں و متصدیوں کو یہ حکم سنایا کہ تمام لوگ دربار میں آنے سے باز رہیں ۔ سارے دفاتر اور خزانے پر اپنی مہر کر دی گویا نواب صاحب تاج الامرا اور ان کے متوسلین پر قیامت قائم ہوگئی ، تمام سوال و جواب اور نوشت و خواند موقوف ہو گئی ، جو تھوڑا سا روپیہ محلات اور چارپائیوں کے اخراجات کے لیے خزانے میں تھا اس پر بھی مہر توڑا ہو گیا ۔

۱۵- ربیع الاول کو کرنل میکلن کے پاس سے ترپ سوار نے آکے پیام دیا کہ فتح چوکی کا مکان نواب عظیم الدولہ کے لوگوں کو دکھایا جائے۔ جواب میں نواب تاج الامرا کے عہدے داروں نے کہا کہ یہ مکان پرنس ولی عہد کا سکونتی ہے ، اس کو دوسرے کے تفویض کرنے کا خیال نہ کرنا چاہیے ۔ اس کے بعد پیام آیا کہ ہمایوں محل

کی کنجی بھیج دی جائے اور یہ مکان عظیم‌الدولہ کے لوگوں کو دکھایا جائے۔ اس کے جواب میں یہ کہا گیا کہ اس مکان سے نواب والا جاہ کے محلات کے مکانات مد نظر ہوتے ہیں اس لیے اس کی کنجی خود ولی عہد کے پاس رہا کرتی ہے۔ جس مقام پر ناموس کا اندیشہ ہے اس کی کنجی دوسرے کو کس طرح دی جاسکتی ہے۔ کرنل میکان نے بہرام جنگ کو طلب کرکے ان سے کہا کہ گورنر مدراس کا حکم ہے کہ اگر کنجی نہ دی جائے تو آپ لوگوں کو بہت تکلیف پہنچے گی۔ بعد ازاں بار بار ترپ سوار آکر کنجی کا مطالبہ کرتا رہا۔ نواب تاج الامرا ان حالات کو دیکھ کر محل میں چلے گئے اور ان کے مشیروں نے کرنل میکان کے اصرار پر ہمایوں محل کی کنجی نواب صاحب سے طلب کرکے بھجوا دی۔ اس کے بعد سرکاری فراشوں پر نگرانی قائم کرکے ہمایوں محل اور اس کے بالا خانے پر باناتت کا فرش بھجوایا گیا۔

نواب تاج الامرا نے دو کاغذات اپنے حقوق اور کمپنی کے فواید کے متعلق اپنے یوروپین ڈاکٹر کے توسط سے اہل حکومت کے پاس بھیجے، لیکن یہ کاغذات واپس کردیے گئے۔ ۱۷ - ربیع الاول کو مسٹر ویب وغیرہ کمپنی کے عہدے دار بڑے دیوان خانے میں؛ جہاں دربار ہوا کرتا تھا، آئے یہ لوگ جب بالا خانے پر آئے تو چونکہ زنان خانہ مدنظر ہوتا تھا محل کی ساری خواتین خوف کے مارے کانپنے لگیں — ۱۸ - ربیع الاول کو علمائے مدراس نے فتویٰ دیا کہ نواب عظیم الدولہ جانشین نہیں ہو سکتے اور اہل خاندان نے بھی محضر بھجوایا -

علمائے مدراس کے فتوے کی نقل حسب ذیل ہے:

”حکم شرع شریف و عرف قدیم و عادات خلفاء وسلاطین که والی شخص پسر وے می شود و چون پدر پسر را والی کرداند۔ وہمہ اشیاء خود به آن پسر دهد۔ آن پسر والی کردد

خواه آن پسر از بطن بیگم باشد یا غیر۔ با آنکه والی باوجود بودن پسر غیر را که متبنی است یا اجنبی و قایم مقام خود کند۔ غرض که والی ملک اگر احدے را قائم مقام و ولی عہد کند خواہ پسر باشد یا غیر آن ولی عہد والی ملک می‌گردد و اطاعت وے لازم می گردد و برہمین حکم توارث از خلفائے راشدین واقع که خلیفه اول امیرالمومنین رض باوجود داشتین پسران امیرالمومنین رض عمر را وصی و جانشین خود فرمود او امیر المومنین شد۔ وهمه مومنان در اطاعت وے آمدند۔ وهم این حکم متوارث گشت۔ میان سلاطین که بعد خلفاء شدند و از زمان عبدالملک که بادشاه عرب و عجم بود تا سلطنت بنی عباس ابو منصور و هارون رشید و مامون رشید که پسر کنیز زاده هارون بود از همین قبیل سلطنت قائم شد و مستنصر باالله و متوکل علی الله این همه بادشاهان عرب و عجم بودند۔ هم چنیں سلاطین که بعد ایشان شدند۔ تا این زمان و هر سلطانے کسے مرد وصیت می کردیکے رابه قیام به مقام خود آن کسے خلیفه و سلطان می شد و همه کسان در اطاعت وے می شدند و کسے که از اطاعت وے خارج می شد حکم به حبس و قتل می کردند۔ و برین بود اتفاق علمائے اکرام چنانکه برهمیں دلایل شرعیه و عادات سلاطین حال و سلاطین سلف وراثت و حقیقت جمیع امور حقوق و املاک متعلقه نواب والا جاه امیر الهند علیه‌الرحمته به نواب عمدة الامرا مغفرت مآب رسید و از مغفرت مآب به نواب تاج الامرا بهادر که پسر و وارث و وصی و ولی عهد نواب مغفرت مآب است رسید۔ نواب تاج الامرا را ولی عهد خود و جانشین خود ساختند و وارث حقوق مرقوم‌الصدر نواب تاج الامرا بهادر است مداخلت غیر شرعاً و عرفاً نمی تواند شد۔"

اس فتوے پر حسب ذیل علماء کے دستخط تھے :

مولانا عبدالعلی ملک‌العلماء بحرالعلوم ـ مولانا غلام حسین خان قاضی‌العلوی ـ مولانا سید عبداللہ۔ مولانا محمود ساوی۔ مولوی‌محمدعلی۔ مولوی محمد صادق مولوی کریم‌اللہ ـ مولوی علی‌الدین احمد ـ مولوی عبدالرب فرزند ملک‌العلماء ـ مولوی محمد باقر ـ

اهل خاندان نے جو محضر پیش کیا وہ یہ ہے :

”که مایان مردم فیملی نواب والا جاه علیه‌الرحمة و نواب عمدة الامرا بهادر ایم ظاهر اهل حکومت تجویز جانشین کردن عبدالعلی عرف عظیم‌الدوله دارند از روئے شریعت اهل اسلام به هیچ وجه حقیقت این معنی به مشازالیه که محروم الارث است نمی رسد ـ امیرالامرا مرحوم هیچ وصیت در باب فرزندی و وارثت عظیم‌الدوله له کرده بودند ـ بندگان نواب والا جاه علیه‌الرحمة نیز هیچ چیز از متعلقه امیرالا مرا و از حقوق متعلقه خود به مشازالیه ندادند ـ“

انگریزوں نے پنشن یافتہ نوابی کے متعلق جو طریقہ اختیارکیا اس کی صراحت قبل ازیں کر دی گئی ہے ـ

(۹) سدھوت اور کرنول کے پٹھانوں کی حکومت

اضلاع سدھوت ، کڑپہ ـ اور کرنول وغیرہ میں ایک عرصے تک بعض پٹھان خاندان خود مختارانہ حکمران کی حیثیت سے حکومت کی نوبت بجاتے رہے ہیں ـ جب ان کی حکومت کے آغاز پر نظر ڈالی جاتی ہے تو واضح ہوتا ہے کہ بہلول خان ساونوری عادل شاہی امیر تھا ـ اس کی اولاد سے نبی خان عرف رن مست خان میانہ آخری شخص ہے جو بیجا پور میں صاحب عزت و مرتبہ امیر تھا ـ علی عادل شاہ ثانی سنہ ۱۰۶۷ھ تا سنہ ۱۰۸۳ھ کے زمانے میں اس کے تین لڑکے اعظم خان، رحیم خان اورکریم خان۔

دربار بیجا پور سے کنارہ کشی کرکے اورنگ زیب کے ساتھ مل گئے اور خان جہان کی وساطت سے دربار عالمگیر میں باریاب ہو کر منصب اور جاگیر سے سرفراز ہوئے ۔

اعظم خان اپنے حسن تدبیر اور حسن کارگزاری سے اعلیٰ منصب پر فائز ہوا اور اپنے بھائی کریم خان کو اپنا میر سامان مقرر کیا ۔ مگر رحیم خان نے کم مائگی سے برداشتہ خاطر ہو کر قطب شاہی سلطنت کی راہ لی ۔ میر جملہ کے توسط سے سلطان عبداللہ کے دربار میں باریاب ہو کر منصب سہ ہزار سے سرفراز ہوا ۔ بعض معرکوں میں داد شجاعت لے کر نام آوری حاصل کر لی مگر زندگی نے وفا نہ کی ۔

اس کی جگہ اس کا فرزند نیک نام خان مامور ہوا ۔ بالا گھاٹ کے معرکے میں میر جملہ کے ساتھ شریک رہا ۔ واپسی میں قلعۂ سدھوٹ کا محاصرہ ہوا مگر ”نائک پالیگار،، نے صلح کر لی ۔ میر جملہ پایان گھاٹ کی تسخیر کے لیے روانہ ہوا ۔ نیک نام خان کو اس کی عمدہ خدمات کے صلے میں نہ صرف پرگنہ چھیور جاگیر میں ملا بلکہ علم، نوبت اور نقارے سے بھی سرفراز کیا گیا ۔

میر جملہ کی روانگی کے بعد نیک نام خان نے قرب و جوار کے دیگر مقامات مثلاً کنچی کوٹہ ، بدویل ، جمل ورک وغیرہ فتح کیے اور آخر میں قلعۂ سدھوٹ بھی تسخیر کر لیا ۔ اس کامیابی کے صلے میں دربار قطب شاہی سے مزید پچاس لاکھ سالانہ حاصل کی جاگیر تعلقہ کنچی کوٹہ اور چنور وغیرہ مل گئیں ۔

نیک نام خان نے قلعۂ سدھوٹ کو اپنا مستقر بنایا اور اس کے باہر جہاں ایام محاصرہ میں میر جملہ کا کیمپ تھا ، ایک نیا شہر آباد کر کے اپنے نام پر نیک نام آباد سے موسوم کیا ۔ اس عرصے میں بیجا پور اور گولکنڈہ سلطنت دھلی میں شامل ہو چکے تھے ۔ دؤاد خان یعنی فرزند خضر خان عالمگیر کی جانب سے ذوالفقار خان

کی نیابت میں کرناٹک کا صوبے دار مقرر ہوا ۔

جب یہ نیک نام آباد پہنچا تو چند روز یہاں قیام کیا کیونکہ نیک نام خان بیمار تھا آخر اس کا انتقال ہو گیا داؤد خان نے اس کے بھانجے لعل خان کو اس کا جانشین نامزد کیا ۔

جب عالمگیر کے بعد محمد معظم اور محمد اعظم کی خانہ جنگیاں ہوئیں تو اس زمانے میں اعظم خان اور کریم خان نے (جس کا قبل ازیں ذکر کیا گیا ہے) خاص ترقی کی محمد معظم بہادر شاہ کی جانب سے مردانہ وار لڑے اور دونوں مارے گئے ۔ چونکہ اعظم خان کی کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے عبدالنبی ابن کریم خان دربار مغلیہ کی جانب سے سرفراز کیا گیا اس کی اولاد کے چھ شخصوں نے سنہ ۱۱۹۱ ھجری تک سدھوٹ میں تقریباً خود مختارانہ حکمرانی کی ۔

عبدالنبی خان

عبدالنبی خان ابن عبدالکریم خان جو عبدالرحیم خان کا داماد بھی تھا مغلیہ سلطنت کی جانب سے سدھوٹ کا قلعہ دار بنایا گیا ۔ اس کی دلاوری اور کامیابی کے متعلق ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے جس وقت عبدالنبی خان کو دربار سلطانی میں طلب کیا گیا اس وقت عزیز خان (جو نیک نام خان کا خواص زادہ تھا) نے جانشینی کا دعویٰ کیا ۔ دونوں دعوے داروں کے سامنے ایک شیر چھوڑا گیا ، عزیز خان تو شیر کا لقمہ بن گیا ، مگر عبدالنبی خان نے اس کو ہلاک کر دیا ۔

غرضیکہ عبدالنبی خان قلعہ دار بن گیا ۔ اپنے لواحقین کو انعام و اکرام سے سرفراز کیا ۔ زمینداران قرب و جوار پر (جو پالیگار سے موسوم تھے) فوج کشی کر کے اپنے علاقے کو وسیع کر لیا ۔

نو آباد شہر کو بجائے جدید نام نیک نام آباد کے اس کے قدیم نام ''کرپہ'' سے موسوم کیا ۔ یہاں جدید محلے اور قصر تعمیر کیے ، دل کشا باغ لگائے اور علم و ہنر کی ترویج کی ۔ محمد بن رضا اس کے دربار کا شاعر تھا ۔ جس نے قصیدہ بردہ کا دکنی نظم میں ترجمہ کیا ۔ سنہ ۱۱۲۷ ھجری میں عبدالنبی خان کا انتقال ہوا ۔ چار لڑکے اپنی یادگار چھوڑے یعنی عبدالمجید خان عبدالحمید خان ۔ محسن خان عرف موچا میاں اور حسینی میاں ۔

عبدالمجید خان از سنہ ۱۱۲۷ھ تا سنہ ۱۱۳۶ھ

اگرچہ نابینا تھا مگر باپ کے بعد جانشین ہوا ۔ بھائیوں نے اطاعت کی فہم و فراست عقل و دانش میں کامل تھا ۔ خویش و بیگانہ کو تالیف قلوب سے گرویدہ کر لیا ۔

اسی زمانے میں جب داؤد خان برہان پور میں قتل ہو گیا ، تو خان جہاں خان نے سید عرب خان کو کرناٹک کی طرف انتظام کے لیے روانہ کیا ۔ عبدالمجید خان نے اول تو دوستی ظاہر کی مگر جب کرپہ کے قریب پہنچ گیا تو اپنے بھائی عبدالحمید خان کے تحت ایک لشکر لڑائی کے لیے روانہ کیا ۔ جب اس کو کامیابی نہیں ہوئی تو خود ایک ہزار آہن پوش سواروں کے ساتھ مقابلے کے لیے آیا ۔ عرب خان پر فتح پائی اس کو قتل کر دیا اس طرح گویا مغلیہ فوج پر فتح یاب ہو کر کامیاب ہوا ۔ اس کے بعد چیتل ورک کے زمینداروں پر فوج کشی کر کے کامیاب ہوا ۔

اب نواب قمرالدین خان آصف جاہ اول صوبہ دار ہو کر اورنگ آباد آئے ۔ ان کے حسب الطلب عبدالمجید خان دربار آصفی میں حاضر ہوا شکر کھیرہ کی لڑائی میں آپ کا ساتھ دیا ۔ بہادری دکھائی جس کے باعث مورد عنایت آصف جاہ ہوا ۔ آپ کے

حیدر آباد کی جانب متوجہ ہونے پر اجازت لےکر اپنے مستقر کو روانہ ہوا ۔ اس کے چند روز بعد مرہٹوں کی جنگ میں سرخ رو ہوا ۔ سنہ۱۱۳۶ ہجری میں انتقال کیا ۔

عبدالحمید خان از سنه ۱۱۳٦ھ تا ۱۱۵۹ھ

بھائی کی جگہ مسند قلعہ داری پر متمکن ہوا ۔ آصف جاہ کی اطاعت اختیار کی چند روز شریک رزم بزم ہوا ۔ جس وقت آصف جاہ اور ناصر جنگ (باپ بیٹے) میں جنگ ہوئی تو اس نے بیٹے کا ساتھ دیا ۔ جنگ ختم ہونے پر آصف جاہ نے چشم پوشی کر لی ۔ سنہ ۱۱۵۷ ہجری میں جب پائین گھاٹ کے بندوبست کے لیے روانہ ہوئے تو اس کو مرحمتوں سے سرفراز فرمایا ۔ نتھڑ نگر (ارکاٹ) کی واپسی پر عبدالحمید خان نے رخصت چاہی اپنے مستقر کو واپس ہوا اور چند روز کے بعد سنہ ۱۱۵۹ ہجری میں انتقال کیا ۔

عبدالحمید خان کے عہد میں شہر سدھوٹ کی خاص ترقی ہوئی ۔ نئی نئی عمارتیں بنیں ، باغات لگائے گئے ، علم و فن کی سرپرستی کی گئی ، شعر و شاعری کا چرچا تھا ۔ قلعے دار کے سوا امرائے دربار کو بھی اس کا شوق تھا ۔ محمد حیدر ابن جعفر اس عہد کا مشہور شاعر ہے ، جس نے ابن نشاطی کے پھول بن کا اضافہ کیا ۔

محسن خان

بھائی کی جگہ مسند نشین ہوا ۔ فرانسیسیوں سے (جو اس زمانے میں پھلچر میں تھے) مدد لے کر زمینداران جڑلہ وغیرہ پر فوج کشی کی اس کے بعد بیگن پلی کے قلعے دار میر غلام علی عرف کلو پر چڑھائی کی مگر شکست پائی۔ دوبارہ اپنے بھتیجے عبدالمجید خان کی سرکردگی میں پیش قدمی کی ۔ فرانسیسی فوج بھی ہمراہ تھی ۔

بیگن پلی فتح ہوا ۔ قلعے دار نے پیشکش ادا کی اور نذرانہ دینا قبول کیا ۔

سنہ ۱۱۶۱ھ میں جب آصف جاہ اول کا انتقال ہوا اور ناصر جنگ جانشین ہوئے اور ہدایت محی الدین خان مظفر جنگ کی لڑائیاں ہوئیں تو چندا صاحب اور فرانسیسیوں نے مظفر جنگ کا ساتھ دیا ۔ اس وقت محسن خان اول تو نا طرف دار رہا مگر اس کے بعد ناصر جنگ کی حمایت کے لیے روانہ ہوا ، اثنائے راہ میں بگاڑ ہوگیا اور ناصر جنگ شہید ہوگئے۔ مظفر جنگ فرانسیسیوں کی مدد سے دکن کے حکمران ہو کر حیدر آباد کی جانب روانہ ہوئے ۔ رائچوٹی کے مقام پر فرانسیسیوں اور افغانوں میں بگاڑ ہو کر خانہ جنگی برپا ہوئی ۔ مظفر جنگ مارے گئے ۔ محسن خان اونٹ پر سوار ہو کر سدھوٹ کو فرار ہو گیا اور وہاں اپنے ملک کے انتظام مالی و ملکی میں مصروف رہا ۔ مظفر جنگ کے مارے جانے کے بعد نواب صلابت جنگ جو آصف جاہ اول کے تیسرے فرزند تھے دکن کے حکمران ہوئے اور فرانسیسیوں کی فوج کے ساتھ ان کی حمایت میں حیدر آباد روانہ ہوئے ۔

عبدالمجید خان

چونکہ محسن خان نے ملازمین کی تنخواہ کم کردی تھی اس لیے امرا نے بد دل ہوکر اس کو مقید کردیا اور عبدالمجید خان کر حکمران بنایا ۔

حکمرانی کے بعد عبدالمجید خان نے اول تو قلمرو آصفی پر تاخت کا ارادہ کیا مگر پھر پالیگاران بالا گھاٹ کی جانب متوجہ ہوا ۔ کھٹ کبر ، نیکنور اور مدن پلی وغیرہ مقامات فتح کر لیے۔ اس کے بعد باونت راؤ مرہٹہ نے سدھوٹ پر فوج کشی کی ۔ ایک مرتبہ مرہٹوں نے عبدالمجید خان کی ہمشیرہ کے بدرقے پر چھاپا

مارا اس واقعے کی اطلاع پا کر عبدالمجید خان برافروختہ ہوا مرنے مارنے پر آمادہ ہو کر قلعے سے نکلا ۔ اس امر کی منادی کر دی کہ جو شخص مرنے کے لیے تیار ہے وہ ساتھ چلے اور جس کو جان و مال کی تمنا ہے وہ اس کے ساتھ نہ ہو ۔ ایک ہزار افغان ہمراہ ہوئے قلعے کی حفاظت کے لیے فرانسیسی فوج چھوڑی گئی مرہٹوں کی تعداد کئی ہزار تھی ۔ اس کے مقابل افغان صرف ایک ہزار تھے ، بڑے معرکے کا رن پڑا ۔ صدہا آدمی قتل ہوئے ، بڑی جوانمردی اور جانبازی کے بعد خود عبدالمجید خان بھی قتل ہوگیا ۔ لاش کو سدھوٹ لا کر باپ کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا ۔

اس کے زمانے میں بھی دکھنی شعر و شاعری کا رواج تھا ۔ ولی ویلوری اس کے دربار کا شاعر تھا جس نے اس کے عہد میں اپنی مشہور مثنوی ''رتن ویدم'' کی تصنیف کی تھی ۔

محسن خان

عبدالمجید خان کے مارے جانے پر محسن خان دوبارہ حکمران ہوا ۔ اس عرصے میں پالیگار رائے وغیرہ مفتوحہ ممالک پر قابض ہوگئے ۔ فرانسیسی فوج کی تنخواہ کئی ماہ سے ادا نہیں ہوئی تھی ۔ جس کے باعث وہ بھی جنگ پر آمادہ ہو گئے ۔ سرور خان متبنوا لڑکے نے ان کا ساتھ دیا، مگر جنگ کی نوبت نہیں آئی، تنخواہ ادا کر دی گئی اور فتنہ فرو ہوگیا ۔ کچھ عرصے کے بعد پالیگاران سے وصولی پیش کش کے لیے روانہ ہوا ۔ اثنائے راہ میں پیمانۂ عمر لبریز ہو گیا ۔لاش کرپہ میں لا کر دفن کی گئی ۔

عبدالحلیم خان

محسن خان کی کوئی اولاد نہیں تھی ۔ عبدالمجید خان کا لڑکا عبدالحلیم خان جانشین ہوا۔ سرور خان فوج فراہم کرکے مقابلے کے لیے آیا ۔ مگر کامیابی نہیں ہوئی اس کے بعد پالیگاران سے مقابلے

ہوئے۔ پھر حیدر علی والیٔ میسور نے حملے شروع کر دیے آخر کار سنہ ۱۱۹۰ھ میں سدھوٹ بھی فتح ہو گیا۔ عبدالحلیم خان کو مع متعلقین گرفتار کر کے کنجام کے قلعے میں مقید کیا گیا اور حیدر علی نے رضا خان کو سدھوٹ کا قلعہ دار بنا دیا۔

عبدالحلیم خان کے داماد سید محمد نے فوج فراہم کی اور انگریزوں سے ، جو مچھلی بندر میں تھے، مدد لے کر سنہ ۱۱۹۷ھ میں اپنے آبائی ملک کی واپسی کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ حیدر آباد فرار ہوکر آیا یہاں چند روز کے بعد انتقال کیا۔

اس طرح سدھوٹ سنہ ۱۱۹۱ھ میں میسور میں شامل ہو گیا۔ اس کے بعد سنہ ۱۲۰۷ھ میں نظام الملک آصف جاہ ثانی نواب میر نظام علی خان نے اس کو فتح کر لیا اور سنہ ۱۲۱۵ھ میں انگریزی فوج کی تنخواہ کے لیے سرکار کمپنی کو دیا گیا۔[1]

(۱۰) میسور کی حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی حکومت

میسور کی اسلامی حکومت حیدر علی نے قائم کی اور ٹیپو سلطان کے شہید ہونے پر اس کا خاتمہ ہوا۔

حیدر علی عربی النسل تھا۔ اس کے آبا و اجداد ہندوستان آئے، سپاہ گری کو اپنا پیشہ قرار دیا اور عادل شاہی سلطنت میں ملازمت اختیار کی۔ مگر کچھ عرصے بعد اس خاندان کے تین بھائی

۱۔ حالات بالا حسب ذیل تاریخوں سے اخذ کیے گئے ہیں:

۱۔ ''تذکرۃ البلاد و الحکام'' مصنفہ حسن علی کرمانی مرتبہ سنہ ۱۲۱۵ھ (مخطوطہ)

۲۔ ''نشان حیدری'' مصنفہ حسن علی کرمانی مرتبہ سنہ ۱۲۱۷ھ (مخطوطہ)

۳۔ ''سوانح دکن'' مصنفہ منعم خان (مخطوطہ)

۴۔ ''حدیقۃ العلم'' ۔ مطبوعہ

محمد فتح اللہ ، غلام حیدر ، اور غلام علی بیجا پور سے نکل کر کولار پہنچے ۔ محمد فتح اللہ نے دلیر خاں ''نواب سرا'' کی ملازمت اختیار کی ۔ غلام حیدر نے ''مدکیر'' کے راجا بلراج کی اور غلام علی تے نے بالا پور میں ملازمتیں کیں ۔ محمد فتح اللہ نے اپنی ملازمت ہی کے سلسلے میں ''چیتل درگ'' کی جنگ میں شہادت پائی اور اس کے دو لڑکے شہباز صاحب اور حیدر صاحب اپنے چچا غلام حیدر کے پاس چلے آئے اور ان کے مرنے پر بلراج کی ملازمت اختیار کر لی ۔ اس کے کچھ عرصے بعد راجا بنگلور نے حیدر صاحب کو اپنی خدمت میں لے لیا ۔ جہاں انھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے ، اپنی بہادری اور دلاوری سے راجا کا تقرب حاصل کر لیا اور حیدر نائک کے لقب سے مشہور ہوئے ۔ ان کی اس دلاوری اور شجاعت نے میسور کے راجا کے دل میں گھر کر لیا اور اس نے ان کو اپنے پاس طلب کر لیا ۔ اس کے بعد حیدر نائک (حیدر علی) نے اپنے زور بازو سے ترقی کرتے ہوئے میسور کی سپہ سالاری حاصل کرلی ۔ راجا کے لا ولد مرنے پر میسور کی مسند حاصل کی[1]۔ ایک عرصے تک بڑی شان و شوکت سے خود مختارانہ حکومت کی ۔

حیدر علی اپنی سلطنت کو وسیع کرنے کی کوشش میں مصروف رہا اس عرصے میں یورپ میں فرانس اور انگریزوں میں جنگ شروع ہوگئی ۔ انگریزوں نے ماہی بندر پر جو ملیبار میں فرانسیسیوں کی تجارتی کوٹھی تھی حملہ کیا ۔ فرانسیسی حیدر علی کی پناہ میں تھے ۔ اس لیے حیدر علی نے ایک بڑی فوج کے ساتھ انگریزوں سے لڑنے کے لیے کرناٹک کی طرف پیش قدمی کی ۔ انگریزوں سے ہنوز لڑائی ہو رہی تھی کہ حیدر علی کا انتقال ہوگیا ۔[2] حیدر علی کے جانشین ٹیپو

۱۔ ''تاریخ جنوبی ہند'' محمود خاں

۲۔ ''تاریخ جنوبی ہند'' مولف محمود خاں صفحہ ۳۱۳ ۔

سلطان سے انگریزوں نے صلح کر لی ۔ ٹیپو سلطان کی رائے تھی کہ نظام حیدر آباد اور ٹیپو سلطان میں رشتے داری ہو جائے تا کہ دونوں مسلمان حکومتیں متحد ہو کر انگریزوں کا مقابلہ کریں ۔ مگر افسوس ہے کہ نظام حیدر آباد کے نا عاقبت اندیش امراء اور محلات نے اس رشتے داری کو منظور نہیں کیا[1] ۔

نظام اور مرہٹوں کی متحدہ فوج ٹیپو سلطان سے جنگ کرتی رہی ۔ اس عرصے میں انگریز بھی ٹیپو سلطان سے جنگ پر تیار ہو گئے اور بنگلور پر انگریزی فوج قابض ہو گئی ۔ بالاخر فریقین میں صلح ہوئی ۔

ٹیپو سلطان چھ سات سال تک جوش و خروش کے ساتھ اپنے ملک کے نظم و نسق اور فوجی تنظیم میں مصروف رہے ۔

سلطان ترکی اور افغانستان وغیرہ اسلامی ممالک سے بھی ٹیپو سلطان مراسلت کرنے لگے تا کہ اسلامی ممالک کی مدد سے انگریزوں پر غلبہ پایا جائے۔ ٹیپو سلطان کی دور اندیشی اور مستعدی سے انگریز خوف زدہ ہوگئے اور اس ابھرتی ہوئی قوت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے کا پختہ ارادہ کر لیا ۔ مرہٹوں اور نظام حیدر آباد کو انگریزوں نے سبز باغ دکھا کر متحد کر لیا ۔ اور اب تینوں کی فوجوں نے ٹیپو سلطان پر حملہ کر دیا ۔ اگرچہ تین مخالفوں کی متحدہ افواج سے مقابلہ کرنا آسان نہ تھا ۔ مگر انگریزوں نے سازش کا جال بھی پھیلا دیا تھا ۔ ٹیپو سلطان کے بعض نمک حرام امراء کو رشوت دے کر فراہم کر لیا گیا[2]۔

متحدہ افواج سرنگا پٹن یعنی ٹیپو سلطان کی دارالسلطنت پر

۱۔ ''نظام علی خاں''

۲۔ ''جنوبی ہند کی تاریخ'' محمود خان ۳۰۶ تا ۳۱۵ ۔

حملہ آور ہوئیں اور سلطان کے غدار افسران فوج کے باعث قلعے میں داخل ہو گئیں ۔ ٹیپو سلطان ان سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے ۔[1]

(۱۱) حیدر آباد کی حکومت آصفیہ

دکن میں حکومت آصفیہ کا آغاز سنہ ۱۱۳۶ ھجری سے شمار کیا جاتا ہے ۔ جب کہ آصف جاہ اول قمر الدین نے عماد الملک کے نائب عالم علی خاں سے مقابلہ کرکے فتح پائی ۔[2]

خاندان آصفیہ کے یوں تو (۱۰) اصحاب یکے بعد دیگرے حکومت کرتے رہے، لیکن آصف جاہ کا خطاب درمیانی تین اصحاب کو نہ ملنے سے وہ ''آصف جاہ'' شمار نہیں کیے جاتے ۔

(۱) قمرالدین خان آصف جاہ اول سنہ ۱۷۲۴ع تا سنہ ۱۷۴۸ع
(۲) ناصر جنگ ۔ سنہ ۱۷۴۸ع تا سنہ ۱۱۵۰ع
(۳) مظفر جنگ ہدایت محی الدین خان
سنہ ۱۱۵۰ع تا ۱۱۵۱ع
(۴) صلابت جنگ ۔ سنہ ۱۱۵۱ع تا ۱۱۶۱ع
(۵) نظام علی خان آصف جاہ ثانی سنہ ۱۱۶۱ ع تا ۱۸۰۳ع
(۶) سکندر جاہ آصف جاہ ثلث سنہ ۱۸۰۳ع تا ۱۸۲۹ع
(۷) ناصر الدولہ آصف جاہ رابع سنہ ۱۸۲۹ع تا ۱۸۵۶ع
(۸) افضل الدولہ آصف جاہ خامس ۔ سنہ ۱۸۵۷ع تا ۱۸۶۵ع
(۹) محبوب علی خان آصفجاہ سادس ۔ سنہ ۱۸۶۶ع تا ۱۹۱۱ع
(۱۰) عثمان علی خان آصف جاہ سابع ۔ سنہ ۱۹۱۱ع[3] تا ۱۹۴۸ع

آصف جاہ حکومت کا پرچم (۲۳۱) سال تک دکن کے حصے پر لہراتا رہا ۔ آصف جاہ اول نے دکن کے وسیع حصے کو اپنے قلمرو

۱- ''جنوبی ھند کی تاریخ'' محمود خان ۳۰۶ تا ۳۱۵ ۔
۲- تزک آصفیہ
۳- ''تاریخ دکن'' ھارون خان شیروانی صفحہ ۲ ۔

میں شامل کر لیا تھا ۔ جس کے حدود نربدا سے لے کر مدراس کے
تامل علاقے تک اور بحیرۂ عرب سے خلیج بنگال تک آصفی قلمرو پھیلی
ہوئی تھی ۔ قطب شاہوں کی طرح پورا تلنگانہ آندھرا آپ کی قلمرو
میں شامل تھا ۔ آصف جاہ اول کا انتقال سنہ ۱۱۶۱ ہجری میں ہوا[1]

ناصر جنگ جو آپ کے فرزند تھے اورنگ آباد میں مسند نشیں
ہوئے مگر آپ کو اپنے بھانجے مظفر جنگ سے جنگ آزما ہونا پڑا اور
سازش کی وجہ سے اپنے ایک امیر کے ہاتھ سے شہید ہوگئے (سنہ ۱۱۶۴ھ)
صرف تین سال حکومت فرمائی ۔ پورا آندھرا آپ کے زیر نگیں رہا ۔

ناصر جنگ کے بعد چند ماہ تک مظفر جنگ اور پھر صلابت جنگ
حکمران بنے جو فرانسیسیوں کے جنرل ڈوپلے کے دست نگر تھے ۔
آپ ہی کے زمانے میں آندھرا کا ایک حصہ جو شمالی سرکار سے
موسوم تھا فرانسیسیوں کو فوج کے لیے دے دیا گیا[2] اس طرح پہلی
مرتبہ آندھرا کا بڑا حصہ حکومت آصفیہ سے علیحدہ ہو گیا ۔
صلابت جنگ کے زمانۂ حکمرانی میں انگریزوں اور فرانسیسیوں میں
جنگ شروع ہو چکی تھی ۔ یورپین اقوام دکن میں اپنی قوت کے بڑھانے
کے لیے ایک دوسرے کے مقابل سیاسی توڑ جوڑ کرنے لگے تھے ۔

صلابت جنگ کو فرانسیسیوں نے مسند نشین کرانے میں حصہ
لیا تھا ۔ اس لیے وہ ان کے طرف دار بنے رہے ۔ انگریزوں نے ان
کے مقابلے میں اپنی قوت کو بڑھانے کے لیے، صلابت جنگ کے بھائی
نظام علی خان سے دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور کامیاب ہوگئے۔[3] چند سال
بعد صلابت جنگ کو حالات کے مد نظر حکومت سے دست بردار
ہونا پڑا اور نظام علی خان سنہ ۱۷۶۱ع میں حکومت آصفیہ کے

---

۱ ۔ ''تاریخ دکن'' ہارون خان شروانی صفحہ ۲ ۔
۲ ۔ ''تاریخ دکن'' ہارون خان شر وانی صفحہ ۱۲۱
۳ ۔ ''تاریخ دکن'' ہارون خان شروانی صفحہ ۱۲۳

حکمران بن گئے ۔

نواب نظام علی خان آصف جاہ ثانی طویل عرصے تک حکومت کرتے رہے ۔ آپ کی تین مخالفوں سے معرکہ آرائی ہوئی ۔ اول تو پونہ کے پیشوا سے کئی مرتبہ جنگ ہوئی ۔ جس میں کبھی آپ کو کبھی ان کو کامیابی ہوئی ۔ ان جنگوں کی وجہ سے قلمرو آصفی کا ایک بڑا حصہ جو مہاراشٹر سے متعلق تھا آصفیہ عملداری سے جدا ہوگیا ۔

دوسرا فریق میسور کے حکمران حیدر علی اور ٹیپو سلطان تھے۔ آصف جاہ کو انگریزوں کی تائید میں کئی مرتبہ ان سے جنگ کرنے کی نوبت آئی ۔ آخری مرتبہ بالآخر ٹیپو سلطان کے شہید ہونے پر ان جنگوں کا خاتمہ ہوا ۔

تیسرا فریق بعض باغی امرا تھے ان کی بھی سرکوبی آصف جاہ کو کرنی پڑی جس میں آصف جاہ کو پوری کامیابی ہو ئی ۔

حکومت آصفیہ کا المناک واقعہ یہ ہے کہ سنہ ۱۸۰۳ع کے معاھدے کے بعد جو انگریزوں سے ہوا تھا حکومت آصفیہ انگریزوں کی ایک باج گزار سلطنت بن گئی [1] ۔

اس کے بعد حکومت آصفیہ کو کسی سے مقابلے کرنے کی نوبت نہیں آئی ۔ نواب نظام علی خان آصف جاہ ثانی کا انتقال سنہ ۱۸۰۳ع میں ہو گیا [2]۔ آپ کے بعد آپ کے فرزند پھر ان کے فرزند یعنی سکندر جاہ پھر ناصرالدولہ مسند نشین حکومت آصفیہ ہوئے۔ ان حکمرانوں کے زمانے میں مہاراجا چندولال کو بڑا اقتدار حاصل رہا ۔ ایک طرف امرا اور عہدے داروں کی نا اہلی اور دوسری طرف فرمان روا کا امور ریاست سے غیر دلچسپی کے باعث حکومت آصفیہ کم زور ہوتی گئی ۔ انگریز ریذیڈنٹ اندرون سیاست پر حاوی ہوتے گئے ۔ نہ تو ان کو معاھدوں کا پاس تھا اور نہ اپنے فرائض کا احساس رہا ۔ بھر حال

۱۔ ''تاریخ جنگ آزادی''

۲۔ ''نظام علی خان'' حصہ اول صفحہ ۲۳ ۔

جب جنگ آزادی سنہ ۱۸۵۷ع میں شروع ہوئی اسی زمانے میں ناصرالدولہ آصف جاہ رابع کا انتقال ہوا ، آپ کے فرزند افضل‌الدولہ حکمران بنے اور نواب مختارالملک دارالمہام یعنی چیف منسٹر تھے ۔ حکومت نے انگریزوں کا ساتھ دیا ۔ مگر عوام انگریزوں کے خلاف مظاہرہ کرتے رہے اگرچہ ان کو کامیابی نہ ہوئی اور بہت سے لوگ مارے گئے ۔ ان مظاہرہ کرنے والوں میں طرہ بازخان اور مولوی علاء لدین پیش پیش رہے ان کی سرکردگی میں حیدرآباد کی رزیڈنسی پر حملہ ہوا تھا[۲]

جنگ آزادی میں ہندوستانی عوام کو کامیابی نہیں ہوئی ۔ بلکہ انگریز دیسی فوج کے باعث کامیاب ہو گئے اور اب کمپنی کی حکومت کے بجائے ملکۂ انگلستان کی حکومت قائم ہو گئی ۔

آصف جاہ حضور نظام سے ملقب ہونے لگے ۔ افضل‌الدولہ کا انتقال سنہ ۱۸۶۹ ع میں ہوا ۔ آپ کی جگہ آپ کے کم سن فرزند نواب میر محبوب علی خاں صاحب کو حکمران بنایا گیا اور انتظام ملک ایک ایجنسی کے تحت کیا گیا ۔ جس میں نواب مختارالملک دیوان اور شمش‌الامرا شریک تھے ۔

مختارالملک نے انتظام سلطنت کے لیے بڑی جد و جہد کی قلمرو آصفی جو عربوں روہیلوں وغیرہ کے عہد میں تھا اور حکومت کا کوئی نظم و نسق نہیں تھا ۔ نواب مختارالملک کی بڑی جد و جہد سے عہدیداروں سے ملک کے حصے حاصل کیے اور نظم و نسق کا بڑے سلیقے سے انتظام کیا ۔ مال‌گزاری ، عدالت ، تعلیم ، پولیس ، تعمیرات ، طباعت ، بلد یہ غرض ایک باقاعدہ حکومت کے لیے جس عمدہ نظم و نسق کی ضرورت ہوتی ہے اس کی نہ صرف داغ بیل ڈالی بلکہ بڑی حد تک کامیابی حاصل کر لی ۔

۱- ''رئیس سے راج پر مکھ تک'' صفحہ ۱۱ -
۲- ''ریاض مختاریہ'' -

نواب مختارالملک کی اصلاحات کی صراحت طویل صفحات کی متقاضی ہے اس لیے اس کو نظر انداز کیا جاتا ہے ۔

نواب مختارالملک کا انتقال سنہ ۱۸۸۲ع میں ہوا [1] ۔ مختارالملک کے انتقال کے بعد نواب میر محبوب علی خان کو پورے اختیارات کے ساتھ سنہ ۱۸۸۲ع میں حکمران تسلیم کر لیا گیا [2] ۔

اب حکومت آصفیہ کا ایک جدید دور شروع ہوا یکے بعد دیگرے تین امیر یعنی سالار جنگ ثانی عماد السلطنت ، آسمان جاہ اور اقبال الدولہ مدار المہام بنے اور کچھ کچھ عرصے کے بعد سبک دوش ہوتے گئے۔ بالاخر اقبال‌الدولہ کی علیحدگی کے بعد مہاراجا کشن پرشاد وزیر اعظم بنائے گئے ۔

نواب میر محبوب علی خان کا دور حکمرانی کئی اہم واقعات پر مشتمل ہے مثلاً فوج کی تنظیم ، سررشتۂ فنانس اور پولیس کی اصلاح ؛ جو انگریز عہدے داروں سے متعلق ہوتی تھی ۔ حکومت آصفیہ کے نا اہل خود غرض ذاتی مفاد پسند عہدیداروں کے باعث رزیڈنٹ کا اثر اور رسوخ بہت زیادہ ہو گیا تھا اور میر محبوب علی خان انگریز یعنی رزیڈنٹ سے خوف کھاتے تھے ۔

سنہ ۱۹۱۱ ع میں نواب میر محبوب علی خان کا انتقال ہو گیا اور آپ کی جگہ نواب میر عثمان علی خان مسند نشین ہوئے۔ سب سے پہلے آپ نے کوتوال شہر اور مدارالمہام وقت تبدیل کیا ۔ نواب سالار جنگ جو نوجوان تھے اس اہم خدمت چیف منسٹری پر مامور کیے گئے۔ مگر بہت جلد ان کو سبک دوش ہونا پڑا ۔ کچھ عرصے تک بلا مدار المہام کام ہوتا رہا ۔ بالاخر سر علی امام کے صدارت اعظم

۱۔ ”تاریخ دکن“ ہارون خاں ۔

۲۔ تزک محبوبیہ ۔

کے تحت باب حکومت قائم ہوا [۱] ۔ یکے بعد دیگر آٹھ صدر اعظم ہوئے۔

سر علی امام کے زمانے میں ملک کی اصلاح اور تنظیم کا جو نقشہ مرتب ہوا تھا وہ ان کے مرنے کے بعد التوا میں پڑ گیا ۔ اور سنہ ۱۹۲۰ ع سے آل انڈیا کانگرس نے گاندھی جی کی سر کردگی میں آزادی کے لیے عوامی جدوجہد شروع کر دی ۔ اس سلسلے میں اوڈیشنل کانفرنسیں ہوئیں ۔

یہ ایک حقیقت نفس الامر ہے کہ سنہ ۱۹۲۰ع تک حکومت آصفیہ اپنے قدیم تاریخی اصول رواداری اور بے تعصبی پر قائم رہی ۔ حکومت کے تقررات بلا تفریق مذہب و ملت ہوتے تھے ، ملک میں مذہب کی کوئی تفریق نہیں تھی ۔

لیکن جب کانگرس عوام سے متعلق ہوگئی تو قلمرو آصفی میں اس کا اثر ہونے لگا۔ قلمرو آصفی کے سرحدی علاقوں میں جو برٹش سے ملتے تھے شر پسند اصحاب قلمرو آصفی میں داخل ہوکر بے علم اور جاہل عوام کے خیالات کو بدلنے لگے بعض ایسے اصحاب آصفی قلمرو میں آ کر متوطن ہوگئے تھے جو شر پسند بن گئے، حیدر آباد سے باہر جا کر اشرار کو قلمرو آصفی میں فساد برپا کرنے کی ترغیب دیتے رہے ۔ جس کا تحریری ثبوت سنٹرل ریکارڈ آفس میں موجود ہے ۔

ان امور کے مد نظر حکومت آصفی کو بھی اپنے نصب العین اور طرز عمل میں تبدیلی کرنا ناگزیر ہو گیا ۔

حالات کا اندازہ کر کے اتحاد المسلمین قائم ہو گئی ۔ سر علی امام کے بعد سر اکبر حیدری کے صدر اعظم ہونے تک جو زمانہ گذرا اس کو عبوری دور کہنا چاہیے ۔

سر اکبر اولاً برٹش انڈیا سے صدر محاسب کی خدمت کے لیے

---

۱ ”تذکرہ باب حکومت“ مطبوعہ ۔

مستعار لیے گئے تھے ۔ انھوں نے حیدرآباد کی سیاست پر عبور حاصل کر کے حکومت میں اپنا اثر قائم کرلیا حتیٰ کہ صدر اعظم بن گئے ۔ جب کانگرس کی عوامی جد و جہد شروع ہوئی تو بہادر یار جنگ نے حیدرآباد کے مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے میدان سیاست میں قدم رکھا ۔ دوسری طرف حیدرآبادی ہندو لیڈر بھی سامنے آگئے۔ مسٹر ایم ۔ نرسنگ راؤ اور بہادر یار جنگ کی مراسلت ہوئی اور ریاست میں ہندو مسلم حقوق کے لیے رسا کشی شروع ہوئی ۔ اس عرصے میں یورپ کی دوسری جنگ ہوئی ۔ اس کے بعد جو واقعات ہندوستان کی سیاست میں رونما ہوئے وہ عصر حاضر کے سب لوگوں کو معلوم ہیں مزید وضاحت کی یہاں ضرورت نہیں معلوم ہوتی ۔

بہادر یار جنگ کے مرنے پر کئی اصحاب مسلمانوں کی قیادت کے لیے میدان میں آئے بالآخر سید قاسم رضوی کی غلط سیاست نے جو روز بد حیدرآباد کو دکھایا وہ ایک علیحدہ مقالے کا متقاضی ہے ۔

ستمبر سنہ ۱۹۴۸ع میں ہندوستان کی عوامی جمہوری حکومت کے پولیس ایکشن کے ذریعے حکومت آصفیہ ختم ہو گئی ۔ کچھ عرصے تک میر عثمان علی خان راج پرمکھ بنے رہے ۔ لیکن جب لسانی تقسیم ہوئی تو انھوں نے حکومت سے دست برداری اختیار کر لی ۔

تیسرا باب

دکن میں مغربی (یورپین) تہذیب اور تمدن کا آغاز

جنوبی ہند میں مغربی اقوام میں سے پرتگیزی، ولندیزی، انگریز اور فرانسیسی اقوام آئیں ، انھوں نے مسلمان مبلغین کی طرح ساحل سمندر کا تجارتی کاروبار آغاز کیا تھا ۔ ان یوربین آنے والوں میں اولاً اہل پرتگیز آئے۔ چنانچہ زین‌الدین المعربی نے اپنی کتاب ''تحفة المجاهدین'' میں ان کے آنے کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے ۔

اہل پرتگال ملیبار میں پہلے پہل سنہ ۹۰۴ ہجری میں آئے اور موسم بارش کے اختتام پر کشتیوں کے ذریعے قندریہ میں پہنچے ۔ اس کے بعد انھوں نے خشکی کے راستے سے بندر گاہ کالی کوٹ کی طرف کوچ کیا ، وہاں چند ماہ کے لیے اقامت اختیار کی اور ملیبار کے متعلق ہر قسم کے حالات دریافت کر کے پرتگال کو واپس چلے گئے ۔ اہل پرتگال پھر دو سال کے بعد چھ کشتیوں میں سوارہوکر تجارت کی غرض سے سنہ ۹۰۶ ہجری میں کالی کوٹ میں داخل ہوئے اور کالی مرچ کی تجارت کرنے لگے ۔[1]

ایک پرتگالی مورخ فار یاسی سوزا کا بیان ہے کہ واسکوڈی گاما پرتگال کی دارالحکومت لزبن سے ۷ - جولائی سنہ۱۴۹۷ع کو روانہ ہوا اور افریقہ کے گرد ہو کر ۲۰ - جولائی سنہ ۱۴۹۸ع میں اس کا جہاز ملیبار پر لنگر انداز ہوا ۔[2]

---

۱ و ۲- ترجمہ ''تحفہ" المجاہدین'' حکیم شمس‌اللہ قادری صفحہ ۲۶ ۔

پرتگیزوں کے بعد ڈچ (اہل ہالینڈ) نے جنوبی ہند کا رخ کیا اور سنہ ۱۶۷۵ع میں ان کی تجارتی کوٹھیاں قائم ہوئیں - ان کی پرتگال والوں سے لڑائیاں بھی ہوئیں اور ان کے کئی مقبوضات اور کوٹھیوں پر انھوں نے قبضہ بھی کر لیا -[1]

ڈچ کے بعد انگریزوں نے ہندوستان کا رخ کیا اور کپتان ہاکنس کا جہاز سنہ ۱۶۰۸ع میں بندر سورت کو پہنچا - سورت کے علاوہ ملیباری بندرگاہوں میں بھی انھوں نے کوٹھیاں قائم کیں - چنانچہ سنہ ۱۶۲۸ع میں مدراس سے ستر میل جنوب میں ایک کوٹھی قائم کی -[2]

انگریزوں کے بعد فرانسیسی آئے چنانچہ سنہ ۱۶۶۹ ع میں مچھلی بندر میں اپنی کوٹھی قائم کی - سنہ ۱۶۷۴ ع میں پانڈیچری میں ان کی کوٹھی قائم ہوئی [3]-

صفحات گذشتہ سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ اس زمانے میں ان سواحلی مقام پر عادل شاہوں و قطب شاہوں کی حکومت تھی اور ان یورپین اقوام نے انھیں حکومتوں سے تجارتی معاہدے کیے تھے -

آنے والے یورپین اقوام کا کلچر دکن کے کلچر سے بدلا ہوا تھا - انھوں نے دکن کے اسلامی کلچر سے کیا کیا امور اخذ کیے، اس کی صراحت ہمارے مضمون سے غیر متعلق ہے - مگر پتہ چلتا ہے کہ دکن میں ان اقوام کو ناپاک تصور کرتے تھے - ان کا کلچر ایک عرصے تک جدا گانہ رہا بلکہ یہ نظر آتا ہے کہ ان میں اکثر نے اس وقت کے مسلمانوں کی معاشرت اختیار کر لی تھی -

ان یورپین اصحاب کو مسلمانوں کی حکومتوں نے ملازم بھی رکھ لیا تھا - چنانچہ اس خصوصی مؤلف "تاریخ دکن" (عبدالغفور خان) نے جو صراحت کی ہے وہ حسب ذیل ہے -

---

۱- "تاریخ جنوبی ہند" محمود خاں صفحہ ۳۳۱

۲ و ۳- "تاریخ جنوبی ہند" صفحہ ۳۳۲ و ۳۳۴

"دکن میں انگریز ، فرانسیسی ، ڈچ اور پرتگالی چاروں بکثرت آئے ۔ فرداً فرداً تجارت بھی کرتے رہے اور مسلمان بادشاھوں کے دربار میں اور فوجوں میں نوکریاں بھی کرتے تھے ۔ اکثر انگریز ، فرانسیسی اور ڈچ مسلمان حکومتوں میں توپ خانوں میں گلنداز مقرر ھوا کرتے تھے ۔ ان کو مسلمان اس فن کا ماھر ، تجربہ کاراور واقف کار سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ ملاحی، ڈاکٹری باغبانی ، آھنگری وغیرہ کاموں پر بھی اھل یورپ یہاں نوکر رکھے جاتے تھے "۔۱

یہ امر خاص طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے کہ محکوم اصحاب کے کلچر کو حاکم اقوام قبول نہیں کرتے بلکہ حاکموں کے کلچر کی اکثر باتیں محکوم اختیار کر لیتے ھیں ۔ چنانچہ جب تک انگریزوں کی حکومت قائم نہیں ھوئی تھی اس وقت تک ان کے کلچر کا یہاں رواج نہیں ھوا تھا ۔ دکن میں خصوصیت سے اھل یورپ کو ناپاک تصور کرتے تھے ۔

جنوبی ھند کی ریاستوں میں انگریزی لباس یا معاشرت کو اختیار کرنا ایک عرصۂ دراز تک گناہ کبیرہ تصور ھوتا تھا ۔ حتیٰ کہ انگریزی تعلیم بھی مسلمان حاصل نہیں کرتے تھے خصوصاً علماء اور اصحاب علم کو اس سے سخت تنفر تھا ۔ چنانچہ ھمارے خاندان میں سنہ ۱۳۱۰ ھجری تک انگریزی معاشرت تو کیا انگریزی تعلیم بھی نہیں تھی ۔ جب سر سید احمد خاں نے علی گڑھ کالج قائم کیا تھا تو شمالی ھند کی طرح جنوبی ھند میں بھی اس کی سخت مخالفت ھوئی تھی ۔ سر سید احمد خاں کو نیچری اور کافر قرار دیا جاتا تھا ۔ ظاھر ہے جب یہ حالت ھو تو انگریزی معاشرت یا کلچر کو کس طرح قبول کر سکتے تھے ۔

۱۔ "تاریخ دکن" حصہ سوم عبدالغفور خاں صفحہ ۳۴۲

سلطنت آصفیہ میں جب مظفر جنگ کو فرانسیسی امداد سے مسند حکومت ملی تو ان مغربی اقوام نے اپنے کلچر کو مسلط کرنے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا تھا اس کی صراحت اس موقع پر نہایت غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔

واضح ہو کہ :

تاریخی واقعات کی آئے دن تحقیق ہوتی رہتی ہے۔ نئی نئی باتوں کا انکشاف ہو کر معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ سلطنت آصفیہ کی تاریخ کے متعلق اگرچہ تفصیلی معلومات کا بہت کچھ ذخیرہ شائع ہو چکا ہے مگر پھر بھی بیسیوں امور ایسے ہیں جو تاریکی میں ہیں اور محققین کی داد تحقیق کے لیے وسیع میدان رکھتے ہیں۔

اس موقع پر ہم ایک واقعے کی صراحت کرتے ہیں جو دکن کی مشہور تاریخوں مثلاً ”تـزکـ آصفیہ“، ”گلـزار آصفیـہ“، ”حدیقۃ العالم“ اور ”تاریخ دل افروز“ وغیرہ میں نہیں ہے البتہ ”تاریخ راحت افزا“ کے مؤلف نے صراحت سے بیان کیا ہے وہ یہ ہے :

نواب ناصر جنگ کی شہادت ۷۔ محرم سنہ ۱۱۶۴ ھجری کو ہوئی اور مظفر جنگ اسی دن مسند نشین ہو گئے۔ مگر صرف دو ماہ کے بعد ربیع الاول سنہ ۱۱۶۴ ھجری میں ان کا قتل ہوا اس عرصے میں ایک ماہ تک فرانسیسیوں کے صدر مقام پھول چڑی میں قیام رہا اور ایک ماہ حیدرآباد کی طرف آتے ہوئے سفر میں گزرا۔

اکثر بادشاھوں کی صبح کی دلچسپی کے مشاغل میں اکثر و بیشتر شکار داخل رہا ہے اور شام کی تفریح میں رقص و سرور۔ نغمہ و طرب کے لیے طوائفیں، قوال اور بھانڈ وغیرہ ہوتے تھے۔ جو ملازم ہوا کرتے ہر وقت تیار رہتے اور حکم پر فوراً حاضر ہو جاتے تھے۔ طوائفوں میں ھندو اور مسلمان دونوں شامل تھیں بعض طوائفیں تاریخ میں خاص شہرت رکھتی ہیں۔

جب نواب مظفر جنگ اپنے ماموں ناصر جنگ کے شہید ہو جانے

کے بعد مسند نشین ہو کر ایک ماہ تک فرانسیسیوں کے صدر مقام پھول چڑی میں فرانسیسی گورنر ڈوپلے کے مہمان بنے رہے تو میزبان نے مہمان کی دلچسپی اور تفریح کے لیے بڑی جدتیں کی تھیں جن کی صراحت ہمارے مضمون کا مقصد ہے ۔

دلچسپی کی ایک چیز ''آتش بازی'' تھی جو حسب بیان مولف ''راحت افزا'' بڑی حیرت انگیز تھی ۔ مولف نے یہاں تک مبالغہ کیا ہے کہ ایسی آتش بازی دنیا نے نہ دیکھی نہ بنائی ۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اس کی صراحت تو دشوار ہے البتہ مختصر یہ ہے کہ آتش بازی کے ساتھ مختلف مناظر پیش نظر ہو جاتے تھے ۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک آراستہ و پیراستہ باغ ہے ۔ رنگین محل ہے اور درخشاں قصر و ایوان ہے یا میدان جنگ ہے ۔ توپ ، بندوق ، بان چھوٹ رہے ہیں ، لڑائی ہو رہی ہے ، لوگ زخمی ہو رہے ہیں ، باغ و بہار کا سماں پیش ہوجاتا تھا ، گل و گلزار کا نقشہ سامنے آ جاتا تھا ، انار اور مہتاب قسم قسم کے تھے ۔ جو منظر اور سماں پیش ہوتا تھا وہ زمین سے ایک گز اونچا ہوتا تھا ۔ ایک اور آتش بازی کی قسم یہ تھی کہ ایک ''بندر'' بنایا گیا تھا جب اس کو روشن کیا جاتا تو وہ بندر لنکا پہنچ جاتا اور وہاں کے تمام مکانات اور گھروں کو آگ لگا دیتا ــ لنکا اور اس کے گھروں اور مکانوں کا منظر آتش بازی میں پیش کیا گیا تھا ۔ مولف '' راحت افزا'' کی وضاحت کے بموجب اس کے پہلے اور بعد کبھی ایسی آتش بازی نہ سنی گئی اور نہ دیکھی گئی تھی ۔

اس امر کا خیال رہے کہ مولف خود اس وقت اس معرکے میں اور اس جگہ موجود تھا اور اپنے چشم دید حالات لکھے ہیں ۔

گورنر ڈوپلے نے دوسری جدت یہ کی تھی کہ رقص و طرب اور عیش و نشاط کے لیے دیسی طوائفوں کی بجائے فرانسیسی ماہ جبینوں کو فراہم کیا تھا اور ان کو اس کثرت سے لایا گیا تھا کہ بہ قول مولف ''راحت افزا'' ۔

"پورے لشکر میں فرانسیسی فاحشہ عورتیں بھر گئی تھیں اور وہ بن سنور کر اور آراستہ ہو کر منظرِ عام پر جلوہ گر ہوتیں اور اپنے کرشمہ و ادا اور غمزہ و عشوہ سے لوگوں کے دلوں پر قبضہ کر کے ان کو شاد کام اور شربت وصل سے سیراب کرتی تھیں"۔

مولف نے بڑے افسوس اور رنج کے ساتھ اس امر کو بیان کیا ہے کہ :

"آصف جاہ کی مسند تک جہاں پانچ ہزاری منصب دار بھی بلا اجازت نہیں آ سکتے تھے، اب فرانسیسی ذکور و اناث کی عشرت گاہ بن گئی ہے ۔ شراب و ناب کے دور چلتے ہیں اور مہ جبینان پیرس ساقی گری کے فرائض انجام دیتی ہیں ۔"

تیسری جدت یورپین ڈانس (رقص) کی کی گئی تھی جو اہل دکن کے لیے ایک نئی چیز تھی ۔ کیوں کہ رقص طوائفوں کا کام تھا ۔ نہ کہ شریف عورتوں کا ۔ مولف "راحت افزا" نے اس کی تفصیل بھی بڑی حیرت کے ساتھ بیان کی ہے وہ لکھتا ہے کہ :

"ایک رات جلسۂ رقص کا تماشہ دیکھنے کے لیے مدعو کیا گیا عجیب رقص تھا جس کو آج تک کسی نے نہیں دیکھا تھا ۔ چوتھائی رات گزرنے پر فرانسیسی مرد اور عورتیں دونوں شراب پی کر خوب مست ہو گئے اور ایک مرد ایک عورت کو لے کر جوڑا جوڑا رقص کرنے لگے ۔ ایک تھک جاتا تو دوسرا اس کی جگہ لیتا اور رقص کرتے جاتے یہاں تک کہ گورنر اور اس کی بی بی تک نوبت پہنچ گئی پھر گورنر کی لڑکی جس کی عمر پندرہ سال کی ہو گی نہایت حسین و جمیل تھی اپنی ہم سن لڑکیوں کی جماعت کے ساتھ نکل کر رقص کرنے لگی ۔ غرض کہ غیرت اور حیا نہیں رہی تھی ۔ شرم و حجاب کو خواب میں بھی نہ دیکھا گیا ہو گا ۔ اسی طرح نصف شب گذر گئی ۔"

اس صراحت سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ رقص کی دو قسمیں

تھیں ایک تو جوڑے جوڑے مرد اور عورت مل کر رقص کرتے تھے اور دوسری قسم یہ تھی کہ صرف چند عورتیں رقص کر کے اپنے کمالات کا مظاہرہ کرتی تھیں ۔ یہ دونوں قسم کے رقص اب بھی یوروپین یا مغربی تہذیب و تمدن میں موجود ہیں ۔

آخرالذکر رقص کی جو خصوصیت تھی وہ زمانۂ ما بعد کے ایک دکنی سیاح یورپ یوسف خاں کی زبانی سننے کے قابل ہے۔ جس کاسفرنامہ ایک صدی پہلے شایع ہو چکا ہے اور اس کا نام ''عجائبیات فرنگ'' ہے ۔ اس نے پیرس کے تذکرے میں جو وضاحت کی ہے اس کا مختصر اقتباس پیش ہے :

''ایک رات ایک مقام پر جا کر سب مصروف تماشا ہوئے اور دو عورتیں کہ ناچنے اور گانے میں یکتائے زمانہ تھیں رقص و سماع میں مشغول ہوئیں ۔ ایسے ایسے کرتب دکھائے کہ سب سرور میں آئے مگر مجھ کو ایک امر ان کا پسند نہیں آیا ۔ وہ یہ کہ انھوں نے ناچتے وقت ایسا ریشمی کپڑا پہنا کہ تمام بدن خصوصاً مقیاتالشباب ان کا صاف نظر آتا تھا ناچتے ناچتے جب پاؤں اٹھاتیں گویا لوگوں کو اپنی شرم گاہ دکھاتیں ''

ڈوپلے نے ان دلچسپ مشاغل کی جو جدت کی تھی اس کا اثر ناگریز تھا۔ چنانچہ مظفر جنگ اس رنگ میں مبتلا ہو گیا اور اپنی عمر کا باقی ایک مہینا اسی ناچ رنگ میں بسر کیا ۔

بھول چڑی سے چند میل پر مظفر جنگ کا کیمپ تھا جہاں کئی روز تک جشن ہوتے رہے ۔ ان کے اخراجات کے لیے روپے کی ضرورت تھی چنانچہ ڈوپلے نے فوراً رقم فراہم کر دی ۔ یہ رقم کس طرح فراہم کی گئی اس کی وضاحت بھی مولف ''راحت افزا'' کی زبانی سنیے :

''مظفر جنگ کے پاس روپیہ نہیں تھا ۔ گورنر (ڈوپلے) نے ایک کروڑ روپیہ قرض دیا اور اس کی ادائی میں اکثر گراں قیمت جواہرات معمولی قیمت پر ڈوپلے کو دے دیے گئے اور باقی کے لیے ایک

تمسک لکھ دیا گیا اور ادائی اس رقم سے قرار پائی جو چنداصاحب والئی ارکاٹ سے سالانہ پیش کش ایک لاکھ مقرر ہوا تھا "۔

مگر چند ہفتے بعد ہی "آن قدح بشکست و آن ساقی نماند" کے مصداق مظفر جنگ ہی قتل ہو گئے ۔ لیکن ڈوپلے اور اس کے جنرل لوسی کا اثر مظفر جنگ کے جانشین صلابت جنگ پر بہ دستور رہا ۔ اس کی صراحت نفس مضمون سے غیر متعلق ہے ۔

واقعات مندرجہ بالا سے واضح ہو سکتا ہے کہ یوروپین اصحاب اپنے مقصد کی کامیابی کے لیے روپے کے علاوہ عورتوں سے بھی کام لیتے رہے ۔ یوروپین سیاست میں یہی دونوں چیزیں پیش پیش رہتی ہیں۔

جب انگریز حکمران ہو گئے تو رفتہ رفتہ دکن میں بھی انگریزی یا مغربی کلچر کو ترقی ہوتی گئی ۔ اس خصوص میں سلطنت آصفیہ میں مغربی کلچر کے آغاز کے متعلق کسی قدر صراحت سے روشنی ڈالی جاتی ہے ۔

جنوبی ہند میں انگریزوں کی حکومت سنہ ۱۸۰۰ع میں بہت زیادہ مستحکم ہوگئی تھی ۔ حیدرآباد میں نہ صرف انگریز ریذیڈنٹ مقیم ہوگیا تھا بلکہ فوجی چھاؤنی بھی قائم کرکے اپنا تسلط قائم کر لیا تھا ۔ حکومت آصفیہ کی نہ صرف بیرونی آزادی سلب ہوگئی تھی بلکہ اندرونی امور میں بھی نظام کو ہر طرح مجبور کر دیا گیا تھا ۔ اس کے علاوہ بادشاہان وقت کو امور ریاست سے دلچسپی نہیں رہی تھی ۔ رشوت خوار ، خود غرض ، ذاتی مفاد پرست امراء اور عہدہ داروں کی کثرت تھی ۔ جو چند خیر خواہ وفادار امیر اور عہدے دار موجود تھے وہ بے دست و پا تھے۔ ان وجوہ سے حکومت کا انحطاط شروع ہوگیا تھا اور زوال کے آثار پیدا ہوگئے تھے ۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ حکومت آصفیہ کے ایک صوبے دار (والا جاہ ارکاٹ) کو انگلستان کے بادشاہ اپنا دوست تحریر کرتے تھے اور آصف جاہ ثانی کو ریذیڈنٹ نذر پیش کرتا تھا اور خطاب کا حاصل کرنا موجب فخر

تصور کرتا تھا ۔ اس کے صرف چند سال کے بعد وہ زمانہ آگیا جب کہ حکومت آصفیہ باج گذار سلطنت بن گئی ۔ بہر حال انگریزوں کو پورا غلبہ حاصل ہوگیا تھا ۔ بیرونی تعلقات تو منقطع ہو ہی چکے تھے اور اب ساتھ ساتھ اندرونی مداخلت بھی شروع ہوگئی ۔ اس کی مختلف صورتیں ہوئیں ۔ مثلاً ریاست کے متوطن عربوں اور روھیلوں کو ملک سے خارج کرنے کا انتظام ، ان کے آنے پر سخت ترین قوانین کا نفاذ ، سلطنت کی فوج کی کمی کرنا ، انتظام ملک کے لیے سلطنت کے بعض حصوں کو کمپنی کی عمل داری میں شامل کر لینا اور کروڑ گیری کے محصول کے اصول پر پابندی وغیرہ غرض کہ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے ۔ ''تاریخ آزادی ہند'' حیدرآباد کی جد و جہد کی جو کتابیں شایع ہوئی ہیں ان سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ (۱۸۰۰ع) کے بعد سلطنت آصفیہ کی حالت کیا سے کیا ہوگئی تھی ۔

لیکن اس کے باوجود کہا جاسکتا ہے کہ سنہ ۱۸۵۷ع تک حیدرآباد میں انگریزی معاشرت اور تہذیب و تمدن کا وہ دور دورہ نہیں ہوا تھا جو سنہ ۱۸۵۷ع کے بعد ہوا کیونکہ سنہ ۱۸۵۷ع کے پہلے ریذیڈنٹ مشرقی تہذیب کے حامل نظر آتے تھے ان کے رہنے سہنے کھانے پینے اور پہنے اوڑھنے میں مشرقی تہذیب و تمدن کی جھلک نظر آتی ہے ۔ وہ حقا پیتے تھے ، پان کھاتے تھے ، مشرقی کھانوں سے دلچسپی تھی ، مشرقی طرز کے آداب اختیار کرتے تھے اور رقص و سرور کے دل دادہ بھی تھے ۔ بٹیر بازی اور مرغ بازی کا شوق پیدا ہوگیا تو ان کی خانگی زندگی یہاں کی بعض عورتوں کی وجہ سے بڑی حد تک مشرقی ہوگئی تھی ۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۳۰ع (۱۲۴۵ ھجری) کے بعد مغربی تمدن اور تہذیب کی جھلک حیدآباد میں چمکنے لگی[۱] ۔ اور بالاخر سنہ ۱۸۵۷ع کے بعد

۱- تاریخ رشید الدین خان ۔

پوری طرح انگریزی تمدن اور تہذیب عام طور سے اعلیٰ اور اوسط میں رونما ہونے لگی ۔ اس کی بڑی وجہ تو خود انگریزی حکومت کا غلبہ ہے ، لیکن جو دوسرے وجوہ اس کے ممد و معاون ہوئے ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں :

(۱) رفیع الدین خان[1] یعنی نواب فخرالدین خان شمس الامرا امیر پائگاہ کے بڑے فرزند بیماری سے صحت یاب ہونے پر ڈاکٹروں کی رائے سے تبدیل آب و ہوا کے لیے سنہ ۱۸۳۰ع میں کلکتہ تشریف لے گئے اس زمانے میں کلکتہ گورنر جنرل کا مستقر تھا ۔ یعنی ہندوستان کی انگریزی حکومت کا دارالسلطنت تھا ۔ یہاں انگریزوں کی بڑی آبادی تھی اور روز بروز اس میں اضافہ ہو رہا تھا ۔ تجارت کو فروغ ہو رہا تھا ۔ تعلیم میں وسعت ہونے لگی اس کے ساتھ ساتھ یوروپین تہذیب اور تمدن کا اثر بڑھنے لگا تھا ۔ نواب رفیع الدین خان مچھلی بندر سے پورے ایک جہاز کو اپنے لیے مخصوص کرکے کلکتہ تشریف لے گئے تھے ۔ ان کے ہمراہ ہر طبقے کے بیسیوں اشخاص تھے ۔ مصاحب بھی تھے ۔ اور ملازم بھی اور ان میں بھی ہر پیشہ کے لوگ شامل تھے ۔ کلکتہ میں آپ کا قیام ایک سال رہا ۔ انگریزوں کے اعلیٰ طبقے میں نشست برخاست رہی ۔ دعوتیں ہوئیں اور دعوتیں دی گئیں ۔ چونکہ نواب فخرالدین خان شمس الامرا بقید حیات تھے اپنے بڑے فرزند کے آرام و آسایش کا ان کو بڑا خیال تھا ۔ اس لیے لاکھوں روپیے خرچ ہوتے تھے ۔ اس طرح انگریزوں کے تمدن اور تہذیب کو قریب سے دیکھنے کا پورا موقع حاصل ہوا ۔ جب حیدرآباد واپس آئے تو انگریزی تہذیب اور تمدن کی بہت ساری باتیں حیدآباد میں آ گئیں ۔

۱۔ تاریخ رشید الدین خان۔

(۲) دوسری وجه یه ہے که نواب مختارالملک[۱] سنه ۱۸۷۶ع میں یورپ تشریف لے گئے آپ کے ساتھ بھی بیسیوں اصحاب تھے۔ نواب مختار الملک کے بعد حیدرآباد کے کئی دوسرے امیر سر آسماں جاہ ، وقار الامراء اقبال الدوله ، ظفر جنگ ، مختار الملک ثانی وغیرہ مختلف اوقات میں یورپ اور انگلستان گئے اور یه امیر کبھی تنہا نہیں گئے بلکه اپنے ہم راہ بیسیوں افراد کو لے گئے تھے اور ہفتوں وہاں قیام کیا اعلیٰ سوسائٹی میں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے رہے ۔ ان اصحاب کے یورپ میں قیام کے متعلق بہت سی باتیں لکھی جاسکتی ہیں مگر طوالت کے خوف سے ہم صرف ایک دو واقعوں پر اکتفا کرتے ہیں ۔ نواب مختار الملک کو لندن کی بلدیے نے شہریت کا اعزاز پیش کیا تھا ۔ جو اس وقت تک کسی ہندوستانی کو نہیں دیا گیا تھا ۔ سر وقارالامراء (اقبال الدوله) جس وقت ایڈورڈ ہفتم ملکه وکٹوریه کے ولی عہد (پرنس آف ویلز) سے ملے تھے ۔ انھوں نے نواب سر وقار الامرا کے قمیض کی گھنڈیوں کو جو سچے موتیوں سے بنائی گئی تھی بڑی تعریف کی نواب صاحب نے اپنی قیام گاہ پر آکر ان گھنڈیوں کو تحفے کے طور پر ارسال کردیا ۔ ایک دوسرا واقعه یه ہے که جس زمانے میں نواب صاحب انگلستان میں مقیم تھے عیدالاضحیٰ آ گئی ''قربانی'' کرنا ضروری تھا مگر وہاں کی بلدیے کے قانون کے به موجب زمین پر بکرے کا خون بہایا نہیں جاسکتا تھا ۔ اس لیے نواب صاحب نے حکم دیا که ہوٹل کے کمرے سے فرنیچر اٹھا دیا جائے اور قالین پر بکرے ذبح کیے جائیں اور قالین دریائے ٹمز میں بہا دئے جائیں ۔ چنانچه ایسا ہی کیا گیا ۔ قالین کی قیمت مالک کو ادا کردی گئی تھی یورپ میں داد و دہش اور اعزاز کے متعلق کئی باتوں کا اظہارکیا جاسکتا

۱- مرقع عبرت

ہے مگر طوالت کے مدنظر ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے ۔

(۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ فوج باقاعدہ میں انگریز افسر مامور کیے گئے اور فوج باقاعدہ کے کمانڈر انچیف نواب افسر الملک یوروپین تہذیب میں رنگے ہوئے تھے ۔ اس لیے فوج کے تمام افسر گویا یوروپین تہذیب کے خوگر ہوگئے تھے ۔

(۴) چوتھی وجہ یہ ہے کہ شمالی ہند خصوصاً علی گڑھ کے تعلیم یافتہ اصحاب یہاں مامور ہونے لگے تو انگریزی کلچر کو جلد پھیلنے کا موقع مل گیا ۔ سرسید کی یہ خواہش تھی کہ یوروپین تہذیب کا اثر ہو اور وہ نہ صرف تعلیم پا کر اپنے ملک کے دوسرے گروہ سے پیچھے نہ رہیں بلکہ معاشرت میں یوروپین طرز اختیار کرلیں اس کا پرچار حیدرآباد میں بھی ہونے لگا ۔

(۵) ایک اور وجہ یہ ہے کہ سنہ ۱۸۷۹ع سے حیدرآبادی طلبا تعلیم کے لیے انگلستان جانے لگے ان کی واپسی پر ان کے گھر بلکہ خاندان پر یوروپین تہذیب کا اثر ہو جاتا تھا ۔ بہرحال یہ تمام وجوہ ہیں جن کے باعث یوروپین تہذیب اور تمدن حیدرآباد میں پھیلنے لگا اور مغلائی اور مشرقی کلچر میں یوروپین کلچر ضم ہو کر ایک نیا کلچر بن گیا ۔ بہ الفاظ دگر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حیدرآباد کے ”دکنی کلچر“ کو وسعت ہوگئی اور اس میں مشرقی طرز کے ساتھ انداز مغربی کی آمیزش ہو کر ایک جدا گانہ کلچر بن گیا جو مختلف کلچروں کا سنگم تھا ۔

مغربی کلچر کا جو اثر لباس ، کھانے پینے ، رہنے سہنے اور دوسرے امور میں رونما ہوا اس کی تفصیل آیندہ صفحات میں کی جائے گی ۔ کیونکہ اس عنوان کے تحت دوسرے ابواب میں صراحت سے روشنی ڈالی گئی ہے ۔

چوتھا باب

زبان اور ادب

کلچر میں سب سے پہلے زبان اور پھر ادب کی صراحت ضروری ہے ۔ واضح ہوکہ دکن کے مختلف حصوں میں مختلف زبانیں مروج رہیں اور اب بھی بیسیوں زبانیں رائج ہیں ۔ ان میں مراٹھی ، تلنگی ، کنڑی ، تامل وغیرہ یہاں کی ملکی زبانیں ہیں ان کے علاوہ مسلمانوں کی وجہ سے عربی ، فارسی ، ترکی اور پھر دکھنی یا اردو کا دور دورہ ہوا ۔

مرہٹی ، تلنگی ، کنٹری ، تامل زبانوں میں مسلمانوں کی زبان کی آمیزش ہونے کے علاوہ دکھنی زبان کا بن جانا خود ''دکنی کلچر'' کا ایک درخشاں باب ہے ۔ مولانا عبد الحق مرحوم نے ایک مستقل کتاب میں فارسی کے اثر کو واضح کیا ہے ۔ تلنگی اور کنٹری پر ریسرچ کی جائے تو واضح ہوسکتا ہے کہ ان زبانوں میں فارسی کے کس قدر الفاظ شامل ہوتے ہیں ۔

چونکہ ہمارا موضوع دکن کے مسلمانوں کا کلچر ہے ، اس لیے یہاں کی زبان کے متعلق تفصیلی وضاحت کرنے کے بجائے صرف مسلمانوں کی خاص زبان پر بحث کرنا ہمارا اصلی موضوع ہوگا ۔

جن مسلمانوں نے سواحل ہند پر قدم رکھا وہ عرب تھے ۔ ان کی زبان عربی تھی وہ صاحب علم و فن تھے ۔ وہ عربی میں اپنی تصانیف کو مرتب کرتے رہے ۔ اس وقت ایسا کوئی مواد نہیں ہے جس سے یہ واضح کیا جائے کہ ان کی عربی تصانیف کیا کیا تھیں ۔ ان کی عربی تصانیف کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ صرف ایک خاندان نے دو سو سالہ عرصے میں دو سو سے زیادہ عربی کتابیں

تصنیف کی ہیں ۱ ۔ مولانا ملا علی مہائمی نے تفسیر قران ''تفسیررحمانی'' کے نام سے عربی میں لکھی تھی ۔

دکن میں عربوں کے بعد ایرانی ، افغانی ، ترکی اور حبشی اصحاب آئے ۔ ان کی زبان فارسی ، ترکی اور عربی تھی ۔ دکن میں مسلمانوں کی جو نسلیں دکن فتح ہونے کے بعد ہوئیں ان کی زبان عموماً فارسی تھی اس لیے عربی کے بعد فارسی کا زیادہ سے زیادہ رواج ہوگیا ۔ دکن کی مسلمان ریاستوں میں سے اکثر کی سرکاری زبان فارسی تھی ۔ چونکہ ایران اور عراق سے بہت زیادہ اصحاب علم و فن دکن آئے اور ایران کی صفوی حکومت کو دکن کے فرماں رواؤں سے زیادہ اتحاد رہااس لیے ان تمام وجوہ سے دکن میں فارسی کا دور دورہ ایک عرصۂ دراز تک رہا ۔ پھر اس کے بعد دکھنی یا اردو کا رواج ہوگیا ۔

اگر دکن کی سب سے بڑی اسلامی ریاست بہمنی پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ فارسی زبان کو ان کے زمانے میں بڑی ترقی ہوئی ۔ کئی نامور شاعر اور ادیب دکن کی سرزمین میں فارسی کو فروغ دیتے رہے ۔ خود بادشاہوں نے بھی اس کی سرپرستی کر کے فارسی ادب کو لالہ زار بنا دیا ۔ واضح ہو کہ محمد تغلق کے دور میں ہی دکن کی خود مختار سلطنت بہمنی قائم ہوگئی تھی ۔ چونکہ اس سلطنت کا بانی حسن ایرانی النسل تھا ، بقول بعض بہمنی بن اسفندیار۲ کی اولاد میں تھا اس لیے اس نے اپنی سلطنت کی سرکاری زبان فارسی قرار دی جس کی وجہ سے فارسی کا رواج زیادہ سے زیادہ ہونے لگا ۔

سلاطین بہمنی سے کئی بادشاہ صاحب علم و فن تھے، خصوصاً

۱۔ خاندان مولانا محمد غوث شرف‌الملک ۔

۲۔ ''تذکرہ سلاطین دکن'' جلد اول ۔

فیروز شاہ بہمنی اعلیٰ قابلیت رکھتا تھا ۔ وہ فارسی کا زبردست عالم اور باکمال شاعر تھا ۔ اولا عروجی اس کا تخلص تھا ، جب بادشاہ ہوا تو فیروز تخلص کر لیا ۔ اس کا کلام اپنی رنگینی اور فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے مشہور ہے ، ایک غزل ملاحظہ ہو :

کرشمہ جنبش آموز است مژگان درازش را
ستم کرد است واجب ہر زبان تعلیم نازش را
محبت چاک بر دل می زند ہر گاہ در بزمے
بخود مخصوص می بینم تغافل ہاے نازش را
مباد آسیب نقصان باید از سوز دلم بارے
بدل چون رہ دھم اندیشۂ زلف درازش را
نہ باید لذتی زاھد ز وصلت از متاع خلد
ھمان بہتر کہ در دامن کشد اجر نمازش را
عروجی قامت و رخسار آن خورشید تابان را
بہ سرو و لالہ می سنجد بہ مبیند امتیازش را [1]

بہمنی دور میں ایران سے کئی علما و شعرا دکن میں آئے۔ ان میں سے علامہ تفتازانی ، محمود گازروانی ، حسن گیلانی ، ملا عبد الغنی ، شیخ آذری ، مولانا سلامت اللہ اوحدی ، عبد الکریم ہمدانی ، خواجہ محمود گاواں اور ملا نظیری وغیرہ مشہور ہیں ۔ ان کی وجہ سے دکن میں بھی فارسی کی زیادہ اشاعت ہوئی ۔

سلطان محمود شاہ بہمنی نے خواجہ حافظ شیرازی کو دکن آنے کی دعوت دی ۔ وہ ساحل سمندر تک آکر واپس ہو گئے اور میر فیض اللہ انجو کو ایک غزل لکھ بھیجی ۔
جس کا مطلع اور شعر یہ ہے :[2]

۱۔ ''کلام الملوک'' مطبوعہ ۔
۲۔ ''تاریخ فرشتہ'' ۔

دمے باغم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد
بمے بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد
چو حافظ در قناعت کوش و از دنیائے دون بگذر
کہ یکجو منت دونان جہاں یکسر نمی ارزد

خواجہ حافظ کی طرح مولانا جامی کے تعلقات بھی بہمنی خاندان کے مشہور وزیر محمود گاواں سے تھے ۔ محمود گاواں وہی شخص ہے جس کی یونیورسٹی کے کھنڈر آج بھی بیدر میں باقی ہیں۔ محمود گاواں اور مولانا جامی کی خط و کتابت ہوتی تھی دونوں کے خطوط کا مجموعہ کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے ۔

بہمنی سلطنت کا شیرازۂ حکومت منتشر ہونے پر جو پانچ حکومتیں قائم ہوئیں ان میں قطب شاہی سلطنت آندھرا دیش کی خود مختار اور مہتم با الشان حکومت تھی ۔ قطب الملک ایران کا باشندہ تھا ۔ فارسی زبان اس کی مادری زبان تھی ۔ قطب شاہی دور میں بیسیوں اصحاب علم و فضل ایران سے گولکنڈہ آئے ، ان میں سے بعض اعلیٰ عہدوں پر سرفراز ہوئے ۔ بیسیوں نے علم و فضل کا شہرہ بلند کیا ۔ ان میں سے جالینوس زمانہ قاسم بیگ شیرازی ، علامہ میر محمد مومن جو علامہ فخر الدین سماکی کے بھتیجے تھے ، قاضی محمد سیستانی ، میرک معین الدین شیرازی ، مرزا محمد امین شہر ستانی اس نے خمسۂ نظامی کے جواب میں چار مثنویاں لکھیں سید کمال الدین مازندرانی ، سید محمد سفراتینی ، علامہ تقائی ، مرزا فیض اللہ شیرازی المتخلص بہ برہان آپ نے ”برہان قاطع“ جیسی لغت مرتب کی جو ایران میں بھی مشہور ہے ۔ یہ لغت گولکنڈہ میں تصنیف ہوئی اور سلطان عبد اللہ قطب شاہ کے نام پر معنون ہے ، اور مرزا نظام الدین احمد شیرازی آپ نے ”حدیقۃ السلاطین“ لکھی قابل تذکرہ ہیں ۔

سلاطین قطب شاہی میں سے کئی بادشاہ فارسی کے شاعر تھے

چنانچہ جمشید قطب شاہ ، سلطان محمد قلی قطب شاہ اور سلطان محمد قطب شاہ فارسی کے بلند مرتبہ شاعر شمار کیے جاتے ھیں ۔ سلطان محمد قطب شاہ کا تخلص ظل اللہ تھا ۔ جمشید قطب شاہ ، محمد قلی قطب شاہ ظل اللہاور محمد قطب شاہ کا کلام پیش ھے ۔

جمشید قطب شاہ

بے لب لعل بتاں بادہ حرام است مرا
لب میگون بہ نما چوں سر جام است مرا
بر سر کاکل تو مرغ دلم شد در قید
خال تو دانہ و آں زلف چو دام است مرا
با سر زلف سیاہ تو مرا سودا است
ایں چہ سوداست کہ با زلف چو شام است مرا
ھر زبان از پئے دیدار تو آیم بدست
بر سر کوئے بلائے تو مقام است مرا
ترک ایں کار نخواھم من بیدل کردن
من کہ جمشیدم و ایں کار تمام است مرا

سلطان محمد قلی قطب شاہ

با شمع مگو گرمئی دیوانۂ خود را
کاتش زند از رشک تو پروانۂ خود را
ھوش و خرد از پائے در افتند چو مستان
چوں سرمہ کشی نرگس مستانۂ خود را
مستان محبت بہ دو عالم نہ فروشند
کیفیت تہہ جرعۂ همسانۂ خود را
با یاد تو عاشق نہ کشد منت خورشید
بستیم در و روزنۂ خانۂ خود را

گر جمله جهان پر شود از گوهر یکتا
خواهیم همان گوهر یک دانهٔ خود را
دل در غم او یافته صد جنت پنهان
چون عذر بخواهم غم جانانهٔ خود را
اے قطبشه آخر ره مردان ره عشق است
مردانه همی راه رو مردانهٔ خود را

دیگر

ساقی بیا زباده که فصل بهار شد
صحن چمن ز آب و هوا لاله زار شد
ما افتند شرب مدام تو کرده ایم
پر کن پیاله که زمان خمار شد
چشم فلک زرشک مقیمان بزم تو
چون دیدهٔ صراحی مے اشکبار شد
هر جرعهٔ ز زهر غضب نوش کرده ام
از دست آن نگار مرا ساز کار شد
کر دیم از رقیب نهان راز دل چو سود
زان یک نگاه راز مرا آشکار شد
اکنون کند کناره زمن ناصحا چو دید
کین صید دل به دست غم او شکار شد
بر وعدهٔ وصال دلش خوش کن اے حبیب
چون قطبشه زهجر رخت بے قرار شد

محمد قطب شاه ظل الله

از التفات دلبر عالی مقام ما
گردون زد است سکهٔ دولت بنام ما

۱- کذا

شام و صباح ماست چو شام و صباح عید
بر یاد دوست چون گذرد صبح و شام ما
شد پائمال شادیٔ وصلت غم فراق
دوران چه خوش کشید ز هجر انتقام ما
در شرع عشق نیست روا غیر یاد دوست
زاهد تو غافلی زحلال و حرام ما
ترسم زرشک تازه خورم نشترے دگر
قاصد بگوش یار چو گوئی پیام ما
آن خوش سخن که وصف قد یار خویش کرد
مسکین نه دیده سرو صنوبر خرام ما
ظل الله احترام چو از دوست یافتیم
زان خلق عالم اند پئے احترام ما

دیگر

لاله رویان زغم دهر نجاتم دارند
وز شراب لب خود آب حیاتم دارند
نشهٔ باده ز آتش به لبم افشاند
وز طرب خانهٔ دل نقل صفاتم دارند
ظلمت سینهٔ شد محو به تاثیر صفا
گل ز گلزار فروغ حسناتم دارند
تا بدل گشت ز علوی صفت سفلیٔ من
قدسیان مژدهٔ فیض درجاتم دارند
تلخ کامیم شده دور که شیرین و نهان
از شکر ریزیٔ لب طرفه نباتم دارند
کان لعل و گهر و زر به تصرف داریم
تابه گنج از پئے تقدیر براتم دارند

بر ریاض سخن آں ظل الٰہی کہ زغیب
عندلیبان ہمہ رنگیں نغماتم دارند[1]

بہمنی حکومت کی طرح قطب شاہی دربار کی زبان بھی فارسی تھی ۔ حکومت کی زبان فارسی ہونے کے باعث تلنگانہ کے برھمن بھی فارسی سیکھنے لگے اور اپنی فارسی قابلیت کا لوھا منوا لیا تھا ۔ چنانچہ ابوالحسن تانا شاہ کے زمانے میں عالمگیر کے پاس سے ایک فرمان سفید روشنائی سے لکھا ھوا آیا اس کو بجز مادنا دیوان کے کسی نے نہیں پڑھا ۔ قطب شاھی دور کے کئی ھندو فارسی کے ماھر تھے اور اعلیٰ مراتب پر فائز تھے جس کا تذکرہ اس مختصر مضمون میں نہیں کیا جا سکتا ۔

دکن میں مغلیہ حکومت کے بعد آصفی دور شروع ھوا اور اس حکومت کے سوا دو سو سال کے زمانے میں تقریباً ڈیڑھ سو سال تک حکومت کی سرکاری زبان فارسی رھی جس کی وجہ سے سینکڑوں ھندو اصحاب فارسی کے بلند پایہ انشاء پرداز، نازک خیال شاعر اور دقیقہ سنج محقق پیدا ھوئے ھیں ۔

آصف جاہ اول اور آپ کے فرزند ناصر جنگ فارسی کے بلند مرتبہ شاعر تھے دیوان موجود ھیں آصف جاہ کا تخلص آصف اور شاکر تھا ۔ ناصر جنگ ناصر تخلص کرتے تھے ۔ آصف جاہ سابع میر عثمان علی خاں نے بھی فارسی میں شاعری کی ھے ۔ آصف اور عثمان کی ایک ایک غزل ملاحظہ ھو :

آصف

اشتیاق دیدن آن بے وفا داریم ما
گو کدورت در دلش باشد صفا داریم ما

۱۔ ''کلام الملوک''مطبوعہ ۔

از پناه دیگران باشد پناه ما توی
هر کس این جا گر کسے دارد خدا داریم ما
از یکی ده می شود نقدی که کس رامے دهیم
درمیان کیسهٔ خود کیمیا داریم ما
توتیائی در ضیا بخشی از این بہتر کجا است
در فضائے چشم خود آن خاک پا داریم ما
سرکشی[1] ها روزیٔ دنیا پرستان او دهد ۔
در دل خود شیوه تسلیم و رضا داریم ما
از تصور کردن روی چمن پیرای او
در نظر آصف چه باغ دل کشا داریم ما[2]

عثمان

کردی که از سجود درت بر جبین ما است
سرمایهٔ سعادت دنیا و دین مالست
آن نور عشق در دل ماهست کا فتاب
هر صبح روشن از نفس آتشین ما است
تاخاک آستانهٔ آن ماهوش شدیم
روی نیاز اهل وفا بر زمین ما است
فصل بہار ختم شده در چمن صبا
پا در رکاب چون نفس واپسین ما است
عثمان ز در فشانی چشمان تر مپرس
این گنج بے بہا است که در آستین ما است

آصفی امراء سلطنت میں مسلمانوں کے علاوہ کئی هندو اصحاب فارسی کی اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے ۔ مثلاً راجا مہپت رام ۔ راجا

۱۔ کذا

۲۔ کلام الملوک ۔

چند و لال ۔ مہاراجا کشن پرشاد ، شفیق اور ان کے والد منسا رام وغیرہ۔

قطب شاہی دور میں فارسی کی جو ترقی ہوئی اور جو کتابیں فارسی میں تصنیف ہوئیں اس کی صراحت کرنے کے لیے ایک علیحدہ مقالے کی ضرورت ہے ۔ بیسیوں شعرا نے فارسی میں کلیات اور دیوان مرتب کیے بیسیوں مورخوں نے تاریخ کی کتابیں لکھیں ۔ کئی اصحاب علم اور علما فضلا نے تفسیرین ، حدثیں ، فلسفہ ، ریاضی ، مناظرہ ، کلام ، اخلاق اور تصوف و ادب کی جو کتابیں لکھی ہیں وہ اب بھی دستیاب ہوتی ہیں اور ان سے واضح ہوتا ہے کہ ان اصحاب نے فارسی زبان کی کیسی بیش بہا خدمت فرمائی تھی ۔

علامہ میر محمد مومن استر آبادی جو علامہ فخرالدین سماکی کے بھتیجے تھے وہ گولکنڈہ آئے انھوں نے کئی فارسی کتابیں لکھیں آپ شاعر بھی تھے ۔ دیوان مرتب کیا تھا ۔ مرزا محمد امین ایک دوسرا امیر تھا ۔ جو سیستان سے آیا تھا اس نے ''خمسۂ نظامی'' کے جواب میں چار مثنویاں لکھی ہیں یعنی ''شرین خسرو'' ''لیلیٰ مجنوں'' ''فلک السروج'' اور ''مطمع الاشعار''۔ اس نے دیوان بھی مرتب کیا تھا جس میں غزلیات اور قصائد تھے ۔ محمد قلی قطب شاہ کے بعد جب محمد قطب شاہ بادشاہ ہوا تو یہ بھی صاحب علم و فضل تھا اس کے دربار میں ہمیشہ اہل علم و کمال جمع رہتے ۔ گویا دربار ایک علمی مرکز تھا جہاں صاحب علم اپنے علم و فن کے مظاہرے کرتے تھے ۔ قطب شاہی دور کی مشہور ''تاریخ قطب شاہی'' اس کے عہد میں لکھی گئی ۔ محمد قطب شاہ کو تاریخ سے بڑی دلچسپی تھی اور شعر و شاعری میں پوری مہارت رکھتا تھا ۔ اس کے بعد اس کا فرزند سلطان عبداللہ مسند گولکنڈہ پر متمکن ہوا ۔ اس کو اپنے باپ دادا کی طرح اصحاب علم اور علما کی سرپرستی سے دلچسپی تھی ۔ اس کے عہد میں بیسیوں کتابیں لکھی گئی ہیں ۔ چنانچہ

نظام الدین احمد ساعدی نے ''حدیقۃالسلاطین'' جیسی تاریخ تصنیف کی ہے ۔ میرمحمد الدین جو علامہ میر مومن کے فرزند تھے فارسی کے زبردست شاعر تھے ۔ میر سید محمد استرادی نے کئی کتابیں لکھیں ۔ مولانا رونق صاحب علم و فضل ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھے۔ حکیم عبد الجبارگیلانی ، شیخ عبدالطیف ، ملا خلقی ، حکیم نوراللہ مرزا محمد جوہر تبریزی ، مرزا محمد حمزہ استرآبادی ۔ مرزا فضل‌اللہ شیرازی، ملا تقناتی شیرازی۔ مرزا محمد مشہدی ، قاضی عطااللہ گیلانی اور قیصری جیسے علما دربار میں جمع تھے۔ شمس‌الدین المعروف علامہ ابن خاتون نے کتاب ''ارشاد'' اور ''جامع عباسی'' پر حواشی لکھے اور ''اربعین'' کا فارسی میں ترجمہ کیا ، ملا جمال‌الدین نے ''کتاب المصباح،'' ملا علی ابن طیفور نے ''عیوان اخبار'' کا فارسی میں ترجمہ کیا، مولانا حسین آملی نے ''نہج البلاغت'' کی شرح لکھی اور ملا فتح‌اللہ نے امام یافعی کی کتاب ''روغن‌الریاحین'' کا ترجمہ کیا ۔

''برہان قاطع'' جیسا لغت جس کو اہل ایران بھی تسلیم کرتے ہیں اس کے زمانے میں لکھی گئی اور اس کے نام پر معنون ہوئی ۔ قطب شاہی دور کے فارسی گو شعرا کی فہرست طویل سے طویل تر ہے ۔ اس لیے یہاں نظر انداز کیا جاتا ہے ۔ جو اردو گو شعرا تھے ان میں سے بعض فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے ۔ چنانچہ قطب‌شاہی دور کا مشہور دکنی شاعر اور نثر نگار ملا وجہی جس کا نام اسداللہ تھا اور خراسان سے اس کا باپ گولکنڈہ آیا تھا ۔ فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتا تھا ۔ چنانچہ اس کا فارسی دیوان کتب خانۂ سالار جنگ کی زینت ہے ۔

قطب شاہی سلطنت کے بعد عادل شاہی حکومت کی فارسی کی جانب توجہ کی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اس سلطنت کا بانی یعنی یوسف عادل شاہ فارسی کا زبردست شاعر تھا اس کے فرزند اسماعیل کی قابلیت اور فارسی اور ترکی سے شغف کے متعلق مولف

''بساتین السلاطین'' لکھتا ہے ۔

''در فن موسیقی موشگافی بسرود هندی کمتر دل دادے ترکی و فارسی بفصاحت تمام گفتے و هر گز زبان خود را بدون ضرورت به زبان هندی آشنا نمی ساخت''[۱] ۔

خود اسماعیل اپنی فارسی اور ترکی زبان دانی کے متعلق حسب ذیل صراحت کرتا ہے ۔

''چونکہ میرے والد نے میرا اتالیق آنا کو مقرر کیا تھا اور وہ زبان هندی کو پسند نہیں کرتا تھا ۔ جو کچھ هندی میں سنا مجھ کو ترکی اور فارسی میں کہتا تھا اس لیے مجھے هندی سے رغبت نہیں ہوئی''[۲] ۔

ابراهیم عادل شاہ اول اور علی عادل شاہ اول کے زمانے میں بھی فارسی کی ترقی ہوئی ایران کے اصحاب علم و فضل اس کے مصاحب تھے ۔ ملا فتح‌الله شیرازی اور سلطان کا وزیر افضل خان شیرازی دونوں صاحب علم و فضل تھے ان کے گھروں میں علمی جلسے روز ہوا کرتے تھے ۔ ملا رضا مشہدی دربار کا مشہور شاعر تھا۔

علی عادل شاہ اول کے بعد ابراهیم عادل شاہ اول پھر ابراهیم عادل شاہ ثانی اور پھر علی عادل شاہ ثانی کے زمانے میں هندی کے ساتھ ساتھ فارسی کی بھی ترقی ہوئی۔ ''تاریخ فرشتہ مجلسی'' ابراهیم کے زمانے میں مرتب ہوئی ۔ یہ فتوحات عادل شاهیہ کی مشہور تاریخ ہے ۔

نورالدین ظہوری اور اس کے فرزند محمد ظہور کے علمی کارنامے

۱۔ مخطوطہ برٹش میوزیم صفحہ ۱۶ ۔

۲۔ ''فتوحات عادل شاهی'' مخطوطہ برٹش میوزیم صفحہ ۴۹ ۔ نمبر (۲۷۲۵۱) یہ مخطوطہ ارکاٹ کے والا جاہ کے کتب خانے کا اصلی نسخہ ہے ۔

بیجا پور کی عادل شاہی حکومت کی فارسی نوازی کے بین ثبوت ہیں ۔

ابراهیم کے درباری شعراء میں ظہوری ، ملک قمی ، حکیم آتشی ، مرزا مقیم ، ملا شکیبی ۔ عبدالقادر نواسی وغیرہ قابل تذکرہ ہیں ملک قمی نے ''مخزن اسرار'' نظامی کے جواب میں لکھی ۔ عبدالرشید البیکتین نے علاءالدین محمد ذکریا کی کتاب ''عجائب المخلوقات'' کا فارسی میں ترجمہ کیا ۔ ملا رفیع‌الدین شیرازی نے ''روضةالصفا'' کا خلاصہ کیا ہے[1] ۔

نواب میر قمرالدین خان آصف جاہ اول نے نواب انورالدین خان کو اپنے تخت ارکاٹ کا صوبے دار مقرر کیا تھا ۔ انورالدین خان اور اُن کے فرزند بھی صاحب علم و فضل تھے ۔ انور الدین خان کی شہادت کے بعد ان کے فرزند محمد علی خان والا جاہ کا زمانہ آیا ۔ والا جاہ عرصۂ دراز تک ارکاٹ میں حکومت کرتے رہے ۔ ان کا نام جنوبی ہند کی تاریخ میں مختلف وجوہ سے مشہور ہے ۔ والا جاہ کی وجہ سے فرانسیسیوں کے برخلاف انگریزوں نے بازی جیت لی اور تاجر کی صورت میں آ کر حکمران بن بیٹھے۔ دکن کی سیاسی تاریخ پر جو اصلی واقعات پر مبنی ہے آج تک پردہ پڑا ہوا ہے ۔ اس کی جانب توجہ کرنے کی بڑی اہم ضرورت ہے ۔

والا جاہ کے سیاسی امور سے قطع نظر ، وہ ایک علم دوست حکمران تھے ۔ ان کے زمانے میں ارکاٹ میں علم و فن کی گرم بازاری رہی ۔ شعر و سخن کا چرچا رہا ۔ ابجدی ، باقر آگاہ ، ترقی ، والہ ، غوثی ، شاہ محمد اور مولانا ناصر الدین جیسے علما اور شعرا موجود تھے ۔ والا جاہ کی اولاد میں ممتاز ، ماجد اور اعظم فارسی کے اچھے شاعر پیدا ہوئے۔

خصوصاً محمد غوث خان اعظم تو شاعری کے بڑے دل دادہ

۱- تاریخ فرشتہ

اور خود بھی بلند پایہ شاعر تھے، ان کے مشاعرے مشہور ھیں ۔ جو ہر ھفتے ھوتے تھے ۔ شعرا نہ صرف اپنا تازہ کلام سناتے بلکہ کلام پر تنقید ھوتی ۔ بحث مباحثہ ھوتا رد و قدح کے بعد فیصلہ کیا جاتا تھا ۔ اعظم کو شعراء سے جو دلچسپی تھی اس کے لحاظ سے انھوں نے دو تذکرے بھی لکھے جو ''گل زار اعظم'' اور ''صبح وطن'' کے نام سے شایع ھوچکے اور اب نایاب ھیں ۔

اعظم کے مشاعرے میں حاضر ھوئے والے بیسیوں شعراء تھے جن میں سے احمدی ، رونق ، جوھر ، ذکا ، وفا ۔ اور واصف وغیرہ مشہور ھیں ۔ غرض کہ ارکاٹ کی والا جاھی حکومت کے مختصر زمانے میں بھی علم و فن کی قدر دانی ھوتی رھی ۔ شعرا اور اھل علم کی سرپرستی کی جاتی تھی ۔ اس کی وجہ سے بے شمار شعرا اور ادیب اھل علم اور اھل فن ارکاٹ میں جمع ھوگئے تھے ۔ یہ ایک جداگانہ بحث ھے کہ ان شعرا کی علمی خدمت کہاں تک مفید اور سود مند ثابت ھوئیں ۔ کیوں کہ انھوں نے قومیت یا اخلاق کے بلند اور اعلیٰ جذبات کی نشو و نما میں کوئی حصہ نہیں لیا اور زندگی کے سدھار اور اخلاق عامہ کی بہتری اور زندگی کے لیے کوئی اعلیٰ نصب العین مقرر کرنے میں کوئی نقطۂ نظر اختیار نہیں کیا تھا ۔ صرف اپنی محدود چار دیواری میں کامیابی حاصل کرتے تھے ۔ ارکاٹ میں جو شعراء جمع تھے ان میں ایرانی شعراء بھی تھے ۔ چنانچہ والہ ، بصیرت ، سخن ، کوکب اور اقبال قابل ذکر ھیں ۔ ان کا تعارف کرایا جاتا ھے ۔

(۱) سید محمد موسوی والہ تخلص ان کے والد سید محمد باقر موسوی تھے والہ کی پیدائش خراسان میں ھوئی ۔ اپنے عالی قدر اور ذی علم باپ سے علم و فن کی تعلیم پائی ۔ کم عمری ھی میں نظم و نثر میں کافی دست‌گاہ پیدا کرلی تھی اور فارغ التحصیل ھوگئے تھے۔ ان کی ذکاوت اور فراست مشہور تھی ۔ اپنے ھم عصروں میں ممتاز درجہ

حاصل کرلیا تھا ۔ اپنے باپ کے انتقال کے بعد عالم‌گیر خلد مکان کے زمانے میں خراسان سے ہندوستان آئے ۔ کچھ عرصے تک شمالی ہند میں قیام کیا اس کے بعد حیدرآباد آکر مقیم ہوگئے ۔ اس زمانے میں قطب شاہی خاندان کے افراد موجود تھے ۔ چنانچہ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے داماد سید عبداللہ کی اولاد بہ قید حیات تھی ۔ والہ ان کی غالباً پوتی سے بیاہ کرکے سلاطین قطب شاہی کے خاندان میں منسلک ہوگئے ۔ حیدرآباد میں والہ نورالدین خان کے رفقا میں شامل تھے ۔ عرصۂ دراز تک جاہ و ثروت اور عیش و عشرت سے زندگی بسر کرتے رہے ۔ جب انورالدین خان شہامت جنگ کو آصف جاہ نے ارکاٹ کا صوبے دار مقرر کرکے روانہ کیا تو والہ بھی ان کے ہم راہ ارکاٹ چلے گئے اور وہاں اقامت کرلی ۔ یہ مقام ترچناپلی علاقۂ مدراس ، میں سنہ ۱۱۸۳ ہجری میں والہ کا انتقال ہوا ۔

والہ ایک زندہ دل ، صوفی منش ، خوش مزاج اور خوش اخلاق شخص تھے صلح کل کا ان طریقہ تھا ہر مذہب و ملت کے افراد ان کے دوست تھے ۔ نثر نویسی اور نظم نگاری دونوں کے شہ سوار تھے ۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے ۔ کلیات کے علاوہ فن عروض اور قوافی اور قواعد و انشاء وغیرہ میں ان کی کئی ایک کتابیں موجود ہیں ۔ والہ نہ صرف شاعر و انشا پرداز تھے بلکہ نقاد بھی تھے ۔ ان کی تنقیدیں قابل قدر اور لائق ستایش ہیں ۔ درس و تدریس میں بھی حصہ لیا اور بیسیوں تشنگان علم ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے ۔ والہ کا فارسی کلام نزاکت اور لطافت میں ممتاز ، شگفتگی ، نازک خیالی اور رنگینی میں اپنی آپ نظیر ہے ۔ خیالات کی بلندی تخیل کی رفعت اور معنی آفرینی کے لحاظ سے بھی مشہور ہے ۔

والہ نے اردو میں بھی مہارت پیدا کرلی تھی اور شعر موزوں کرتے تھے ۔ چنانچہ ایک مثنوی ” طالب اور موہنی “ کے

نام سے لکھی اور جس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لندن کے کتب خانے میں محفوظ ہے اور ہم نے اپنی کتاب ''یورپ میں دکھنی مخطوطات'' میں اس کا تفصیل سے ذکر کیا ہے ۔ اب یہ مثنوی شایع ہوگئی ہے ۔

''طالب اور موہنی'' ایک دل چسپ افسانہ ہے حسب بیان مصنف یہ حقیقت پر مبنی ہے ۔ تقریباً ایک ہزار شعر کی یہ مثنوی ہے ۔ قصے کا خلاصہ یہ ہے :

''ایک نوجوان طالب علم کا گزر ایک گاؤں کے پن گھٹ پر ہوا وہاں گاؤں کے مہاجن کی لڑکی موہنی پانی بھرنے کے لیے آئی ۔ طالب موہنی کے تیر نظر کا گھایل ہوگیا ۔ عشق سے مجنوں بن گیا ۔ موہنی کے پیچھے اس کے مکان پر چلا آیا مہاجن نے کوشش کی کہ موہنی کا نام بدنام نہ ہو اور طالب وہاں سے چلا جائے مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا ۔ لوگوں نے کہا دیوانہ ہے ، جانے دو ۔ اس طرح تین دن گذر گئے ۔ طالب نے کچھ کھایا اور نہ پیا ۔ اب لوگوں نے مشورہ دیا موہنی کے ذریعے اس کو کھانا دیا جائے اور کھلا پلا کر روانہ کردیا جائے ۔ چنانچہ مہاجن نے ایسا ہی کیا ۔ طالب نے موہنی کا لایا ہوا کھانا تو کھا لیا مگر گھر چھوڑنے پر راضی نہ ہوا ۔ یہ حالت دیکھ کر عامل سے شکایت کی گئی ۔ عامل نے طالب کو طلب کیا ، واقعات معلوم کیے، سچے عشق سے با خبر ہوا اور طالب کو صبر سے کام لینے کی تلقین کی اور مہاجن کو فہمایش کی کہ اس کے گھر میں رکھ کر خبر گیری کی جائے موہنی کے ذریعے روز ایک وقت طالب کو کھانا تو دیا جاتا مگر دونوں کو کبھی ملنے کا موقع نہیں دیا جاتا تھا ۔ موہنی کی دایا طالب پر مہربان ہوگئی اور ہولی کے تیوار میں طالب سے کہا کہ فلاں باغ میں جائے وہاں موہنی سے ملاقات ہوسکے گی ۔ مگر مہاجن کے ایک سخت گیر

ملازم کو اس کی خبر ہوگئی ، وہ باغ میں پہنچ گیا مگر ایک کالے ناگ نے اس کو ڈس لیا ۔ مہاجن کے دوستوں نے اس کو مشورہ دیا کہ دایا کو دوسرے گاؤں میں چند روز کے لیے بھیج دیا جائے ۔ اس کے غیاب میں موھنی کی بیماری مشہور کی گئی ، پھر مرنے کا اعلان کیا گیا اور جب فرضی جنازہ لے چلے تو طالب بھی گریہ کرتا جنازے کے ساتھ ہولیا ۔ اب لوگوں نے طعنہ دیا کہ معشوق مرگیا اور عاشق کہلا کر زندہ ہے ۔ اس طعنے کا طالب پر فوری اثر ہوا ۔ اس نے ایک کنویں میں گر کر اپنی جان دے دی ۔ موھنی کو یہ حال معلوم ہوا تو وہ بھی آ کر کنویں میں گر پڑی ۔ لوگ جمع ہوئے اور لاشیں نکالی گئیں تو دونوں کی لاشیں باھم پیوستہ تھیں ، لاکھ کوشش کی گئی مگر جدا نہ کرسکے ۔ عادل کو اطلاع ہوئی اس نے آ کر نماز جنازہ کے بعد دونون کو ایک ساتھ قبر میں دفن کیا۔‘‘

اس بیان پر یہ مثنوی ختم ہوجاتی ہے ۔ قریب قریب اسی مضمون کی ایک اور مثنوی ’’مہیار اور چندر بدن‘‘ کے نام سے عادل شاھی عہد میں مقیمی نے لکھی ہے۔ دولوں کے واقعات کسی قدر مل جاتے ھیں ۔ اس کے متعلق بھی ہماری کتاب میں تذکرہ موجود ہے اور مولوی غلام یزدانی صاحب نے ایک مضمون بھی قلم بند فرمایا ہے ۔

واله کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے ۔

غمزہ بے باک و نگہ مست و تبسم لب ریز
شوخ جادو فن من طرفہ بسار آمدہ

لالہ ھاے داغ را پیچیدہ ام از تار آہ
دستہ رنگین بستہ ام گل ھاے باغ عشق را

از جفائے دشمن و زخم حوادث فارغم
نقش‌پا در خاکساری ها بسر باشد مرا

تا زلف تاب دارِ تو با شانه آشنا
با چاک چاک شد دل دیوانه آشنا

محبت چون شود کامل ہوس باقی نمی ماند
کہ سبریزد گل از ہر شاخ چون گردد ثمر پیدا

ز شرم چشم تو نرگس کشید بیماری
عطا گرفته به کف زار و ناتوان برخاست

عالمے آب است زاهد رقص مستاں عیب نیست
دست و پائے میروند ہر کس در آب افتادہ است

(۲) مرزا محمد صالح بصیرت تخلص تھا ۔ ابوالحسن ایرانی کے فرزند تھے ۔ ابوالحسن بڑے بلند پایه ادیب اور صاحب فن تھے۔ بصیرت باپ سے حصول علم کرکے فارغ التحصیل ہوئے اور نواب ناصر جنگ کے یہاں ملازم ہوئے۔ آصف جاہ اول کے بعد جب ناصر جنگ مسند نشین ہو کر ارکاٹ کی طرف مظفر جنگ سے لڑنے کے لیے روانه ہوئے تو بصیرت بھی ساتھ تھے ۔ اس طرح سنه ۱۱۶۳ هجری میں وہ ارکاٹ پہنچے اور ناصر جنگ کی شہادت کے بعد یہاں قیام کرلیا ۔ ملازمت ترک کردی اور توکل پر بسر کرنے لگے ۔ درس اور تدریس میں مشغول تھے ۔ فارسی کی تعلیم دیا کرتے تھے ۔ خط شکسته نہایت عمدہ تھا ۔

جب حیدر علی خاں کا زمانه آیا تو بصیرت ارکاٹ چھوڑ کر سری رنگ پٹن چلے گئے اور اسی مقام پر کچھ عرصے بعد ان کا

انتقال ہوگیا۔ ''گل دستۂ کرناٹک'' اور ''تذکرہ گل زار اعظم'' میں ان کا تذکرہ موجود ہے۔ ان کا صرف ایک شعر دستیاب ہوا۔

سرو بے بر بود درین گلشن
تاک از کج روی ثمر دارد

---

(۳) سخن تخلص سید محمد نام تھا ۔ اصفہان کے سادات عظام میں شامل تھے اپنے وطن سے فارغ التحصیل ہو کر مچھلی بندر آئے اور کچھ عرصے تک یہاں قیام کیا اس کے بعد مدراس گئے اور یہاں اقامت کرلی ۔ اولاً تجارت کرتے تھے ۔ والا جاھی دربار سے تعلق نہیں تھا مگر اس کے بعد امیر الامراء کی سرکار سے ان کا توسل ہوگیا ۔ ''خانی'' کا خطاب ملا ۔ امیرالامراء کے بعد نواب والا جاہ کے مقرب بنے ''بہادری'' کا خطاب سرفراز ہوا اور دیوان خانۂ خاص کے مہتمم بنائے گئے ۔ سنہ ۱۲۱٦ ھجری میں ان کا انتقال ہوا ۔ غزلیات اور قصاید کہتے تھے ۔ ان کا ایک مختصر دیوان مرتب ہوا تھا ''تذکرۂ گل زار اعظم'' اور ''صبح وطن'' میں ان کا ذکر موجود ہے ۔

قسمت ما گرنہ بودے از ازل سر گشتگی
بے سبب آدم چرا خوردی فریب دانہ را

بہ یک کرشمۂ ساقی فدا کنم صد جان
اگر قبول کند برکف ارمغان مرا

وعدۂ وصل نہ بود آن کہ سراپا ہم سوخت
آتش هجر توام بود کہ برپا کردم

تا معتکف به درگه پیر مغاں شدم
بشت ختم حقیقت بیت الحرم مرا

---

(۴) مرزا محمد صادق نام اور کوکب تخلص تھا ۔ یہ بھی اصفہانی تھے۔ سنہ ۱۲۷۰ ھجری میں مدراس آئے۔ کچھ عرصے تک تلاش معاش میں سرگرداں رہے ۔ اس کے بعد انگریزی حکام نے ان کو مدراس میں خدمت افتا پر مامور کیا اور تین سو پچاس روپے ماھوار مقرر کیے ۔ چند سال کے بعد مستعد خان قاضی القضات سے مذھبی امور میں اختلاف ھوگیا اور یہ خدمت سے مستعفی ھوگئے ۔ وطن واپس ھونے کا قصد کیا تھا کہ بیمار ھوگئے اور سنہ ۱۲۹۰ ھجری میں انتقال ھوا ۔

حال ھیچ آشنا نمی جوئی
باھمیں حال ما نمی جوئی

عمرے به ھوائے نفس گمراہ شدیم
بیکه شده بود چونکه آگاہ شدیم
بے توشه و بے راحله بر راہ فنا
راھے متوکل علی‌الله شدیم

---

(۵) مرزا محمد مہدی نام اور اقبال تخلص تھا اصفہان کے رھنے والے تھے ۔ اپنے وطن سے آ کر ویلور علاقۂ مدراس میں اقامت کی ۔ مرثیه خوانی کرتے تھے ۔ عزت کے ساتھ زندگی بسر ھوتی تھی ایک مرتبه ماہ محرم میں عاشورے کے دن جنازہ بنا کر رستے پر نکلنا چاھا لوگ مانع ھوئے، فساد ھوگیا ، لوگوں نے ان کے مکان کو گھیر لیا مگر زندگی تھی یه بچ گئے۔ اب ویلور سے حیدر آباد چلے گئے اور یہاں اقامت کرلی سنہ ۱۲۳۶ ھجری میں انتقال ھوا ۔

"تذکرۂ گل زار اعظم" اور "صبح وطن" میں ان کا ذکر موجود ہے ۔

شبے در عالم هجراں دو ابرو در خیال آمد
به سینه هر کجا ناخن زدم شکل هلال آمد

اگرچہ صرف انہیں پانچ ایرانی شعراء کا پتا چلتا ہے ۔ مگر اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ارکاٹ میں بھی علم و فن کی کافی قدردانی ہوتی تھی ۔ فارسی شاعری کی جو سرپرستی نواب محمدغوث خان والاجاہ المتخلص بہ اعظم نے فرمائی وہ کبھی فراموش نہیں ہوسکتی ۔ ان کے زمانے میں مدراس میں فارسی کے قابل قابل اشخاص جمع ہوگئے تھے بیسیوں نظم اور نثر کی کتابیں تصنیف ہوئیں ، ہیں اگرچہ ان میں سے بہت کم طبع ہوکر شائع ہوئی ہیں ۔ اور اگر ان کے زمانے کی تصانیف پر ریسرچ کی جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ کیسی کیسی کتابیں اس زمانے میں تصنیف ہوئیں جو قابل قدر ہیں ۔

نواب غلام محمد غوث خاں والا جاہ کے بعض علمی کار نامے

سنہ ۱۱۵۸ھ میں انوار الدین صوبۂ کرناٹک کے صوبے دار مقرر ہوئے تھے ۔ اس کے تقریباً ایک صدی کے بعد سنہ ۱۲۵۸ھ میں غلام غوث خاں مسند ارکاٹ پر متمکن ہوئے اس ایک صدی کے عرصے میں صوبے دار کرناٹک یا والی کرناٹک کی حالت میں بہت کچھ فرق ہو چکا تھا ۔ پہلے تو سلطنت مغلیہ کی طرف سے صوبے دار مقرر ہوتے تھے ۔ پھر خود مختار والی کی حیثیت سے حکمرانی کی ۔ شاہان انگلستان اور فرانس نے ان کی دوستی کو اپنے لیے باعث بہجت و افتخار تصور کیا ۔ اس کے بعد ہی وہ زمانہ آیا جب کہ نوابان کرناٹک نے انگریزی کمپنی کے وظیفے

پر قناعت کر لی ۔ سالانہ بارہ لاکھ نقد اور ۱/۵ محاصل ان کا وظیفہ تھا ۔ یہ وظیفہ پانے والے رئیس غلام محمد غوث خاں آخری شخص تھے ۔ کیونکہ ان کے مرنے کے بعد برائے نام حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا ۔ خاندان والا جاھی کے ایک فرد عظیم جاہ کو ''پرنس آف ارکاٹ'' کے لقب کے ساتھ سالانہ چند ہزار کا وظیفہ ملنے لگا ۔

غلام محمد غوث خاں اگرچہ عملاً حکومت سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے ۔ لیکن پھر بھی سالانہ بڑی رقم ان کو ملتی تھی ۔ سرکار کمپنی میں ان کی بڑی عزت و وقعت تھی ۔ وہ ان کو حکمران تصور کرتے تھے ۔ غلام محمد غوث خاں کے بعد یہ حیثیت بھی باقی نہیں رھی اس لیے ان کو آخری حکمران تسلیم کیا جا سکتا ہے ۔

غلام محمد غوث خاں صغیر سنی میں یتیم ہو گئے تھے ۔ ان کے سر سے شفیق والد کا سایہ اس زمانے میں اٹھ گیا جب کہ وہ پورے دو سال کے بھی نہیں تھے ۔ نوجوانی میں ان کو آزادی مل گئی ۔ سالانہ کافی رقم کے وہ خود مختار تھے ۔ جو چاہتے تھے کر سکتے تھے ۔ حکومت سے ان کو کوئی تعلق نہیں رہا ۔ اس لیے مختلف شوق ان کو دامن گیر رہے کبھی عمدہ عمدہ پکوان کا شوق ھوا ؛ تو اعلیٰ درجے کے کھانے تیار ہونے لگے اور دور دراز سے باورچی آنے لگے جو اپنی ھنر مندی کا صلہ پاتے تھے ۔ کبھی رنگ ریزی سے دلچسپی ہوئی ۔ رنگنے کے مختلف طریقے ایجاد ہوئے ۔

ان ھی شوقوں کی طرح شاعری اور مشاعرے کا شغف بھی تھا ۔ ان کا یہ علمی شوق عرصے تک زندہ رہا ۔ اس موقع پر ہم مختصر طور پر ان کے علمی کارناموں کی صراحت کرتے ھیں ۔

غلام محمد غوث خاں ذی علم تھے ان کی تعلیم اس وقت کے جید علما اور متبحر فضلا سے ہوئی تھی ، فارسی اور عربی میں

ان کو بہت اچھی مہارت تھی مولوی غلام محی الدین ، مولوی جلال الدین حسن خان اور سید ابو طیب خاں۔ جو اس وقت کے فارسی کے سربرآوردہ علما تھے ان کے استاد تھے، اسی طرح مولوی جمال الدین احمد ، قاضی محمد ضبغتہ اللہ اور مولوی ارتضا علی خاں جیسے سرآمد روزگار علما نے عربی کی تعلیم دی تھی۔

غلام محمد غوث خاں کو شاعری سے دلچسپی تھی ۔ فارسی اور اردو میں کلام موزوں کرتے تھے ۔ اعظم ان کا تخلص تھا ، والا [1] سے تلمذ تھا ۔ اس وقت کے رواج کے مطابق غزلوں میں اپنے خیالات ظاہر کرتے تھے ۔ بہترین غزل کے جو لوازم ہیں یعنی تخیل کی بلندی ، خیالات کی نازکی ، مضمون کی رنگینی اور زبان کی صفائی یہ سب کچھ اعظم کے کلام میں پائے جاتے ہیں ۔ ان کا فارسی دیوان جس میں کچھ اردو غزلیں بھی ہیں شائع ہو چکا ہے ۔

اعظم کا دوسرا علمی کارنامہ ان کے وہ مشاعرے ہیں جن میں نہ صرف بڑے بڑے فارسی کے زبردست شاعر جمع ہوتے تھے ، بلکہ شعرا کے کلام پر اعتراضات کرنے کی اجازت بھی تھی ۔ اس لیے علمی اعتراضات کیے جاتے تھے ۔ مناظرہ ہوتا تھا ۔ اس علمی کارنامے کے بہت کچھ باقیات محفوظ ہیں ۔ چنانچہ مولانا محمد حسین صاحب محوی نے رسالہ ''اردو'' میں اس کے متعلق وضاحت سے روشنی ڈالی ہے ۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں ہے ۔

اعظم کا تیسرا علمی کارنامہ ان کے فارسی کے تذکرے ہیں ۔ ''تذکرۂ صبح وطن'' اور ''گلزار اعظم'' کے باعث اس وقت کے فارسی اور اردو کے بڑے بڑے نامور شعرا کا حال آج تک محفوظ ہے اگر یہ تذکرے مرتب نہ ہوتے تو شائد اس وقت کے شعرا کے

۱۔ ابو طیب خاں والا فارسی کے نامور شاعر تھے آگاہ سے ان کو تلمذ تھا ۔

حالات کا پتا ہی نہ چلتا ۔ اعظم نے ان دونوں تذکروں کو مرتب کر کے علمی اور شاعری کی دنیا پر احسان عظیم کیا ہے ۔

ان کے قطع نظر اعظم کا سب سے بڑا اور عظیم الشان کارنامہ مدرسۂ اعظم ہے ۔ غلام محمد غوث خاں نے اس مدرسے کی بنا ڈالی اور اپنے نام پر مدرسۂ اعظم سے موسوم کیا تھا ۔ اس کے لیے جائداد وقف کی اور آمدنی کے ذرائع چھوڑے جس کے باعث یہ مدرسہ اب تک قایم ہے ۔ ''محمڈن کالج'' سے موسوم اور مسلمانوں کی تعلیم کا بہت بڑا ذریعہ ہے ۔ اس مدرسے کے باعث مسلمانوں میں انگریزی اعلیٰ تعلیم کا شوق پیدا ہوا ۔ اب بھی اس مدرسے میں مسلمان اعلیٰ تعلیم پاتے ہیں ۔

آج اعظم کو انتقال کیے ہوئے تقریباً سو سال ہوئے (سنہ ۱۲۷۶ ہجری) ان کے تفصیلی حالات اور پورے کارناموں کو جاننے والے مفقود ہیں ، لیکن ان کا یہی ایک علمی کارنامہ ان کے نام کو زندہ اور روشن کرنے کے لیے کافی ہے نسلیں اس کو فراموش نہیں کریں گی ۔

دکن میں مغلیہ حکومت کے بعد آصفی دور شروع ہوا اور حکومت کے سوا دو سو سال کے زمانے میں تقریباً ڈیڑھ سو سال تک حکومت کی سرکاری زبان فارسی رہی ۔ جس کی وجہ سے سینکڑوں ہندو اصحاب فارسی کے بلند پایہ انشا پرداز ، نازک خیال ، شاعر اور دقیقہ سنج محقق پیدا ہوئے ہیں ۔

آصفی امرائے سلطنت میں مسلمانوں کے علاوہ کئی ہندو اصحاب فارسی کی اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے ۔ مثلاً راجا مہیت رام ، راجا چندولال ، ان کے بھائی گوبند بخش ۔ ان کے بعد راجا رام بخش سب کے سب فارسی میں بہت اچھی مہارت رکھتے تھے ۔ اس کا سلسلہ زمانۂ مابعد تک رہا ۔ چنانچہ مہاراجا کشن پرشاد تک نے اپنی فارسی قابلیت کی جو صراحت کی ہے وہ قابل ملاحظہ ہے :

''مرزا علی بابا شیرازی کا شاگرد ہوں ۔ سیدھی سادی نثر

لکھتا ہوں مگر انشائے خلیفہ اور انشائے مادھو رام سے کم نہیں۔ عبارت سلیس ، محاورہ خاص ایرانی اور بندش چست نہ ہو تو ہار جاؤں ''۔

دراصل مہاراجا کشن پرشاد کی فارسی قابلیت نظم اور نثر میں اعلیٰ معیار کی تھی ایک غزل ملاحظہ ہو ۔

(۷) مہاراجا کشن پرشاد

گر تو می خواهی شوی در عشق جانان مرد فرد
از هوائے ما سعی واللہ دل بباید کرد سرد
نیک نامی عاشقان را موجب ذلت بود
گر تو خواهی عزتی حاشا زبدنامی مگرد
از برائے درد عشق خویشتن پیدات کرد
درد عشقش چون نداری تو نه واله مرد
واصل جانان کسے باشد که حاصل کرده است
درد در دل ، آه بر لب ، چشم پر خون ، رنگ زرد
گر تو می خواهی که خوانه بر کسے عاشق ترا
درد دل اے شاد باید در دباید درد درد

آصفیہ حکومت کے زمانے میں فارسی کے نامور علما ایران سے آئے ۔ ان کے علاوہ سیکڑوں دکنی مسلمان علما فارسی کی اعلیٰ قابلیت کے باعث شہرت رکھتے ہیں ۔ ان کے ناموں کی فہرست بھی خاصی طویل ہوگی ۔

دور آصفی میں جن ہندو مشاہیر علما اور شعرا نے نام و نمود حاصل کیا ان میں سے ہم چند کا تذکرہ کرتے ہیں ۔

لالہ منسا رام آصف جاہ اول کے چیف سکریٹری فارسی کے زبردست انشاء پرداز تھے ۔ ان کے فرزند لالہ لچھمی ناراین شفیق نے اپنی کتابوں کے باعث شہرت دوام حاصل کرلی ہے ۔ لالہ

گردھر لال احقر اپنی ''تاریخ ظفرہ'' کے باعث مشہور ہیں ۔ راجا مکھن لال اپنی تاریخ اور عمر خیام کے خصوصی ماہر ہونے کی وجہ سے فراموش نہیں کیے جا سکتے ۔

دکنی رائے ایک دوسرے شاعر تھے ۔ مہا سنگھ حقیر تخلص لالہ سرونجی لال لالہ تخلص ۔ غرض کئی ہندو شعراء کے نام گنائے جا سکتے ہیں ، جو سب فارسی کے زبردست ماہر تھے ۔ مولانا غلام علی آزاد کا نام بھلایا نہیں جاسکتا ۔ جو ناصر جنگ کے مصاحب خاص تھے اور فارسی کے بلند پایہ ادیب اور نازک خیال شاعر تھے۔ جن کے کئی ہندو اور مسلمان شاگرد ہیں ۔

بہر حال آصفی دور کے مسلمانوں سے قطع نظر، ہندو بھی ادیب اور شاعر تھے جنھوں نے فارسی پر کافی عبور حاصل کر لیا تھا اور فارسی زبان میں گفتگو کرتے تھے ۔

آصفی دور میں ایران سے جو اصحاب حیدر آباد آئے ان کی تعداد بھی خاصی ہے جن کی اولاد آج بھی فارسی زبان کے مشاہیر میں گنی جا سکتی ہے ۔ طبا طبائی خاندان ، موسوی خاندان اور نقوی خاندان وغیرہ ایران سے آصفی دور میں دکن آئے اور علمی خدمات انجام دیتے رہے ۔

میر موسیٰ خان اور نصراللہ خان دولت یار جنگ ایران سے آصفی دور میں حیدر آباد آئے۔ نصراللہ خان کی ''تاریخ داستان ترک تازان ہند'' ایک ایسی تاریخ ہے جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے جس میں ایک لفظ بھی عربی کا نہیں ہے ۔ سنادالملک علامہ سید علی شوستری میر محبوب علی خاں کے زمانے میں اپنی اعلیٰ فارسی قابلیت میں مشہور تھے، جن سے کئی اصحاب نے فارسی کی اعلیٰ تعلیم پائی جن میں ایک حضرت امجد بھی ہیں ۔ اس دور میں گرامی ترکی اور فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ جو حیدر آباد آئے۔ اگر دور محبوبی اور دور عثمانی کے فارسی گو شعراء اور انشا پردازوں کا نام

بتایا جائے تو ایک فہرست طویل ہوگی ۔ نواب ضیا یار جنگ اور مولانا مسعود علی محوی فرامرش نہیں کیے جا سکتے جن کے فارسی کے ضخیم دیوان موجود ہیں ۔ مدرسۂ دارالعلوم اور جامعۂ عثمانیہ میں مولانا سید محمد عباس اور مولانا اشرف شمسی جیسے فارسی کے استاد جمع ہو گئے تھے ۔ نظام کالج کے پروفیسر داعی اسلام آغا محمد علی کو بھول نہیں سکتے ، جنھوں نے فارسی ''فرہنگ نظام'' جیسی لغت لکھی جس کی ایران میں بھی مانگ ہے ۔ اسی طرح شمس العلماء عزیز جنگ کی لغت ''آصف اللغات'' مشہور ہے ۔ جس کی سترہ اٹھارہ جلدیں صرف ابتدائی حروف تک لکھی گئی ہیں ۔

مولوی جمال الدین نوری ، مولوی سید علی حیدر طباطبائی ، مولوی عبدالعلی والا وغیرہ وہ اصحاب تھے جن کی فارسی قابلیت کو اہل ایران نے بھی تسلیم کر لیا تھا ۔

فارسی زبان کی رویداد درج کرنے کے بعد اردو کی داستان پیش کی جاتی ہے۔ اگرچہ راقم نے اپنی کتاب ''دکن میں اردو'' میں تفصیل کے ساتھ اردو کی ترقی کا حال قلمبند کر دیا ہے اور اس کا چھٹا اڈیشن شائع ہونے والا ہے ۔ مگر سلسلۂ بحث کی تکمیل کے لیے مختصر صراحت یہاں ضروری ہے ۔

یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ سلاطین بہمنی نے دکن کے لیے ایک مشترک زبان کی حیثیت سے دکھنی کو فروغ دینا پسند کیا تھا ۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی حکمرانی کے زمانے میں شمال سے آئی ہوئی زبان نے دکن میں نئے برگ و بار پیدا کیے اور پھر اس نئی زبان نے ترقی کے جو زینے طے کیے وہ اس زمانے کے پر شان و شکوہ تمدن کے گواہ ہیں ۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ دکھنی زبان کی پرداخت میں راعی اور رعیت دونوں نے حصہ لیا تھا ۔ دکھنی زبان کے ابتدائی نمونے تقریباً سنہ ۱۳۵۰ع سے ہمدست ہوتے ہیں ۔ جس میں نظم اور نثر دونوں شامل ہیں ۔ گو ان میں مذہب

یا تصوف کا حصہ زیادہ ہے ۔ مگر نظامی وہ خوش نصیب شاعر ہے جس کی عشقیہ مثنوی ''کدم راو پدم'' کو اس صنف کی مثنویوں میں اب تک اولیت کا درجہ حاصل ہے ۔ یہ مثنوی سنہ ۸۶۳ھ کے لگ بھگ لکھی گئی ہے ۔

یہ مثنوی اتنا بتانے کے لیے کافی ہے کہ اس وقت دکن کی ادبی زبان میں خالص دیسی اور عربی و فارسی الفاظ کا تناسب کیا تھا ۔

نظامی احمد شاہ ثانی بہمنی کے عہد کا شاعر تھا ۔ نظامی کے بعد ایک صدی تک کسی دوسرے دکھنی شاعر کا نام اب تک نہیں ملا ہے ۔ مگر اس ایک صدی کے بعد کا جو کلام دستیاب ہوا ہے وہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ شعرا نے اس سے پہلے ترقی کے اور بھی مراحل طے کر لیے تھے ۔

بیجاپور کے عادل شاہی خاندان کے بانی یوسف عادل شاہ نے فارسی کے ایک بلند پایہ شاعر کی حیثیت سے بھی اپنا نام یادگار چھوڑا ہے ۔ اس کے بیٹے اسماعیل کو بھی فارسی شعر گوئی میں امتیاز حاصل تھا ۔ وفاقی اس کا تخلص تھا ۔ علی عادل شاہ اول کا نام علم و ہنر کی سرپرستی کے لحاظ سے یادگار ہے ۔ اس کو مطالعے کا اس قدر شوق تھا کہ سفر میں بھی کتابوں سے بھرے ہوئے چار سو صندوق اس کے ساتھ رہا کرتے تھے ۔ علی عادل شاہ کا جانشین ابراہیم ثانی ہے ۔ اس کا دور حکومت تر ترقیٔ علم و فن کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہے ۔ اس نے علم و ہنر کی جس طرح سرپرستی کی اس کے وجہ سے بیجاپور علم و فضل کا بڑا مرکز بن گیا ۔

ابراہیم شاعر بھی تھا اور ماہر موسیقی بھی ، ابراہیم اس کا تخلص تھا ۔ اس کے زمانے میں شاعری اور موسیقی کو بڑی ترقی ہوئی ۔ اس کے ساتھ ہی اس امر کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ شاہی دفتر کی زبان جو علی عادل شاہ کے زمانے میں فارسی کردی گئی تھی ،

پھر سے دکھنی ہو گئی ۔ دکھنی شعراء کا عروج ہوا ۔ اس امر کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ ابراهیم فارسی کے ساتھ دکھنی کا بھی شاعر تھا ۔ اس کی شاعری کی یادگار ''نورس'' موجود ہے ۔ حیدر آباد میں اس کے کئی نسخے موجود ہیں جن پر ہم نے تفصیل سے اپنے ایک مضمون میں روشنی ڈالی ہے ۔ ''نورس'' کو ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ، صدر شعبۂ فارسی علی گڑھ نے شائع کرایا ہے ۔

نورس کا نمونہ کلام یہ ہے

محل محل صد سواری
اس نمونے بہشت ایاری
انند هوتا ہے سدا بھاری
ارتی لیائے اِبن بھر ناری
کدم سکتوری جوا چندر لای
بادل کان سی ہر رنگ دس پر ساری
شہامی عمر بیتا پھر آئی
شربت گھول امرت پلاتی
بادل دماسے بجلیاں بجاوے
باجی خالو آشتابی آئے پاوے
سہل نورس کلیان پدھاوے
ابراهیم کرکنی گاوے

کتاب ''نورس'' کے اس نمونے سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ فارسی میں دیسی زبانوں کے کتنے زیادہ الفاظ دکھنی میں شامل تھے۔

ابراهیم کے بعد محمد عادل شاہ کے زمانے میں دکنی شعر و سخن کو جو ترقی ہوئی اس کا اندازہ اس کے عہد کے کئی نامور شعرا کے کارناموں سے جو آج تک باقی ہین کیا جاسکتا ہے ۔ ان میں مقیمی ، شوقی ، صنعتی ، سلک خوش نود اور رستمی پیش پیش ہیں

''چندربدن مہیار''، ''میزبانی نامہ''، ''نجات نامہ''، ''گلدستہ''، ''ھشت بہشت''، ''خاور نامہ''۔ دکھنی زبان کے انمول نگینے ھیں جن کی چمک دمک آج تک باقی ہے۔ ''خاور نامہ'' کے چوبیس (۲۴) ہزار اشعار نے جہاں اس کے مصنف رستمی کا نام زندۂ جاوید کردیا ہے وھاں اس کی سرپرست ملکہ خدیجہ سلطانہ شہربانو کی فیاضی کو بھی غیرفانی بنا دیا ہے۔

محمد عادل شاہ کا جانشین علی عادل شاہ ثانی بیجاپور کا آٹھواں حکمران تھا۔ سنہ ۱۰۶۷ ھجری سے سنہ ۱۰۸۳ ھجری تک اورنگ حکومت پر جلوہ گر رھا اور سولہ سال کی حکومت کے بعد (۳۵) سال کی عمر میں عین عالم جوانی میں اس نے انتقال کیا۔ خوش قسمتی سے سلطان کو اس کے زمانۂ شہزادگی میں نگرانی اور تربیت کے لیے خدیجہ سلطانہ شہربانو جیسی خاتون کی توجہ حاصل ہوگئی تھی۔

انیس سال کے عین زمانۂ شباب میں علی عادل شاہ نے جب حکمرانی کی باگ ھاتھ میں لی تو اس نے اپنی سلطنت نہ صرف بیرونی مخالفوں میں گھری پائی بلکہ خود ارکان حکرمت اور امرائے ملک میں بغض و عناد کی تباہ کن آگ شعلہ زن دیکھی۔ عادل شاہی حکومت دشمنوں کے نرغے میں تھی۔ سلطان کی عمر کا بہترین زمانہ میدان جنگ میں بسر ھوا۔ تیغ و تفنگ اور تیر و نیزہ کے ہزاروں کھیل تماشے دیکھے، کبھی مغلوں سے معرکہ، کبھی مرھٹوں سے آویزش اور کبھی صلابت خان سے پیکار۔ یہ سطان علی ھی تھا جس نے اپنی فراست اور دانش مندی کے بل بوتے پر ان مشکلات پر غالب آنے کی لگا تار کوشش کی اور کامیاب ھوا۔

دوسری طرف اس امر کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاھیے کہ اس زمانے میں عادل شاھی حکومت اپنے پورے عروج پر پہنچ چکی

تھی اور اس کا عہد بڑی حد تک زوال و خاتمے کا پیش خیمہ تھا۔ بیجا پوری علم معاشرت میں سادگی ۔ بلند مشربی اور عالی دماغی کا وجود نابود ہونے لگا تھا۔ تمدن اور رسمی شایشتگی میں پیچیدگی اور تکلف بے جا نے اپنی جگہ پیدا کر لی تھی ۔ عالی شان عمارتوں فردوس منظر باغوں اور رشک ارم خیابانوں کی آراستگی اور چمن بندی میں سونا پانی کی طرح بہایا جاتا تھا ۔ زاھد فریب رانیوں اور گل رخسار حرموں سے عیش و طرب کے وہ وہ سامان پیدا کیے جاتے تھے جن سے انسانی زندگی اپنے اس جوش اور انہماک کو بالکلیہ فراموش کر چکتی ہے جو قوموں اور حکمرانوں کی روح ہے ۔

سلطان علی نے آنکھ کھولی تو اس فضا میں ، ہوش سنبھالا تو اس ماحول میں اور زندگی ختم کی تو انھیں حالات میں ۔ لیکن اس کے باوجود اس نے حالات پر قابو پانے کی جو پیہم کوشش کی وہ حیرت انگیز ہے ۔

ذاتی حیثیت سے بادشاہ نے علم و فن کی خاص قدر افزائی کی اور کیوں نہ کرتا جب کہ خود بھی صاحب علم اور صاحب ذوق تھا ۔ نامور اصحاب علم و فضل اس کے پاس بھی جمع تھے ۔ قاضی نور اللہ ، علامہ فتح اللہ شیرانی ، ملا احمد نائطی، اور شاہ ابوالمعالی وغیرہ جیسے اصحاب بے فکری سے علم کی خدمت گزاری میں سرگرم تھے ۔ شاعری کا تو اب گھر گھر چرچا تھا ۔ شعر کہنا گویا اس وقت فیشن میں داخل تھا ۔ سخن فہمی ، سخن سنجی اور سخن دانی کے بغیر کوئی شخص سماج میں نہ تو نام و نمود پیدا کرسکتا تھا اور نہ کوئی اثر و رسوخ حاصل کرسکتا ۔ فارسی شاعری کے علاوہ دکھنی شاعری نے بھی اس وقت خوب بال و پر نکالے تھے ۔ نصرتی ، ہاشمی، مرزا حسین اور شوقی وغیرہ جیسے ارباب فکر و تخیل صدیوں میں جا کر کہیں پیدا ہوتے ہیں ۔

اس فضا میں اگر بادشاہ خود بھی شعر نہ کہتا تو بہت

تعجب کی بات ہوتی ۔ بہ حیثیت سماج کے صدر کے اس کو شعرگوئی کا ملکہ پیدا کرنا ضروری تھا سلطان علی کو طبعاً خوش مزاجی رنگیں طبعی اور بذلہ سنجی سے حصہ وافر نصیب ہوا تھا ۔ مصوری اور موسیقی میں بھی مہارت تامہ حاصل تھی اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی شاعرانہ استعداد خود بخود بر سرکار آ گئی ۔ سلطان کے کلام کو مرتب کرنے کا کام شاہ ابوالمعالی جیسے صاحب ذوق کے ذمے تھا ۔ سلطان نے اپنا تخلص شاہی قرار دیا تھا ۔ اس کے کلیات کا ایک نسخہ ریکارڈ آفس حیدر آباد کے کتب خانے میں محفوظ ہے اور اب دو جگہ سے شائع ہو گیا ہے ۔

شاہی کے کلیات میں مثنوی ، غزل ، قصیدہ ، ریختی اور مخمس وغیرہ بھی شامل ہیں ۔ ہم مختصر طور پر ان کی صراحت کرتے ہیں ۔

شاہی کے چھہ قصیدے اس کے کلیات میں شامل ہیں ۔ ان کا موضوع حمد ، نعمت اور منبقت کے علاوہ محل اور باغ کی تعریف ہے ۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

عقل کا مکتب ہوا فہم کے بڑھنے بدل
عقل معلم نے ایں قصہ سکھایا کہن
عقل خبردار ہے عقل ہمہ کار ہے
عقل کاجل سوں ہو مکھ یہ اچھے ہوکرن
عقل کا موتی مگر مغز کے طبلے بھتر
خوب سا دے ہے جگہ در جنگ در عدن

خاک کی پتلی بنا روح لے تن میں بھرا
چال چلا کر اول آپ سکھایا مکن

آب اور آتش سلا خاک و ہوائے دلا
چار عناصر لگا وہ سنواریا ہمن

ایک دوسرے قصیدے میں جو منقبت حضرت علی میں ہے بجائے ساقی کے کلال کا لفظ استعمال کیا ہے ۔ چنانچہ اب بھی سیندھی ناسنے والے کو دکن میں کلال کہا جاتا ہے ۔ ملاحظہ ہو :

آرے کلال مجھ کو پیالا پلا میا کا
تا مست ہو کے دیکھوں گلزارعلی پیا کا
شاہ نجف ولی ہے تس نام سوں علی ہے
وہ راز دان احمد سلطان اولیا کا

علی داد محل کی تعریف کا جو قصیدہ ہے وہ واقعہ نگاری کا اچھا نمونہ ہے ۔ یہ لامیہ قصیدہ ہے اس عہد کے نصرتی سے لے کر ہمارے امیر و محسن کا کوروی تک نے اس ردیف و بحر میں اپنی عقیدت و کمال کے اظہار کی کوشش کی ہے ۔ سلطان نے علی داد محل کی تعمیر سنہ ۱۰۶۹ھ میں کی تھی اس محل کا باغ بھی مشہور تھا ۔ اس قصیدے میں تشبیہوں اور استعاروں کی ندرت و شوکت قابل تعریف ہے ۔ یہ قصیدہ ۱۹۵ اشعار پر مشتمل ہے ۔

شاہی کی ایک طویل مثنوی ”بدیع الجمال“ ہماری نظر سے گذری ہے اس کلیات میں ایک مثنوی ۲۷ شعر کی ”خیبر نامہ“ کے عنوان سے ہے اور دو چھوٹی مثنویاں ہیں ۔ ”خیبر نامہ“ واقعہ نگاری کا ایک اچھا نمونہ ہے ۔ اس میں جنگ خیبر کے حالات کہے گئے ہیں ۔ حضرت علی اور مرحب کی لڑائی کا واقعہ لکھا ہے ۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

اول حق کی توحید سوں کر سخن
پچھن خوش ادا سوں بیان کر بچن
تجھے ہے سزاوار حمد و ثنا
ترے حکم سوں ہے ننہا ہور بڑا

اتا ایک قصہ سنو جنگ کا
کہ وہ جنگ تھا دین کے ننگ کا
اتھا ایک خیبر کا قلعہ بکل
بڑے بھر کلاں پر اکل تھے اٹل

سلخ ظاهری باطنی سوں سوار
عنایت کیے شاہ کوں ذولفقار
روانا ہو جنگ کے لیے نامدار
وہ شاہ ولایت ادھک کام گار

جو مرحب نے دیکھا برادر کے تیں
کہا وہ گیا تو لڑوں کاچ میں
زرہ باندہ دوھری بندھا دو خدنگ
رکھا دل میں جب شہ سوں کرنے پلنگ

لیا ھات بھلا جو تھا تین من
شتابی سوں آ کر کھڑا بیچ رن
فتح کر قلعے کوں شہنشاہ سور
پھرے لیک لشکر پیمبر حضور

ترا یاد دن رات شاهی کا کاج
ترے فیض سوں ہے اسے تخت و تاج

سعدی اور حافظ کی عام مقبولیت اور غزل نگاری نے جو رنگ اختیار کیا ۔ ظہوری اور کلیم جیسے شاعروں کی زمزمہ خوانی کی آواز باز گشت جہان ہم کو سلطان محمد قلی ، غواصی ، رستمی ، نصرتی ، هاشمی اور حسینی وغیرہ کے زمزمے میں ملتی ہے وہیں شاهی کلیات

بھی ایسے نغموں سے خالی نہیں ہے ۔

شاہی کے محل سراؤں کوشکوں ، قصروں اور ایوانوں میں خوبی اور رعنائی کے مجسم پیکروں کی کوئی کمی نہیں تھی ۔ رخساروں کی گل گونی اور کرشمہ و ادا کی سحر آفرینی سے اٹھوں پہر لطف اندوز ہونے کا پورا سامان مہیا تھا ۔ اس کی غزلیات میں بڑی حد تک حقیقت کی بھی جھلک نظر آ جاتی ہے ۔ ساتھ ہی رنگین خیالی اور عاشقانہ مضمون آفرینی میں شاہی بہت کامیاب ہے ۔ اپنے تخیل کو کام میں لاتا ہے ۔ موجودہ عہد کی زبان کی صفائی کے سوا اور کوئی بات ایسی نہیں جو زمانۂ ما بعد کی غزلوں میں امتیاز پیدا کرسکے ۔ وہی شاھد و ساقی ، وہی جام و ساغر ، وہی معشوق کی تعریف اور اس کے حسن اور خوبصورتی ناز و کرشمہ کا ذکر ہے جو زمانۂ مابعد کے شعرا کا خاصہ رہا ہے ۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ۔

جس دن نے تمن سات لگیا من ھمارا
اس دن نے پرت کا ھوا سچ تن میں پکارا

ابرو کماناں کھینچ کر مارے پلک کے تیر سوں
زخمی ھوا دل کا ھرن لا گیا نشان تج ھاتھ کا

بولے جہاں کے یار کہے ھمنا نہ آوے بولنا
تمنا سہانا بولنا اے شاہ بحر و بر کہو
مرجان میں صافی نہیں یاقوت میں صافی اچھے
جس ذات میں صافی اچھے اس ذات کو بہتر کہو

تج نین کی نرسی کنے منگتے ھیں موتی آبرو
یا روپ کی تو کان ہے یا حسن کی سمدور ہے

تج کال پر لگ کا لشان دستا ہے مج اس ھاتھ کا
روشن شفق میں جگمگے جیوں چاند پہلی رات کا

شاھی نے ریختہ اور ریختی دونوں قسم کا کلام یاد گار چھوڑا ہے ۔ اس زمانے میں رنختہ اس غزل کو کہتے تھے جو فارسی جملوں اور مصرعوں سے مخلوط ھوتی تھی ۔ کہتا ہے :

دیدم نظر بر روپ جو اس شوخ چگہ مستانہ را
گفتم بیا مندر منے روشن پکن کاشانہ را
نا مان کر اس بول کون آنچل جھٹک دے جب چلی
آخستم سون بولی مجھے بامن مگو افسانہ را
تمن کے فراقوں یوں دے گلزار سب انگار ہو
یو دل معلم ھو مرا دیوے سبق پروانہ را
موزوں مقفا بولیے ھر یک کوں کاں طاقت اچھے
اچرج کہیا شاھی غزل سنیے بدل فرزانہ را

ریختی کا موجد ھاشمی بیجا پوری سمجھا جاتا ہے ۔ جو علی عادل شاہ شاھی کے عہد میں موجود تھا ۔ شاھی کے کلیات میں ریختی بھی ہے چند شعر یہ ھیں :

پیو سات ایج رهنا لذت اسے کہتے ھیں
آپ ایج پھر رجھانا صنعت اسے کہتے ھیں
مج لین کے لگر میں لالن وطن گئے جب
تب انجمن کے لوگاں خلوت اسے کہتے ھیں
کل ھو گلاپ میانے نہیں کچ فرق ازل تے
پوپیوں سوں مل رھی ھوں الفت اسے کہتے ھیں

اب ھم ایک مخمس لکھتے ھیں یہ نظم شاعر کے پرواز خیال اور زور بیان کی اچھی مثال ہے :

کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات
میں تیہ بندی توں کیا کہات

دل مرا اپنسے سات کیا
مج برہے میں دن رات کیا
سب بسرا سکھ ھیہات کیا
کنے مج سوں ایسی دھات کیا
کوئی جاؤ کہو مج ساجن ساتھ
میں تیہ بندی تو کیا گھات
پیوں مورت دیکھوں سپنے میں
جت جاگو تب رھوں سپنے میں
لا دییک برھا اپنسے مـیں
تن جائے جھک جھک جپنے میں
آرام اچھـے مج کھپنے میں
کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات
میں تیہ بندی تو کیتا کہات
مـج نیـنـوں نیـنـد آتی نہیں
یو رین کٹی سو جاتی نہیں
پیو باج مجھ کوئی ساتی نہیں
اس بات بن کچ بھاتی نہیں
بن افسوس تے کچ کھاتی نہیں

شاھی کے راج کلیات میں راگنیاں بھی ھیں ، مثمن بھی اور فارسی تاریخیں بھی ۔

قطب شاھی سلاطین نے اپنے معاصر حکمرانوں کی طرح جہاں پروری کے ساتھ ساتھ علم و فن کی سرپرستی کی بھی ایسی روایات قایم کی ھیں جو ھر حکومت و سلطنت کے لیے مایۂ ناز ھوسکتی ھیں قطب شاھی حکمران بھی زیور علم سے آراستہ تھے ۔ ادب و شعر کی اقلیم بھی ان کے زیر نگیں تھی ۔

اگر چہ قطب الملک کی پوری عمر اپنی حکومت کے

استحکام میں گذری ۔ پھر بھی ''آتش خانہ'' میں شعرا اور ادیبوں کے جمگھٹے اس کے دور حکمرانی کی یاد تازہ رکھیں گے۔

قطب الملک کے دوسرے بیٹے ابراھیم کا نام آج چار سو سال کے بعد بھی زندہ ھے ۔ اس نے رفاہ عام کے ساتھ ارباب علم کی جو سرپرستی کی ھے وہ تاریخ کے صفحات سے کسی طرح محو نہیں ھو سکتی ۔

فارسی کےساتھ دکھنی ادب نے اس کے زمانے میں خوب برگ و بار پیدا کیے ۔ فیروز ، محمود ، احمد اور وجہی دکھنی شاعری کے آسمان کے چند درخشاں ستارے ھیں ۔

ابراھیم کے بیٹے محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں گولکنڈہ فارغ البال تھا امن و امان قایم ھو چکا تھا ۔ اس کی بدولت ترقی و سر بلندی کے زینے اس کامیابی سے طے ھوئے کہ دنیا میں گولکنڈہ کا نام روشن سے روشن تر ھو گیا ۔ حیدر آباد کا شہر اس کی نزاکت طبع کی یادگار ھے ۔ چار مینار کی نادر روز گار عمارت اس فن کی بلندی کی گواہ عادل ھے ۔ اس کے ساتھ علمی رونق اور چہل پہل کی بھی ایک دوسری بستی آباد ھو گئی ۔

دکھنی زبان نے اب پھل پھول کر ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر لی ۔ گولکنڈہ کو یہ امتیاز حاصل ھے کہ اس کے سلاطین سب اعلیٰ تعلیم یافتہ اور علم دوست تھے ۔ انھوں نے دکھنی زبان کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا ، اس میں خود شاعری کی اور دواوین مرتب کروا کے اپنی یادگار چھوڑی ۔ '' قطب مشتری'' میں خود سلطان کی محبت و الفت کے سچے واقعے کو جس چابک دستی اور استادی سے زندگی دی گئی ھے وہ دکھنی ادب کی سحر نگاری کا ایک درخشاں کارنامہ ھے ۔ ملا خیال ، غواصی ، احمد ، سلطان وغیرہ جیسے باکمال ارباب نے آگے چل کر شہرت و نام آوری کا جو آواز بلند کیا وہ دراصل ثمرہ تھا اس فضا کا جو محمد قلی کے زمانے میں پیدا ھوچکا تھا ۔

اردو ، فارسی نظم لکھنا تو خیر اس زمانے کی اعلیٰ سوسائٹی کا

تمغۂ امتیازی تھا ، لیکن بادشاہ نے تلنگی میں بھی اتنی دست گاہ حاصل کر لی تھی کہ شعر کہنا آسان ہو گیا تھا ۔ تاریخوں سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ اس کے زمانے میں بھی تلنگی ادب کو بڑا عروج ہوا ۔ اس کو اپنے وطن تلنگانہ سے بڑی محبت تھی ۔ اس نے تلنگی زبان کی خاطر خواہ قدر اور مدد کی ۔ اس کے زمانے میں تلنگی زبان اور ادب کی بے شمار کتابیں لکھی گئیں ۔ محمد قلی فارسی اور دکھنی کے ساتھ ساتھ تلنگی زبان کا بھی شاعر تھا ۔ تاریخوں سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ اس نے تلنگی زبان کا بھی ایک دیوان مرتب کرایا تھا ۔ اگرچہ اب تک یہ دیوان ہم دست نہیں ہوا ہے ۔ مگر اس کی دکھنی شاعری میں اکثر تلنگی الفاظ ملتے ہیں ۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس کو تلنگی سے کس درجہ شغف تھا اس کی تلنگی سے محبت کا ثبوت بھی اس سے مل سکتا ہے کہ اس نے مقامی عیدوں ، تہواروں اور معاشرتی دلچسپیوں کا تذکرہ اپنی دکھنی شاعری میں کیا ہے ۔ بست کی عید ، موسم بارش کا آغاز یعنی مرگ کے متعلق کئی نظمیں لکھی ہیں ۔ اس نے تلنگی معشوقہ کا سراپا بھی دلچسپ طرز میں لکھا ہے ۔ ”پھو کڑی پیو“ تلنگی کھیل پر نظم لکھی ہے ۔ سلطان محمد قلی کے بعد بھی سلطان محمد اور عبداللہ نے تلنگی ادب کی سرپرستی میں حصہ لیا ، سلطان محمد قلی کے زمانے میں دکھنی ادب کو وہ عروج حاصل ہوا کہ خود بادشاہ کو بھی اس زبان میں شعر کہنا پسند خاطر ہوا اور کبھی قطب شاہ اور کبھی معانی تخلص کے ساتھ اس نے شاعری کی ۔

قطب شاہ کی دکھنی شاعری کو کئی خصوصیات حاصل تھیں اول تو یہ کہ وہ اکتسابی شاعر نہیں تھا ۔ بلکہ قدرت نے اس کو شاعری کا عجیب و غریب ملکہ عطا کیا تھا ۔ بہ قول سلطان محمد قطب شاہ اس نے پچاس ہزار دکھنی شعر موزوں کیے تھے۔ دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنی شاعری پر دوسرے شعرا کی طرح

فخر اور ناز نہیں کرتا تھا اور نہ اپنی تعریف میں اس نے کوئی شعر کہا تیسری خصوصیت یہ ہے کہ کوئی صنعت سخن ایسی نہیں ہے جس میں محمد قلی نے اپنا کمال نہ دکھایا ہو اور نہ کوئی موضوع ایسا ہے جس پر اس نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ قصیدے ، مثنویاں ، مرثیے ، رباعیاں ، غزلیں اور قطعے غرضیکہ ہر صنف کا وافر ذخیرہ اس کے کلیات میں موجود ہے۔ اسی طرح عاشقانہ مضامین ، عارفانہ نکات واقعہ نگاری اور رنگین بیانی کے بہتر سے بہتر نمونے اس کے یہاں ملتے ہیں۔ شاہی لوازم۔ درباری شان وشکوہ ، محلات کی رنگینیاں ، باغوں کی سر سبزی اور شادابی ، غریبوں کی زندگی ، عوام کے جذبات، عیدوں ، تہواروں ، کھیل کود ، تماشوں ، یادگاروں ، عیدوں اور مسلمانوں کے رسم و رواج غرضیکہ نیچرل شاعری کے بے شمار بیش بہا نمونے اس کے کلام میں ملتے ہیں۔ مناظر قدرت کی نیرنگیوں ، بزم کی رنگینیوں ، جشنوں کی طرب انگریزیوں کا وافر ذخیرہ اس کے کلام میں موجود ہے۔ پھر اس کی زبان کی شیرینی نور حلاوت قابل داد ہے۔ اس میں نہ عربی و فارسی کا عنصر زیادہ ہے اور نہ سنسکرت کا ، اس کا اسلوب نہایت سادہ اور رنگین ہے۔ اس کے کلیات سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد حاضر میں جس مشترک زبان کی کوشش کی جارہی ہے اس کو صدیوں پہلے محمد قلی قطب شاہ لکھ گیا ہے۔

اب ہم سلطان محمد قلی کا تذکرہ ختم کر کے اس کے جانشین سلطان محمد قطب شاہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ پرہیزگاری اور پاکیزہ زندگی کی جو حیرت انگیز مثال اس نے پیش کی ہے وہ گویا ایک عجوبہ ہے مکہ مسجد جیسی بلند پایہ عمارت تمدنی ارتقا کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ اس بادشاہ کا عہد قطب شاہی دورحکومت کا نقطۂ عروج ہے۔

سلطان محمد خود مصنف تھا دوکتابیں اس نے فارسی میں لکھی ہیں۔ یہ شاعر بھی تھا فارسی اور دکھنی میں اس نے طبع آزمائی کی

ظل اللہ اس کا تخلص تھا ۔ اس کے دربار کے دکھنی کو شعرا میں غواصی ، راضی ، ابن نشاطی اور جنیدی وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔ انھوں نے دکھنی ادب کو بام عروج پر پہنچا دیا ۔ افسوس ہے کہ اس کا کلیات اب تک ہم دست نہیں ہوا ہے ۔

اب ہم عبد اللہ قطب شاہ کے زمانے میں پہنچ جاتے ہیں ۔ یہ زمانہ گولکنڈہ کے امن و امان کا آخری زمانہ تھا ۔ علم و فن کی سرپرستی میں اس نے بھی اپنے اسلاف کا نمونہ پیش کیا ۔

سلطان عبد اللہ کے عہد میں اعلیٰ حلقوں میں شعر و سخن کا چرچا بہت بڑھ گیا تھا ۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ رات رات بھر خود سلطان کی موجودگی میں مشاعرہ ہوتا تھا ۔ سہ شنبہ کے دن (جو عام تعطیل کا دن قرار دیا گیا تھا) بادشاہ کا مشغلہ یہ تھا کہ شعر و سخن سے لطف اندوز ہوتا اور قدما کے کلام پر نقد و تبصرہ بھی کراتا ۔

سلطان عبد اللہ کے زمانے میں دکھنی ادب کی بڑی سرپرستی ہوئی اور دکھنی ادب کا بول بھی بالا سے بالا تر ہو گیا۔ ''سب رس'' ''سیف الملک و بدیع الجمال'' ، ''طوطی نامہ'' ، ''چیدا ولورک'' ، ''ماہ پیکر'' ، ''پھول بن'' اور ''بہرام گل اندام'' ، کو لکھنے والے دماغوں نے تخیل کی پرواز ، زبان کی سلاست اور اسلوب کی روانی کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا ۔ قصیدہ نگاری نے بھی اب بہت اہمیت حاصل کر لی تھی ۔ ماہ محرم میں عزاداری کی مجلسوں میں دکھنی مرثیوں ، نوحوں اور سلاموں کا رواج عام ہوگیا تھا ۔

اس فضا میں خود بادشاہ کو بھی شوق سخن پیدا ہونا ناگزیر تھا اور پھر شعر گوئی اس کے باپ دادا کی سنت بھی تھی فارسی کے ساتھ دکھنی زبان میں بھی اس نے شعر کہے ہیں ۔ اس کا ایک مختصر دیوان نواب سالار جنگ کے کتب خانے میں موجود ہے ۔ اور اب شائع ہو گیا ہے ۔ سلطان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ

اس میں وھی مضامین ھیں جو اس کے نانا سلطان محمد قلی کے یہاں ملتے ھیں ۔ وھی تغزل بھی اور وھی تصوف بھی ۔ واقعہ نگاری کا نمونہ بھی ملتا ھے ۔ البتہ زبان میں صفائی اور شستگی زیادہ آ گئی ھے ، لیکن سلطان محمد قلی کی طرح وہ پرگو شاعر نہیں تھا ۔ اس لیے مختصر دیوان اس کی یادگار ھے ۔

آخر میں قطب شاھی تاج دار ابوالحسن تانا شاہ کے زمانے میں قطب شاھی حکومت کا شیرازہ بکھر گیا اور ھر طرف شورش و بے اطمینانی پیدا ھوگئی ۔ با لآخر اس سلطنت کا خاتمہ ھو گیا مگر شعر و سخن کا چرچا سرد نہ ھوا ۔ لطیف کا "ظفر نامہ" ، غلام علی کی "پدماوت" اور سیوک کا "جنگ نامہ" اس زمانے کی پیدا وار ھیں ۔ سلطان نے بھی شعر کہے ھیں مگر اب تک کوئی مرتب مجموعہ ھم دست نہیں ھوا ۔

آپ پر یہ امر واضح ھوگیا کہ دکھنی ادب کی ترقی اور ارتقا میں اگر ایک طرف معمولی شہریوں نے اپنی کوشش کا حق ادا کیا ھے تو دوسری طرف خود شاھان وقت نے بھی برابر سعی کی ھے ۔ ان کی کوشش اور سرپرستی نے ھی اس کو دکن میں پروان چڑھایا ۔

حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے اردو کارنامے

نواب حیدر علی سنہ ۱۷۶۱ ع میں میسور کی ریاست کے والی بنے اور اکیس سال کی فرماں روائی کے بعد ملک جاودانی کی راہ لی ۔ سنہ ۱۷۸۲ ع میں ٹیپو سلطان مسند حکومت پر جلوہ گر ھوئے ۔ سترہ سال تک جاہ و جلال ، شوکت و عظمت اور کافی طمطراق کے ساتھ حکمرانی کر کے سنہ ۱۷۹۹ ع میں جام شہادت نوش فرمایا ۔ اس طرح دولت خدا داد کا زمانہ صرف اڑتیس (۳۸) سال ھے اور پھر اس مدت میں بھی امن و امان نصیب نہیں ھوا ۔ اطمینان اور فارغ البالی سے حکمرانی کا موقع نہیں ملا ۔ ھر وقت کشت و خون سے سابقہ رھا ،

میسور کی فضا ہمیشہ مکدر رہی ، جنگ و جدل کے بادل منڈلاتے رہے اور توپ و تفنگ کی گرج کے ساتھ خون کی بارش ہوتی رہی۔ اس کے باوجود یہ امر تعجب سے خالی نہیں ہے کہ نواب حیدر علی اور ٹیپو سلطان نےعلم و ہنر کی بھی سر پرستی فرمائی اور علوم و فنون کو رائج کرنے میں بہت کچھ جوہر دکھائے ان کے فیض و کرم سے بیسیوں ارباب علم و فضل متمتع ہوئےان کی سرپرستی میں بےحساب شاعروں ، ادیبوں اور مصنفوں نے کتابیں لکھیں ۔ جو آج بھی تشنگان علم کے لیے آب حیات سے کم نہیں ہیں ۔ یہ موقع نہیں ہے کہ ہم دولت خدا داد کی علمی سر پرستیوں اور ان کے علمی کارناموں کی تفصیل بیان کریں ہم صرف ان کے کارناموں پر مختصر تبصرہ کرتے ہیں ۔ یقین ہے کہ موجب دل چسپی ہوگا ۔

اگرچہ دولت خدا داد کے زمانۂ حکمرانی میں جنوبی ہند یا دکن کے ایک بڑے حصے میں عام طور پر اردو یا دکنی مروج تھی اور دکن کے اکثر حصوں میں دکنی زبان جاننے والے موجود تھے ۔ لیکن پھر بھی دکنی زبان کسی ریاست کی سرکاری زبان نہیں تھی ۔ دکن کی عظیم الشان اسلامی سلطنتیں قطب شاہی اور عادل شاہی وغیرہ کو صفحۂ ہستی سے مٹے ہوئے عرصہ ہوچکا تھا ۔ ان سلطنتوں کی علمی قدر دانی اور دکنی شاعروں اور ادیبوں کی سر پرستی معدوم ہو کر افسانہ بن چکی تھی ۔ شمال میں مغلیہ حکومت کا چراغ گل ہو رہا تھا ۔ شیرازۂ مملکت بکھرگیا تھا ۔ طوائف الملوکی پھیل گئی تھی۔ سلطنت آصفیہ اور سلطنت خدا داد کی سرکاری زبانیں فارسی تھیں ۔ علمائے وقت عموماً فارسی زبان میں اپنی تصانیف کرتے تھے اور پھر جو اهل علم دنیا سےگزر رہے تھے ان کی جگہ پر کام کرنے والا نظر نہ آتا تھا ۔ اردو یا دکھنی زبان بازاری زبان تصور کی جاتی تھی ۔ اس میں علمی ذخیرہ بہت کم بلکہ نایاب تھا ۔ دانایان فرنگ ہنوز اردو کی سر پرستی کی جانب متوجہ نہیں ہوئے تھے نہ تو

کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کی تصانیف شائع ہوئیں تھیں اور نہ شاہ عبدالقادر نے قرآن شریف کی تفسیر قلمبند کی تھی - لیکن اس کے باوجود سلطنت خدا داد کے بعض اردو کارنامے تاریخ اردو میں آب زر سے لکھے جائیں گے نواب حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے اردو زبان میں بعض ایسی یادگاریں چھوڑی ہیں جن کو نہ زمانہ مٹا سکتا ہے اور نہ حوادثات محو کر سکتے ہیں -

سلطنت خداداد کے اردو کارناموں کو ہم مختلف عنوانوں کے تحت بیان کر سکتے ہیں - مثلاً شاعری ، نثر نگاری ، فوجی قواعد و ضابطہ میں اردو کی ترویج ، معاشرت اور رسم و رواج میں اردو کا دخل اور موسیقی میں اردو کا استعمال وغیرہ -

شاعری :

اردو دکھنی شاعری کی ابتدا اور اس کی ترقی سے یہاں بحث مقصود نہیں ہے - یہ ہم کو معلوم ہے کہ دکن میں آٹھویں صدی ہجری یا تیرھویں صدی عیسوی سے دکھنی شاعری کے آغاز ہونے کا ثبوت موجود ہے - اس طرح دولت خدا داد کے زمانے میں دکھنی شاعری کی عمر تقریباً ساڑھے تین سو سال کی ہو چکی تھی - دکھنی مثنویوں کا وافر ذخیرہ فراہم ہو چکا تھا - یہ مثنویاں رزم و بزم ، تصرف و فلسفہ ، اخلاق و موعظت ، افسانہ و حکایت ، نیچر اور معاشرت وغیرہ عنوانوں پر حاوی ہیں - جن کی تفصیلی وضاحت میں نے اپنے دوسرے مضامین میں اور کتابوں میں کر دی ہے - اس کے علاوہ اس زمانے میں دکن کی ایک جدید شاعری ریختی غزل گوئی کی ابتدا بھی ہو چکی تھی - ولی کا زمانہ گزر چکا تھا - سراج اور ان کے تلامذہ کا دور دورہ تھا حسن و عشق اور تصوف کی گرم بازاری تھی -

ادھر شمالی ہند میں بھی اب فارسی کے بجائے اردو شاعری

سے دل چسپی پیدا ہو چکی تھی ، میر ، سودا ، مظہر ۔ حاتم اور درد وغیرہ کی شاعری پسندیدہ نظروں سے دیکھی جاتی تھی ۔ مگر اس شاعری کا موضوع حسن و عشق ، شاهد و ساقی اور گل و بلبل کے دائرے تک محدود تھا ۔ البتہ دکن میں دکھنی شاعر مختلف نہج پر اظہار خیال کرنے کے عادی تھے ۔ ان کی شاعری کے موضوع ہمہ گیر رہے ہیں ۔ انہوں نے زندگی کے ہر پہلو کی تصویر دکھنی شاعری میں کھینچی ہے ۔ اگر عشق و محبت کی رویدار میں حسن و رعنائی کا اظہار کیا ہے تو وہیں میدان جنگ کے داروگیر کا صحیح نقشہ بھی پیش کر دیا ہے ۔ اگر ان کے کلام میں تصوف اور عرفان جلوہ گر ہے تو وہیں انہوں نے فلسفے کو بھی نہیں چھوڑا ہے ۔ گھریلو زندگی کے روزمرہ واقعات کی حکایت بیان کی ہے تو وہیں مناظر قدرت کی دل نواز سحر طرازیاں ان کے یہاں ملتی ہیں ۔ تاریخ اور سوانح کو بھی انہوں نے نظر انداز نہیں کیا اور پھر اخلاق اور پند میں بھی اظہار خیال سے اپنے نقش بٹھائے ہیں ۔ بہر حال دکنی شاعری کے موضوع ہمہ گیر رہے ہیں ۔ میسور بھی دکن میں شامل ہے ۔ یہاں کے شاعروں نے بھی ان ہی موضوع میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور اپنے افکار کے نتائج مرتب کیے ہیں ۔ اس زمانے کے جن شعرا سے ہم واقف ہیں ان کے اسماے گرامی یہ ہیں ۔ عاصی ، خادم ، فقیر ، شہباز ، میر حسین علی ، محمود ، شاکر ، کمال ، حسین ، زین العابدین عزت ، طرف ، اسحاق ، خانہ زاد اورکرمان وغیرہ کا کلام ہماری کتابوں میں ، مدارس میں ، اردو ادب میں، دکنی مخطوطات اور ڈاکٹر حبیب النسا بیگم کی تالیف ''ریاست میسور میں اردو کی ترقی'' میں موجود ہے ۔ ان شاعروں نے اس وقت کے رواج کے مطابق مثنوی ، غزل ، مرثیہ اور قصیدہ میں اظہار خیال کیا ہے ۔ ان کے موضوع ۔ تاریخ ۔ رزم و بزم ، عقائد و اخلاق اور عشق و محبت وغیرہ ہیں ان شعرا میں خصوصیت

سے زین العابدین عزت ، عباد اللہ ، اسحاق اور کمال خاص طور پر قابل تذکرہ ہیں عزت نے ''فتح نامہ'' کے نام سے ایک مثنوی لکھی ہے ۔ جس کا ایک مخطوطہ انڈیا آفس لندن میں محفوظ تھا ۔ اس مثنوی میں ٹیپو سلطان کی ایک جنگ کے حالات نہایت تفصیل سے نظم کیے گئے ہیں ۔ فوجوں کا کوچ ، مقابلہ کی کیفیت ، میدان جنگ کا نقشہ، لڑائی کا حال ، جنگ کا خاتمہ اور صلح کی گفتگو وغیرہ امور کو نہایت عمدگی سے بیان کیا گیا ہے ۔

زین العابدین نے فوجی نغموں کی صراحت کی ہے ۔ عباد اللہ نے علم موسیقی پر اظہار خیال کیا ہے ۔ ان دونوں کا مزید تذکرہ آگے آتا ہے ۔ اسحاق کی تصانیف ''ریاض العارفین'' ایک مشہور و معروف مثنوی ہے جس میں تصوف اور اخلاق پر بہترین مواد فراہم کیا گیا ہے ، عاصی ۔ خادم اور کمال وغیرہ کی غزلیں شہرت رکھتی ہیں ۔ جو نازک خیالی ، بلندیٔ تخیل اور رنگینی وغیرہ کے لحاظ سے قابل داد ہیں ۔

نثر نگاری

دکن کے ابتدائی دور میں نثر سے زیادہ نظم نگاری پر توجہ کی گئی ہے ۔ اس لیے ہم کو نثاروں سے زیادہ شاعروں کا حال معلوم ہے ، اور ان کے نتائج افکار بھی بہت کچھ محفوظ ہوگئے ہیں ۔ اس کے برخلاف نثر نگاری کی جانب اتنی توجہ نہیں کی گئی تھی ۔ مگر یہ صحیح ہے کہ ہر صدی میں ہم کو نثر نگار بھی ملتے ہیں ۔ جن کی کتابیں اردو ادب کا مایۂ ناز سرمایہ کہی جاسکتی ہیں ۔ دکھنی نثر نگاری کی کتابیں مختلف موضوع پر ملتی ہیں تفسیر ، ترجمہ قران ، تصوف ، فقہ ، حدیث اور عقاید کے ساتھ ساتھ ادب پر بھی دکھنی نثر کی کتابیں دستیاب ہوتی ہیں اگرچہ سلطنت خداداد کے پہلے دکھنی نثر کی گئی بلند پایہ کتابیں تصنیف ہو چکی تھیں ۔ ''احکام الصلوٰن ''شمائل الاتقیا''

"سب رس" ، "معرفت" ، سکوک اخلاق ھندی وغیرہ مرتب اور مدون ھو چکی تھیں لیکن پھر بھی سلطنت خداداد کے زمانے کی تین کتابیں نظر انداز نہیں کی جاسکتیں ۔

(١) حیدر نامہ :۔ افسوس ھے کہ ھم اس کے مصنف کے نام سے واقف نہیں ھیں ۔ لندن میں اس کے دو مخطوطات محفوظ تھے ۔

دکھنی زبان میں فن تاریخ کی یہ پہلی کتاب ھے جو نواب حیدر علی کے زمانے میں ان کی سرپرستی میں لکھی گئی ھے ۔ انڈیا آفس کے نسخے میں حیدر علی کے حالات پر یہ کتاب ختم ھو جاتی ھے ۔ اس کے بعد معلوم ھوتا ھے کہ کتاب کا تکمیلہ کیا گیا ۔ چنانچہ برٹش میوزیم میں جو نسخہ تھا اس میں ٹیپو سلطان کی شہادت تک کے واقعات درج ھیں ۔ افسوس ھے کہ جس طرح اس کتاب کے مصنف کے نام سے واقفیت نہیں ھے اسی طرح ھم کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کا تکمیلہ کس نے کیا ھے ھو سکتا ھے کہ خود مصنف اول نے تکمیلہ بھی کیا ھو کتاب معتبر تاریخی دستاویز کہی جا سکتی ھے ۔

(٢) بہادر نامہ :۔ اس کتاب کی تصنیف سنہ ١١٩٦ع اور سنہ ١٢١٢ع کے درمیان ھوئی ھے اس کے مصنف سے بھی ھم واقف نہیں ھیں یہ بھی ایک تاریخی کتاب ھے اس میں ٹیپو سلطان کی تخت نشینی تک کے حالات کا تذکرہ ھے ۔ حیدر آباد کے دفتر دیوانی مال کے کتب خانے میں اس کتاب کا مخطوطہ موجود ھے ۔

(٣) خلاصۂ سلطانی :۔ اس کتاب کا دوسرا نام "احکام النسا" ھے ۔ اس کے مصنف قاضی غلام احمد ھیں ۔ جو ٹیپو سلطان کے زمانے میں سرنگ پٹن کے قاضی تھے ۔ یہ فقہ کی کتاب ھے لیکن اس کے ساتھ عقاید کا بھی تذکرہ ھے ۔ انگلستان میں اس کے دو نسخے موجود تھے ۔

فوجی قواعد وضابطے میں اردو کی ترویج

فوجی قواعد میں اردو کی ترویج ٹیپو سلطان کا ایک بہت بڑا اردو کا کارنامہ ہے جو تاریخ اردو میں آب زر سے لکھا جائے گا۔ ٹیپو سلطان کے زمانے میں انگریزوں اور فرانسیسوں کی فوج دیسی فرماں رواؤں کی فوج سے بازی لے جاتی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ اول الذکر فوج قواعد اور ضوابط کے تحت کام کرتی تھی اس کے بر خلاف ثانی الذکر فوج بے قاعدہ تھی۔ جنگ کے موقع پر عموماً باقاعدہ فوج کو کامیابی حاصل ہوتی تھی۔ ٹیپو سلطان نے اس نقص کو معلوم کیا اور فوج کی تعلیم و تربیت اور فنون حرب کے لیے یورپین قواعد کی خوبی معلوم کی اور اس کو فارسی زبان میں منتقل کر دیا۔ فوجی اصطلاحات، طریقۂ جنگ اور معرکہ آرائی وغیرہ کے متعلق ایک کتاب ''فتح المجاہدین'' کے نام سے مرتب کرائی اس کے مصنف زین العابدین ہیں۔ ''فتح المجاہدین'' میں فوجی نغموں کا بھی تذکرہ ہے۔ مختلف اوقات کے لیے علیحدہ علیحدہ فوجی راگ بنائے گئے ہیں۔ تاکہ فوج کے ارگن میں اس نغمے کو گایا جائے۔ اس کے لیے جو نظمیں مقرر کی گئیں ہیں وہ دکھنی یا اردو میں ہیں۔ یہ کتاب سنہ ۱۱۹۶ ہجری میں مرتب ہوئی۔

معاشرت اور رسم و رواج میں اردو کا دخل

ٹیپو سلطان نے اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا انھوں نے مسلمانوں کی معاشرت کی اصلاح کرنی چاہی اور شادی بیاہ کے رسومات کی اصلاح کے متعلق ایک ضابطہ مقرر کیا اور احکام نافذ کیے۔ ان کو اس امر کا بڑا خیال تھا کہ مسلمانوں کی معاشرت کی فوری ترمیم کی جائے۔ بلا ضرورت رسم کے اخراجات اور غیر ضروری

مصارف کی بیخ کنی ہو جائے چنانچہ اس کے مدنظر دستور العمل بتایا تھا اس میں ان رسومات کا تذکرہ کیا گیا ہے جو شادی کے موقع پر ہونے چاہییں ۔ اس ''رسالہ'' یا دستور العمل کے نافذ کرنے کی وجہ بھی بتائی گئی ہے ، چنانچہ دیباچہ کا مختصر اقتباس حسب ذیل ہے ۔

''یہ رسالہ اس غرض سے مرتب کیا گیا ہے کہ سابق میں مسلمانان ہند و دکن شادی کد خدائی کی رسمیں اہل ہند کے مطابق ادا کرتے تھے ۔ اور اس میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے تھے ۔ سلطان نے ان رسموں کو منسوخ کر کے چند امور مطابق شرع شریف ، حدیث نبوی و رسم شرفا و نجبا مقرر کیے ہیں تاکہ تمام خواص و عوام حسب ضابطہ عمل کریں'' ۔

اس رسالے میں جو گانے ہیں وہ اردو یا دکھنی ہیں ۔

موسیقی میں اردو کا استعمال

ٹیپو سلطان کو موسیقی سے نہ صرف دلچسپی تھی بلکہ وہ فن موسیقی سے بھی واقف تھے ۔ اس کمال فن کے باعث ان کی سرپرستی میں فن موسیقی پر ایک کتاب سنہ ۱۱۹۹ ھ میں لکھی گئی ہے اس کا نام ''مفرح القلوب'' ہے ۔ انڈیا آفس کے کتب خانے میں اس کے نو نسخے موجود تھے ۔ اس کے مصنف عباد اللہ ہیں ۔ کتاب کی ابتدا میں ایک فارسی دیباچہ بھی ہے ، جس میں اس امر کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ ٹیپو سلطان کے حسب خواہش یہ کتاب مرتب کی گئی ہے ۔ اس میں موسیقی کے قواعد اور ضوابط کے ساتھ راگ اور راگنیوں اور نغموں کے متعلق روشنی ڈالی گئی ہے اور پھر راگ کے تحت غزلوں کو لکھا گیا ہے ۔

اس کتاب کے دیباچہ میں اس امر کو واضح کیا گیا ہے کہ

"مفرح القلوب" کی تصنیف کیوں کرائی گئی ہے ۔ دیباچہ کا مختصر ترجمہ حسب ذیل ہے ۔

"چونکہ دین اور دنیا جسم و جان لازم و ملزوم ہیں ۔ اسی طرح حرب اور ضرب بھی ایک دوسرے کے ساتھ جزو لاینفک کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ حرب یعنی لڑائی کے متعلق ایک کتاب مرتب ہو چکی ہے اس لیے اب ضرب یعنی موسیقی کے متعلق یہ کتاب مرتب کی جاتی ہے" ۔

تبصرہ

صفحات گذشتہ میں نواب حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے اردو کارناموں کا مختصر طور پر تذکرہ ہوچکا ہے ۔ گو یہ صحیح ہے کہ گولکنڈہ کے سلاطین قطب شاہی اور بیجاپور کے سلاطین عادل شاہی کی طرح ان کے اردو کارناموں کی فہرست طویل نہیں ہے ۔مگر جب ہم ان کے مختصر دور حکمرانی اور پھر ان کے مصائب اور دشواریوں پر نظرکرتے ہیں تو ہم کو ماننا پڑتا ہے گا کہ انھوں نے جو کچھ کیا وہ بہت زیادہ ہے ۔ اس میں شک نہیں ہے کہ ان کے زمانےمیں بعض جدید کارنامے اردو کی ترقی اور ارتقا کے لیے عمل میں لائے گئے انھوں نے علم و ہنر کی سرپرستی کی اور خصوصیت سے اردو یا دکھنی شاعروں ، ادیبوں اور مصنفوں کو نہال کیا ۔ ان کے زمانے میں شاعروں ، ادیبوں اور مصنفوں نے باوجود حوادثات گونا گوں اور مصائب نا متناہی کے اپنے کام میں مصروفیت رکھی ۔ اپنے کارناموں کو یادگار زمانہ چھوڑا ۔ ان کا کلام خواہ نظم ہو یا نثر وہ آج بھی باوجود بیسیوں حوادثات کے موجود ہے جو قابل ستایش اور لایق داد ہے ۔

اردو کی سرپرستی سے اس امر کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نواب حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی شخصیت ہمہ گیر تھی ۔

جوں جوں ان کے کردار اور کارھائے نمایاں پر سے پردہ اٹھتا جاتا ھے ھمارا تعجب اور احترام بڑھتا جاتا ھے ۔ ڈاکٹر حبیب‌النساء بیگم نے اپنی کتاب ”ریاست میسور“ میں اردو کی ترقی پر تفصیلی روشنی ڈالی ھے ۔

دکن میں ادب یعنی شاعری ، افسانہ نگاری اور ڈرامہ وغیرہ کو جو ترقی ھوئی اس کی صراحت تاریخ ادبیات کی کتابوں میں مفصل درج ھے ۔ چنانچہ راقم نے ”دکن میں اردو “۔ ”مدراس میں اردو“ ڈاکٹر حبیب النساء بیگم نے ”ریاستِ میسور میں اردو“ میں صراحت کی ھے ۔اس کے علاوہ کئی دوسری کتابوں میں نہ صرف شاعری بلکہ ادب کی دوسری شاخوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ھے ۔ اس لیے اس کی صراحت غیر ضروری بلکہ طوالت کا موجب ھوگی ۔

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ھے کہ اصناف سخن کے تمام اقسام کو ترقی ھوئی ، مثنوی ، قصیدہ ، غزل ، رباعی ، قطعہ ، مخمس اور مسدس غرض کوئی صنف سخن ھو اس کی ترقی ھوئی اور ان کا معیار بلند سے بلند تر ھوتا گیا ۔ قدیم طرز کی شاعری کے ساتھ ساتھ جدید طرز کی شاعری کو نئے رجحانات کے ساتھ پھلنے پھولنے کا موقع ملا ۔

دکن کے بڑے بڑے شہروں مثلاً حیدر آباد ، بنگلور ، میسور ، مدراس ، بمبئی ، اورنگ آباد وغیرہ سے قطع نظر دوسرے حصوں میں بھی شعرا نے نام اور نمود حاصل کیا ۔ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی میدان شاعری میں اپنا لوھا منوانے لگیں ۔ شاعری کے ساتھ ناول نگاری اور افسانہ نگاری وغیرہ میں جو ترقی ھوئی ھے وہ تاب ناک ھے ۔ بہر حال کلچر کے اس شعبے میں دکن نے جو کام کیا ھے وہ مٹ نہیں سکتا ۔

شاعری ، ناول نگاری اور افسانہ نگاری میں دکن کے شاعروں ، ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں کے تخیلات ادب کے گران بہا اور

انمول نگینے تصور کیے جا سکتے ہیں۔

ڈراما نگاری

شاعری ، ناول نگاری اور افسانہ نگاری سے قطع نظر ڈراما نگاری میں دکن کا حصہ اگرچہ درخشاں نہیں ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میدان میں دکن نے کوئی نقش نہیں چھوڑا ہے۔ حیدر آباد ، بنگلور اور بمبئی وغیرہ کے ڈراما نگار اپنے قلم کے شہ کار پیش کر چکے ہیں۔ قلم کے لیے دکنی ڈراما نگاروں نے بہتر سے بہتر ڈراما لکھ کر دنیائے اردو میں اپنا مقام بنا لیا ہے۔

اس باب میں جو روشنی ڈالی گئی ہے اس سے یہ واضح ہو سکتا ہے کہ کلچر کے اس سلسلے میں دکن کے مسلمانوں نے اچھے نقش ثبت کیے ہیں جس کو زمانہ مٹا نہیں سکتا اور حوادثات محو نہیں کر سکتے ہیں۔ موسیقی کے متعلق ایک مستقل باب میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

حیدرآباد کی قدیم ادبی محفلیں

حیدرآباد آج سے تقریباً چار سو سال پہلے آباد ہوا تھا اس کی ادبی محفلوں اور علمی صحبتوں کا تذکرہ ضخیم مقالوں میں قلم بند ہوسکتا ہے یہاں ہم مختصر طور پر مختلف دور کا تذکرہ سناتے ہیں۔

پہلے قطب شاہی دور کی داستان سنائی جاتی ہے۔ ہم کو یہ معلوم ہے کہ قطب شاہی بادشاہ خود صاحب علم بھی تھے اور علم و ہنر کے سرپرست اور قدر دان بھی۔ ان کے دربار نہ صرف شان و شوکت کے دربار ہوتے تھے بلکہ وہ علم و فن اور ادب و شعر کی محفلیں بھی منعقد کرتے تھے۔ محمد قلی قطب شاہ نے جہاں شہر حیدر آباد کی آبادی اور چہل پہل کی طرف توجہ کی وہاں علمی رونق کے لیے بھی اس کا

زمانہ یادگار ہے ۔ میر محمد [مومن استر آبادی ، مرزا محمد امین سیستانی اور میرک معین الدین سبز واری کی وجہ سے اکثر علمی اور ادبی محفلیں ہوتی تھیں اور قابل ترین اشخاص اس میں حصہ لیتے تھے ۔[1]

سلطان محمد کا جانشین سلطان محمد جو اس کا داماد اور بھتیجا تھا مکہ مسجد کی تعمیر کی وجہ سے ہمشہ تاریخ میں زندہ رہے گا۔ سلطان محمد کو علم و فن سے خاص دلچسپی تھی ۔ اس کا زمانہ ادبی محفلوں اور علمی مجلسوں کے باعث ہی شہرت رکھتا ہے ۔ اس کے فرزند عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں ادبی محفلوں کی جو ترقی ہوئی اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ رات رات بھر خود بادشاہ کی موجودگی میں مشاعرہ ہوتا تھا ۔ منگل کے دن جو عام طور سے تعطیل کا دن تھا ۔ اس دن بادشاہ کا مشغلہ صرف یہ تھا کہ شعر و سخن سے لطف اندوز ہوتا اور قدما کے کلام پر تنقید اور تبصرہ عمل میں لاتا ۔[2] اس کے زمانے کے علما میں علامہ نظام الدین احمد وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔ علامہ ابن خاتون اگرچہ وزیر اعظم کی اہم خدمت پر مامور تھے مگر اس کے ساتھ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا ۔ ان کا دولت خانہ ایک طرف حکومت قطب شاہی کا باب حکومت تھا تو دوسری طرف تصنیف و تالیف درس و تدریس کی وجہ سے دارالترجمہ اور یونیورسٹی بنا ہوا تھا ۔ رات دن علمی ادبی محفلیں منعقد ہوتی رہتیں تھیں ۔ بحث و مباحثے کا بازار گرم رہتا تھا ۔ نہ صرف عربی فارسی اور دکنی شاعری پروان چڑھی بلکہ تاریخ ، فلسفہ ، ریاضی ، منطق اور ادب کی کتابیں بھی مرتب ہوتی تھیں ۔ اس موقع پر یہ

۱۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ ۔

۲۔ تاریخ گولکنڈہ ۔

بھی یاد رہے کہ اس زمانے میں صرف فارسی اور دکھنی کی سرپرستی نہیں ہوتی تھی بلکہ ساتھ ساتھ تلنگی ادب کی بھی سرپرستی ہوئی۔ اس دور کے کئی تلنگی شعرا سے ہم واقف ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تلنگی ادب کا سنہرا دور در اصل قطب شاہی بادشاہوں کا زمانہ ہے۔

قطب شاہی دور کا ایک امیر امین الملک تھا۔ اس کا باغ آج بھی سرکاری زچگی خانہ کی صورت میں موجود ہے۔ اس امیر کا متوسل ایک تلنگی شاعر "پوتی گنتی تلگنا" اپنی ایک تلنگی نظم میں لکھتا ہے۔

"میرے جسم پر خوشبوئیں لگائی گئیں، ایک نہایت عمدہ کیسری رنگ کی شال کندھوں پر ڈالی گئی، جواہرات کا ایک ڈبہ جس میں لعل تھے مجھے دیا گیا اور اس کے بعد نظم سنانے کی فرمایش کی گئی"۔

سلاطین قطب شاہی کے آخری بادشاہ ابوالحسن تانا شاہ کے زمانے میں بھی علمی صحبتیں بد ستور باقی تھیں۔ بادشاہ اور امراء علم کی سرپرستی اور ادب کی قدر دانی کرتے تھے۔ شعرا اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی ہوا کرتی تھی۔ ان کے قصر اور ایوان نہ صرف دولت و ثروت کے خزانے تھے بلکہ علم و فن اور شاعری اور ادب کے مرکز بھی بنے ہوئے تھے۔

قطب شاہی دور کے بعد کچھ عرصے تک حیدرآباد کی علمی محفلوں اور ادبی مجلسوں پر اوس پڑگئی۔ مگر پھر بارھویں صدی ہجری سے علمی چہل پہل اور ادبی رونق دوبالا ہوگئی ارسطو جاہ، شمس الامرا، مہاراجا چندو لال کی قدر دانی اور داد و دھش سے علمی چمن کی آب یاری ہونے لگی۔ بازار علم پر رونق آ گئی اور شعر و سخن کی ایک نئی بستی آباد ہوگئی۔

ارسطو جاہ کے دربار سے تقریباً دو سو شعرا وابستہ تھے۔ ان

کے قصائد اور تاریخی قطعات ضخیم مجموعے کی صورت میں آج تک باقی ہیں اور ادب کا انمول خزانہ ہیں۔ ارسطو جاہ کا ایوان علامہ ابن خاتون کی طرح ایک طرف حکومت کا باب حکومت بنا ہوا تھا تو دوسری طرف شعرا کی وجہ سے بزم شعر و سخن اور محفل ادب کا مرکز بھی تھا۔ شمس الامرا نے جو جاگیرات پائیگاہ کے امیر جو مغربی زبانوں میں انگریزی اور فرالسیسی سے بھی واقف تھے، ایک دارالترجمہ قائم کیا تھا۔ جہاں سائنس کی کتابیں ترجمہ ہوتیں، طبع ہوتیں اور ان کی تعلیم ان کے مدرسۂ فخریہ میں ہوتی تھی۔ شمس الامراء کے گرد و پیش شعرا، ادبا، فلاسفر، مورخ اور ریاضی دانوں کا جمگھٹا ہوتا تھا جس میں ہندو مسلم انگریز اور فرانسیسی شامل تھے[۲]۔ مہاراجا چندو لال کا دربار بعد مغرب ہوتا تھا۔ جس میں فارسی اور اردو کے بلند پایہ شعرا جمع ہوتے۔ ایران کے فارسی گو شعراً کے ساتھ شمالی ہند اور دکن کے اردو کے نامور شعرا بھی ہوتے تھے۔ مشاعرے ہوا کرتے، تنقیدیں ہوتیں اور مناظرے ہوتے تھے۔ مہاراجا نے شعرا کو بیش قرار ماہوار تنخواہ جاری کی تھی۔ چنانچہ ہزار ہزار پانچ پانچ سو روپیہ ان کو تنخواہ ملتی تھی۔

اس زمانے کے اکثر امیر اور جاگیر دار یہ ضروری سمجھتے تھے کہ اگر ایک طرف فوج کے لیے اہل سیف، بہادر اور شجیع مرد میدان جمع کیے جائیں تو دوسری طرف علم و فن کی ترقی کے لیے شعراء اور اہل ہنر کی سر پرستی ہوتی رہے۔ ایسے بیسیوں اصحاب کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں مگر یہاں ہم صرف دو نام پیش کرتے ہیں ایک راجا شیو پرشاد جن کے مداحی قصیدے

۱۔ ارسطو جاہ۔
۲۔ شمس الامراء کے علمی خدمات۔

"مجموع المداح" میں محمد یوسف خان سبحی نے جمع کیے ہیں اور دوسرے محمد سبحان خان جن کے رزم اور بزم کے حالات مرزا محسن محسن نے "اوصاف سبحان خان" کے نام سے نظم میں لکھے۔ اس زمانے کے ایک صاحب فن امیر عبد الولی عزلت کو یہاں فراموش نہیں کیا جا سکتا جو شاعری، موسیقی اور مصوری میں کمال رکھتے تھے اور ان فنون کی تعلیم دیتے تھے۔ ان کا مکان ہر وقت محفل شعر و سخن و بزم طرب و نشاط اور تصویر گاہ بنا رہتا تھا۔ اور تو اور اس زمانے کی مشہور ڈیرہ دار طوائف ماہ لقا بائی چندا کا ذکر بھی اس لیے ضروری ہے کہ اس کا دولت کدہ ہمیشہ ادبی محفل بنا رہتا تھا۔ اس نے اپنی سرپرستی سے جو تاریخ دکن مرتب کرائی تھی وہ آج تک "تاریخ دل افروز" کے نام سے موجود ہے اور معتبر تاریخوں میں شمار ہوتی ہے۔ وہ صاحب دیوان شاعرہ تھی اس کے یہاں روزآنہ سہ پہر میں محفل ادب منعقد ہوتی تھی اس وقت کے اکثر شعرا اور اہل فن جمع ہوتے اور داد سخن دیتے تھے۔ مغرب تک یہ محفل رہتی اور شام کو ان سب کو پر تکلف ضیافت دی جاتی۔ روز یہی ہوتا تھا۔

اب ہم اور آگے بڑھتے ہیں۔ آج سے تقریباً پچاس سال پہلے کا ذکر کرتے ہیں اگرچہ اس زمانے میں ہر طرف قدیم مشرقی تہذیب اور مشرقی کلچر میں مغربی یا انگریزی تہذیب اور کلچر کی آمیزش شروع ہوگئی تھی۔ اس لیے قدیم مشرقی محفلوں اور قدیم علمی مجلسوں کا رنگ بھی تبدیل ہونے لگا تھا۔ اس زمانے کی ادبی محفلوں کا تذکرہ ہم چند عنوانات کے تحت سناتے ہیں۔

مشاعرے

اس دور کے مشاعروں میں مہاراجا کشن پرشاد کے مشاعرے خاص طور پر قابل تذکرہ ہیں۔ مہاراجا کے پاس اولاً پیش کاری

کے زمانے ھی سے مشاعروں کی ابتدا ہو گئی تھی ۔ اس کے بعد جب مدارالمہامی سرفراز ہوئی تو ان میں اور زیادہ شان و شوکت پیدا ہوگئی ۔ دیوانی کے بعد جب صدارت عظمیٰ پر آپ کا تقرر ہوا تو پھر سے ان مشاعروں میں بھی رونق آ گئی ۔ آپ کے یہاں فارسی اور اردو دونوں میں کلام سنایا جاتا ، غزلیں اور نظمیں پڑھی جاتیں ، ہر زمانے میں مشہور اور قابل اساتذۂ سخن جمع ہوتے اور کلام کی داد لیتے ۔

مہاراجا کے مشاعروں کے بعد حضرت فیض کے سالانہ عرس کا مشاعرہ قابل ذکر ہے ۔ اس میں حضرت فیض کے شاگرد اور دوسرے شعرا حصہ لیا کرتے تھے اور ہر سال ان کے کلام کا مجموعہ بھی شائع ہوتا تھا ۔ فیض کے شاگردوں میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے ۔ خصوصیت سے بہاری لال رمز اور سیتل پرشاد خرم قابل تذکرہ ہیں ۔ رمز کا انتقال بھی عرس کے موقع پر ہوا تھا معروف علی شاہ کے عرس کا مشاعرہ بھی مشہور تھا اور آج تک اس کا سلسلہ جاری ہے ۔ شمس العلماء نواب عزیز جنگ مرحوم کے دولت کدے پر بھی اکثر مشاعرہ نما محفلیں ہوتی تھیں جس میں حیدر آباد کے مشہور اساتذۂ سخن مثلاً ترکی محوی ، ناظم اور جلیل وغیرہ حصہ لیا کرتے تھے ۔ ان کے علاوہ بعض عرائس کی تقاریب پر اور بعض جگہ بلا عرس کی تقریب کے مشاعرے ہوتے تھے ۔ جن میں حیدر آباد اور باہر کے شعرا حصہ لیا کرتے تھے پہلے تو صرف غزلوں کا رواج تھا مگر اس کے بعد نظمیں بھی مشاعروں میں پڑھی جانے لگیں ۔

مرحوم نظام آصف جاہ سادس کی چہل سالہ تقریب کے موقع پر جو مشاعرہ باغ عام میں منعقد ہوا تھا وہ خصوصیت سے اس لیے قابل تذکرہ ہے کہ اس میں پبلک سے صرف شعراء ھی کو داخلے کی اجازت تھی ۔ آصف یار الملک ایک کہنہ مشق شاعر جن کا

تخلص وزیر تھا اور شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس مشاعرے کے صدر ہو تے تھے ۔

انجمنیں

اس دور کے دوسری ادبی محفلوں میں علمی انجمنوں کا تذکرہ ضروری ہے ۔ ان میں ہفتہ وار ، پندرہ روزہ اور ماہوار ادبی اور علمی موضوع پر تقریریں ہوتی تھیں ۔ مضمون سنائے جاتے تھے ۔ ایسی کئی ایک انجمنیں تھیں یہاں ہم چند کا ذکر کرتے ہیں ۔

(۱) اقبال کلب

یہ بڑی مشہور انجمن تھی اور عرصۂ داراز تک علم کی خدمت کرتی رہی ۔ اس کے علمی اور ادبی جلسے والنٹئر کلب میں ہوتے تھے ۔ ''والنٹئر کلب'' اس مکان میں تھا جہاں اب دفتر رجسٹراربلدہ ہے یعنی معظم جاہی مارکٹ کے قریب ۔ پہلی مرتبہ جب مولوی شبلی حیدر آباد آئے تھے تو یہاں ہی قیام کیا تھا ۔ اقبال کلب کے جلسے بڑے مشہور تھے ۔ جب مولوی محب حسین نے تعلیم نسواں اور پردے کی مخالفت میں آواز بلند کی تھی تو اس انجمن کے ذریعے سے اپنا کام شروع کیا تھا ۔ مہینوں بلکہ برسوں پردے کی مخالفت پر گرما گرم تقریریں اور مباحثے ہوتے رہے ۔

(۲) انجمن معارف

ایک دوسری انجمن تھی اس کے صدر حیدرآباد کے مشہور لیڈر عبد القیوم مرحوم تھے ۔ انجمن کے ارکان میں حیدرآباد کا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ شامل تھا جن کے دلوں میں ملک کی خدمت کا پرجوش جذبہ اور علمی ترقی کا ذوق و شوق تھا ۔ مولوی مرتضیٰ مرحوم ، مولوی اکبر علی مرحوم اور حضرت کیفی مرحوم وغیرہ اس کے سرگرم ممبر تھے ۔

(۳) انجمن ثمرۃ الادب

یہ دراصل مدرسہ دارلعلوم کی یونین تھی ۔ پہلی مرتبہ سنہ ۱۳۲۳ ہجری میں چند سال تک علمی اور ادبی کام کرنے کے بعد بند ہوگئی ۔ دوسری مرتبہ سنہ ۱۹۱۷ ع میں اس کی دوبارہ زندگی ہوئی اس مرتبہ ہفتہ وار علمی جلسوں کے ساتھ ساتھ ماہوار علمی جلسے ہوتے رہے ۔ ان میں حیدرآباد اور شمالی ہند کے مشاہیر نے تقریریں فرمائیں ۔ انجمن کی جانب سے ایک ادبی رسالہ ''ثمرۃ الادب'' کے نام سے شائع ہوتا تھا ۔ اس مرتبہ تقریباً چار سال تک انجمن کی معتمدی کے فرائض میرے ذمے تھے ۔۔ جب عثمانیہ یونیورسٹی کی یونین قایم ہوگئی تو انجمن ثمرۃ الادب اور اس کا کتب خانہ وغیرہ یونین میں ضم ہوگیا ۔ جدید حیدرآباد کی ادبی تعمیر میں اس انجمن کا بھی نمایاں حصہ رہا ہے ۔

(۴) عثمانیہ ریڈنگ روم

اس انجمن کے بانی چند معزز ہندو اصحاب تھے مگر دوسری انجمنوں کی طرح اس کے ممبران میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے انجمن کا دار المطالعہ تھا ماہوار علمی جلسے ہوا کرتے تھے ۔ ان انجمنوں کے علاوہ بعض علم دوست اور مشاہیر اردو جو سرکاری ملازمت میں شامل تھے مثلاً خدا بخش خان ، مولوی عزیز مرزا ، نواب محسن الملک اور نواب عماد الملک وغیرہ کے اہتمام میں اکثر و بیشتر علمی اور ادبی جلسے ہوا کرتے تھے ۔ جس میں علم دوست پبلک شریک ہوتی اور شمالی ہند کا کوئی نامور ادیب اور اردو کا بھی خواہ کسی نہ کسی موضوع پر تقریر کرتا تھا ۔

جس طرح امرائے دکن میں ارسطو جاہ ، شمس الامرا ، مہاراجا چندو لال کی ادبی محفلیں یاد رہیں گی ۔ اسی طرح مہاراجا کشن پرشاد ، نواب مظفر جنگ ، حسام یار جنگ خان خاناں وغیرہ کئی

جاگیر دار ایسے تھے جن کے گرد و پیش ہر وقت شعرا ادیبوں کا مجمع ہوتا تھا ۔ اور فرصت کے اوقات میں شعر و شاعری اور ادبی مباحث ہوا کرتے تھے ان ادبی محفلوں کے تذکرے کے لیے طویل وقت کی ضرورت ہے ۔

مہاراجا کشن پرشاد کے یہاں پنڈت رتن ناتھ سرشار ملازم تھے ۔ ان کے علاوہ غبار ، فانی ، ہوش ، عالی ، بیگم ، ضیا اور فرحت وغیرہ بیسیوں شعرا جمع رہتے تھے ۔ ظفر جنگ مرحوم وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے سیاروں کے دیکھنے کے لیے بہت بڑی دوربین نصب فرمائی تھی اور آج حیدرآباد کی رصدگاہ میں وہی سب سے بڑی دوربین ہے ۔ بہر حال ان امیروں اور جاگیر داروں کے دولت خانوں میں اہل علم اور اصحاب فن سے ہر وقت رونق رہتی تھی ۔ کبھی شعر و شاعری ، ناول اور افسانے ، کبھی تاریخ اور سیر ، غرض مختلف موضوع پر گفتگو ہوتی ۔ علمی مباحث ، بذلہ سنجی ، سنجیدہ مذاق سے محفل کا رنگ دوبالا ہوا کرتا تھا ۔

امیروں اور جاگیر داروں کی طرح سرکاری اعلیٰ عہدے داروں کے مکانات اکثر و بیشتر علمی اور ادبی محفل کا رنگ اختیار کیے ہوئے تھے ، ان کی ذاتی علمی قابلیت اور ادبی ذوق و شوق کے باعث اصحاب دانش اور صاحبان علم کا ان کے یہاں مجمع ہوتا تھا ۔ حیدرآباد اور ہندوستان کی سیاست کے علاوہ ادبی اور علمی موضوع پرگفتگو ہوا کرتی تھی ۔ تعطیلات میں صبح تا شام اور دوسرے ایام میں بعد مغرب ایسی محفلیں ہوتی تھیں ۔ اس قسم کی دلچسپ علمی صحبتوں کا مفصل تذکرہ طوالت کا موجب ہو گا ۔ ایسی ادبی محفلوں نے جو ادب پیدا کیا ہے اس کی صراحت بھی دشوار ہے لیکن ایک آدھ واقعے کا اظہار ضروری ہے ۔ ایک مرتبہ مولوی عزیز مرزا مرحوم نے مولوی سید علی حیدر طبا طبائی سے خواہش کی تھی کہ انگلستان کے مشہور شاعر ٹامس گرے کی

''ایجی'' کا ترجمہ کیا جائے اس فرمائش پر طبا طبائی مرحوم نے ''گور غریبان'' کے نام سے اس کا ترجمہ کیا تھا ۔ جو اردو نظم کے ذخیرے میں بیش بہا اضافہ سمجھا جاتا ہے ، اور طباطبائی کے شہ کاروں میں شمار ہوتا ہے ۔ اس قسم کی ادبی محفلوں کے باعث ظفر علی خاں نے اپنی کتابیں تصنیف کیں ۔ مولانا ڈاکٹر عبد الحق نے مقدمے لکھے ۔ شرر اور سرشار نے عورتوں کی تعلیم اور پردے کی مخالفت کا بیڑا اٹھایا ۔ اسی طرح شاعروں کے مکان شعر و شاعری کے لحاظ سے ہمیشہ ادبی محفل بنے رہے ۔

توفیق ، داغ ، کیفی ۔ جلیل اور طبا طبائی وغیرہ کے مکان ادبی گہوارے بنے ہوئے تھے ۔ بہر حال یہ ماضی کی ایک طویل داستان ہے جو اب صرف تاریخ کے اوراق پر باقی رہ گئی ہے ۔

پانچواں باب

رہن سہن ، مکان ، آرکی ٹکچر ، ملبوسات ، کھانا پینا ، مہماں نوازی وغیرہ

زبان کے بعد کلچر کا دوسرا شعبہ زندگی کے لوازم ہیں ۔ یعنی رهنا سهنا ، کھانا پینا ، ملبوسات وغیرہ کے امور شامل ہیں ۔

یہ واضح کردیا گیا ہے کہ دکن کے مسلمانوں کا کلچر ان کے دکن میں آنے کے بعد ہی شروع ہوتا ہے ۔ مگر دکنی کلچر کی توسیع فیروز شاہی بہمنی کے عہد سے شروع ہوتی ہے ۔ اس طرح بہمنی قطب شاہی عادل شاہی ، نظام شاہی وغیرہ سلطنتوں کے زمانے میں کلچر کے مختلف شعبوں میں تغیر ہوتا گیا ۔ خصوصاً مغربی اقوام کے آنے کے بعد دکن کے مسلمانوں کے کلچر میں عظیم الشان انقلاب آ گیا ۔ چونکہ دکن کے مسلمانوں کی حکومتوں میں حیدرآباد کی حکومت آصفیہ ختم ہونے تک کلچر کے مختلف شعبوں میں تغیرات ہوتے رہے اس لیے اس عنوان کے تحت زیادہ تر حیدرآباد کے کلچر کو پیش نظر رکھا گیا ہے ۔ لیکن اس کے ساتھ ارکاٹ اور میسور کے ٹیپو سلطان کے دور کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے ۔

اس تمہید کے بعد یکے بعد دیگرے مختلف شعبوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے ۔

تعمیر اور آرکی ٹکچر

مسلمانوں کے بود و باش ، یا ان کے تعمیرات اور عمارات پر

نظر ڈالی جائے تو واضح ہوگا کہ ان کے کارنامے ۔

"نقش است بر جریدۂ عالم دوام ما"

کے مصداق دکن کے شہروں کے علاوہ دیہات میں بھی باقی ہیں اور آج تک ان کی مضبوطی ، خوب صورتی ، ان کے فن تعمیر کی مہارت کا پتہ دیتے ہیں ۔ مسلمانوں کے عمارتی کارناموں کو چند اقسام میں تقسیم کرسکتے ہیں ۔ یعنی(۱) مسجدیں ۔ (۲) سلاطین اور صوفیا کے مقبرے (۳) شاہوں اور امیروں کے محل ، ایوان اور قلعے۔ (۴) رفاہی عمارات۔ دکن کے مسلمانوں نے اپنے چھ سو سالہ دور میں اپنے دارالسلطنتوں اور اضلاع حتیٰ کہ دیہات میں جو مسجدیں تعمیر کی ہیں ان میں سے اب بھی سیکڑوں مسجدیں باقی ہیں ، جو اپنی وسعت ، خوب صورتی اور فن تعمیر کے شہ کار کہے جاسکتے ہیں ۔ گلبرگہ ، بیجاپور ، اورنگ آباد ، ارکاٹ ، مدراس ، میسور وغیرہ میں جو مساجد آج تک موجود ہیں وہ مسلمانوں کی تعمیری مہارت کی بخوبی وضاحت کرتی ہیں ۔

اس موقع پر اولاً فرانسیسی سیاحوں کے بیانات پیش کیے جاتے ہیں جس سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ قطب شاہی دارلسلطنت کے مکانات کس طرح کے تھے اس کے بعد مزید وضاحت کی جائے گی ۔

فرانسیسی سیاح موسیوٹیورنر نے سنہ ۱۶۶۵ع میں حیدرآباد کے متعلق جو صراحت اپنے سفر نامے میں کی ہے اس کا مختصر اقتباس یہاں موجب دلچسپی ہوگا :

عرض بلد اس شہر کا ۱۶ درجہ ۵۸ دقیقہ ہے شہری آبادی (۱۵۴۰۰۰) ہوگی اس میں اچھے اچھے مکانات بنے ہوئے ہیں ۔ سڑکیں بڑی چوڑی ہیں ۔ پل پر سے جب شہر میں جائیں تو پہلے ایک کوس پر لمبی بستی میں سے ہوکرگزرنا ہوتا ہے ۔ اس مقام پر تمام تاجر ساہوکار ، اور اہل حرفہ رہتے ہیں اور ہر طرح کے ادنیٰ لوگ بستے ہیں ۔ شہر کے اندر صرف وہی لوگ

رہتے ہیں جو ذی مرتبہ یا عہدہ دار اور محلات شاہی یا اہل کاران و کارکنان سلطنت اور فوجی ملازم ہیں ۔

جب پل پر[1] سے پار ہوں تو ایک چوڑی سڑک ملتی ہے جو سیدھی بادشاہ کے محل تک جاتی ہے ۔ اس سڑک کے دست راست پر آپ کو بعض درباری امراء کے مکانات دکھائی دیں گے ۔ بعد میں پانچ چار دو منزل کارواں سرائیں ہیں جن میں بڑے بڑے سرد کمرے اور حجرے بنے ہوئے ہیں ۔ اس سڑک کے آخری کنارے پر ایک بڑا چوک ہے ۔ جس کی ایک طرف کی دیوار سے محلات شاہی شروع ہوتے ہیں ۔ ان محلات کے وسط میں ایک بالا خانہ ہے جہاں بادشاہ دربارکیا کرتا ہے ۔''
(سفر نامہ میں ٹیورنر صفحہ ۲۲ و ۲۳)

دوسرا سیاح موسیو تھیوتو ہے ۔ اس نے سنہ ۱۶۵۶ع میں سیاحت کی ہے ۔ اس نے شہر حیدرآباد کے متعلق جو صراحت کی ہے اس کا اقتباس یہ ہے ۔

''اس سلطنت کا پایۂ تخت بھاگ نگر ہے جسے فارسی میں حیدرآباد کے نام سے پکارتے ہیں ۔ چاروں طرف شہر سے کئی کوس تک چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں ۔ ان پہاڑیوں سے یہاں کی آب و ہوا بہت عمدہ ہوتی ہے ۔ سوائے اس کے کہ گولکنڈہ کا ملک بہت اونچا ہے ۔ بیرون بلدہ کے مکانات جہاں ہم آ کر ٹھہرے تھے صرف مٹی کے ہی ہوتے ہیں ۔ پل کے انتہا پر ہمیں شہر کے دروازے ملے ۔ کوئی پاؤ گھنٹے تک برابر ایک لمبی سڑک پر چلے گئے ۔ جس کے دونوں طرف مکانات بنے ہوئے ہیں ۔ یہاں تر و تازہ اور خوش نما باغ بھی بنے ہوئے

۱۔ پرانا پل ہے اور محلے حسینی علم چوک لاڑ بازار وغیرہ ہیں ۔

ہیں - یہاں شہر میں کتنے ہی میدان یا بازار کے چوک ہیں مگر سب سے اچھا وہ چوک ہے - جو بادشاہ کی ڈیوڑھی کے روبرو ہے - اس چوک کے مشرق اور مغرب کی طرف دو بڑے بڑے دیوان خانے ہیں جو زیر زمین ہیں ، بہت نیچے تک چلے گئے ہیں اور ان کی چھتیں لکڑی کی ہیں ، زمین سے پانچ قدم اونچی ہیں اور چار ستونوں پر قائم ہیں - اس کی چھت چوڑی ہے - شاہی محلات اس کے شمال میں ہیں - جس کے سامنے ایک برآمدہ بنا ہوا ہے - جہاں دن میں کئی بار جب بادشاہ کو شہر میں جانا ہوتا ہے نوبت بجایا کرتے ہیں -

معمولی مکانات اونچے ہیں گرمیوں میں تر و تازہ ہوا آتی ہے کوئی روک نہیں ہے - ان مکانات میں اکثر تو مٹی کے بنے ہوئے ہیں مگر جو لوگ صاحب ثروت و عزت ہیں ان کے مکانات اچھے خوب صورت ہیں - محل سرائے شاہی جو (۳۸۰) قدم لمبی ہے نہ صرف اس چوک کی ایک حد کو پوری طرح گھیرے ہوئے ہے بلکہ چار مینار تک چلی گئی ہے - اور یہاں جا کر اس کے کناروں پر کوشک بنا دیے گئے ہیں - کہتے ہیں کہ یہ محل سرا اندر سے بہت ہی خوب صورت ہے اور اس کے سب سے بلند کمروں میں بھی پانی پہنچایا گیا ہے - پانی بہت دور سے آتا ہے - اور آ کر چار مینار کے اوپر ایک حوض میں جمع ہوتا ہے - وہاں نلوں کے ذریعے سے محلات میں جاتا ہے -

جسے چار مینار کہتے ہیں وہ ایک مربع عمارت ہے اس کے چاروں طرف چار محراب دار دروازے ہیں ان میں سے ہر دروازے کے سامنے برابر برابر چوڑی سڑک گئی ہوئی ہے

اس شہر میں باغات کی عمدگی قابل تعریف ہے - ان کے مصفا فراخ روشن پھل دار درخت عجیب خوبی دکھاتے ہیں جو

باغات شہر کے باہر ہیں نہایت ہی خوب صورت ہیں ۔''
(صفحہ ۸۲ تا ۸۶)

اسی سیاح نے آگے چل کر قلعہ گولکنڈہ کا ذکر اس طرح کیا ہے ۔

''بیرون بلدہ اور گولکنڈہ کے درمیان کا میدان نہایت خوبصورت اور دل کشا ہے ۔ اس کے ساتھ اس پہاڑی کی خوب صورتی کو بھی ملا لیجیے جو قلعے کے اندر وسط میں قند کے کوزے کی طرح کھڑا ہوا ہے اور جس کے گرد بادشاہ کے محلات بنے ہوئے ہیں تو اس قدرتی موزونیت سے اس جگہ کی خوبی اور بھی دوبالا ہوجاتی ہے ۔

شاہی محلات اور شاہی افسران کی قیام گاہ کے سوا اس قلعے میں اور کسی کا مکان کوئی اچھا نہیں ہے ۔ مگر شاہی محلات بہت بڑے ، ہوا دار اور خوش نما نظر آتے ہیں ۔''
(صفحہ ۹۳)

اس موقع پر پروفیسر عبدالمجید صدیقی کی تاریخ کے ایک اقتباس کا اضافہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جس سے قطب شاہی دارالسلطنت کی بود باش کی وضاحت ہوتی ہے ۔

''ان کے طریق بود و باش کا اندازہ کسی قدر ان کی عمارتوں سے ہوتا ہے بعض عمارتیں اس وقت موجود ہیں اور بعض کی صفحات تاریخ پر تعریف رہ گئی ہے ۔ شاہی بارگاہ تو کجا ان کے رہنے کے قصر بھی اس قدر بلند تھے کہ ان کی مشکل سے مثال ملے گی ۔ اندر سے بہترین قالینوں کا فرش اور چینی و بلورین آلات کی سجاوٹ اور باہر سے عمارتوں کی رفعت و باغبانی بڑی کیفیت پیدا کرتی تھی ۔ ایک مغل شہزادے نے جو شاہ جہاں کے محلات کا رہنے والا تھا لکھا تھا کہ ان محلات میں رہنا تو کجا ان میں چراغ جلانا مشکل ہے ۔ شاہی

درباروں کا حال ہم اوپر پڑھ آئے ہیں ۔ شاہی جلوس بھی اسی قدر شان دار ہوتے تھے ۔ بادشاہ ہاتھی پر باہر نکلتے تھے۔ اور ان کے ساتھ بڑا ہجوم ہوتا تھا ۔ امراء اور وزراء گھوڑوں اور پالکیوں میں جلوس کے ساتھ رہتے تھے اور ایک بڑا لشکر ہمراہ ہوتا تھا ۔ بادشاہوں کے مقبرے بھی بڑے شان دار بنائے جاتے تھے جو اب تک موجود ہیں ۔ قبروں پر بہترین غلاف پہنائے جاتے تھے اور قبروں کے ارد گرد قیمتی قالین بچھائے جاتے تھے اور سونے چاندی کی شمعیں روشن کی جاتی تھیں اور ہر روز غربا کو کھانا کھلایا جاتا تھا ۔ امراء کی زندگی بھی کچھ کم شان دار نہ تھی ۔ یہ بڑی حویلیوں میں رہتے تھے جو کئی منزلیں بلند ہوتی تھیں ۔ ان کا جلوس بھی ایسا ہی شان دار ہوتا تھا کہ گویا خود بادشاہوں کا جلوس ہے ۔ جب یہ باہر نکلتے تھے تو ان کے ہمراہ بھی ہاتھی اور اونٹوں کی قطاریں ہوتی تھیں اور بڑا لشکر ہمراہ ہوتا تھا اور سب کے پیچھے ان کا ہاتھی یا پالکی ہوتی تھی ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ متوسط طبقہ بھی بہت پاکیزہ اور پرتکلف زندگی بسر کرتا تھا ۔ شہر حیدرآباد میں دو لاکھ مکانوں کی گنتی کی گئی تھی ۔ ہر مکان کے رہنے والے اوسط دو آدمی قرار دیے جائیں تو شہر کی چار لاکھ آبادی ہونی چاہیے ۔ اس لحاظ سے یہ قرون وسطیٰ کا بہت بڑا شہر تھا ۔ اس کی آبادی اور بلند عمارتوں کو دیکھ کر ایک مغل مورخ نے ”آبادی وسیع تر از احاطۂ خیال“ اور ”عمارات رفیع تر“ اور ”پایہ اندیشہ“ کہا تھا ، جو قطب شاہی تمدن کی بہت بڑی دلیل ہے ۔ غالباً شمال کے شہنشاہی شہر بھی اتنے آباد نہیں تھے اور آبادی میں ہر طرح کے لوگ تھے ۔ تاجر عہدہ دار ، قانون دان ، مہاجن اور جوہری لیکن اس

میں باھر کے لوگ یعنی مغل ، ایرانی ، ترک زیادہ تھے جو
حیدر آبادی تھے ۔ ان کی معاشرت بے حد پرتکلف تھی اول تو
ان کے رھنے بسنے کے مکانات بھی شان دار اور بلند ھوتے
تھے ، پھر ان کے در و دیوار سے بلند پایہ تمدن ٹپکتا تھا ۔
سونے اور چاندی کی اشیاء کے علاوہ چینی کے ظروف ۔ روشنی
کے جھاڑ استعمال ھوتے تھے ۔ جن کو مورخ ''چینی آلات''
کہتے ھیں ۔ شیشے اور بلورین ظروف باھر سے جہازوں میں
بھر کر آتے تھے اور مسولی پٹم و حیدر آباد کے بازاروں
میں بہ کثرت فروخت ھوتے تھے ۔ چنانچہ ۱۰۹۵ھ ۱۶۹۷ع
میں حیدر آباد کی لوٹ ھوئی تو ھزار ھا قسم کی چیزیں
ظروف اور کپڑے باھر نکلے اور قالین کے بہترین فرش راستوں
پر نظر آتے تھے ۔ جن کو دیکھ کر خود مغلوں کو حیرت
ھوئی اور ان اشیائے تمدن سے گھر اتنے بھرے ھوئے تھے کہ
لوٹ مار کے باوجود خالی نہیں ھوئے ۔ حالانکہ چار پانچ کروڑ
کی لوٹ ھو چکی تھی ۔ ان حقیقتوں سے معلوم ھوتا ھے گولکنڈہ
کا متوسط طبقہ جس قدر متمدن تھا اس کی مثال اور جگہ
نہ تھی[1] ۔

مسلمانوں کی ریاستوں میں حیدر آباد کی سلطنت آصفیہ ایسی
ریاست تھی جو حال حال تک باقی رھی ۔ یہاں کی بیسیوں مسجدیں
جو ھر زمانے میں بنائی گئی ھیں ان کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز
ھے ۔ ان سب کو مسلمانوں کے تعمیری آثار میں شامل کرنا چاھیے ۔
دور آصفی کی بعض مسجدیں بلحاظ وسعت چھوٹی ھیں مگر خوبصورتی
کے لحاظ سے ان کو ترجیح دی جا سکتی ھے ۔

بہمنی دور کی بعض مساجد میں جو ستون استعمال کیے گئے

۱- ''تاریخ گولکنڈہ'' (۲۶۹ تا ۲۷۱) ۔

ہیں وہ ہندو طرز تعمیر کا نمونہ ہیں مگر اس کے بعد جو مسجدیں تعمیر ہوتی گئیں ان میں اسپین اور دمشق ، بغداد کے اسلامی طرز تعمیر کی خصوصیات کو مد نظر رکھا گیا ہے ۔ جیسا کہ تذکرہ کیا گیا ہے گلبرگہ کی مسجد ، حیدر آباد کی مکہ مسجد ، ٹولی مسجد اپنے شاندار اور خوبصورتی کے علاوہ وسعت ، کشادگی اور تعمیر فن کے کمال کا ثبوت پیش کرتی ہیں ۔ اسی طرح دکن کے دوسرے شہروں میں بیسیوں مساجد ہیں جن کو مسلمانوں کے فن تعمیر کے آثار میں شمار کرنا چاہیے ۔

مسجدوں کے بعد سلاطین کے مقبرے اور صوفیائے کرام کے مقبرے جو گولکنڈہ ، بیدر ، بیجا پور ، گلبرگہ وغیرہ میں آج تک باقی ہیں وہ مسلمانوں کے بہترین صنعت اور ان کی مہارت فن آرکی ٹکچر کو واضح کرتے ہیں ۔ بیجا پور میں ابراھیم کا مقبرہ حیدر آباد میں سلطان محمد قلی اور دیگر سلاطین کے مقبرے ، اورنگ آباد میں رابعہ دورانی کا مقبرہ ۔ بیدر میں سلاطین بہمنی کے مقبرے اور برید شاہوں کے مقبرے خصوصیت سے قابل تذکرہ ہیں ۔ صوفیائے کرام کے بیسیوں مقبرے دکن کے اکثر شہروں میں موجود ہیں ۔ جن سے واضح ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں نے گنبد بنانے میں کیسی ترقی کی تھی ۔ ان کی وسعت ، ان کی اندرونی اور بیرونی نقاشی ، ان کی بلندی غرض فن تعمیر کے بہترین نمونے اب بھی نظر آتے ہیں ۔

مسجدوں کی طرح مقبروں کی تعداد بھی شمار میں نہیں آ سکتی جیسا کہ تذکرہ کیا گیا ہے بیجاپور کی بولتی گنبد (ابراھیم عادل شاہ کا مقبرہ) آگرے کے تاج محل کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے ۔ اس مقبرے کی نادر روز گار عمارت عجوبے سے کم نہیں ہے ۔

مسلمانوں کے تعمیراتی یادگاروں میں مسجدوں اور مقبروں کے بعد عاشور خانے ، شاہی محل ، قصر ، ایوان اور شفاخانے شامل

ھیں ۔ گلبرگہ میں شہر فیروز آباد ، بیدر کے قلعے کی شاھی عمارات ، گولکنڈہ کی شاھی عمارات کے کھنڈر اب تک باقی ھیں ۔ سلاطین قطب شاھی کو پانی کے حوضوں اور سبزے سے بڑی دلچسپی تھی دو دو چار چار منزلیں محلوں کے اوپر حوض بنائے جاتے اور چمن بندی ہوتی اس کے آثار اب تک باقی ھیں ۔

حیدر آباد میں گوشہ محل کی بارہ دری کا کچھ حصہ اب بھی اچھی حالت میں باقی ھے ۔ جو قطب شاھوں کی یادگار ھے ۔

آصفی دور کے شاھی محل ، امیروں کے قصر اور ایوان اب بھی موجود ھیں ۔ دور آصفی کی عمارات میں اکثر لکڑی کے بڑے بڑے منقش ستون استعمال کیے جاتے تھے ۔ دو منزلہ بلکہ سہ منزلہ عمارات میں لکڑی پر جو نقاشی ھوتی تھی وہ اب بھی خوبصورتی اور فن نقاشی کے بہترین نمونے ثابت ھوتے ھیں ۔ بیدر میں صدف کا جو کام ھوا ھے اب تک باقی ھے ۔

شاھی قصر اور ایوان میں دربار کے حصے ، بادشاہ کے خاص کمرے ، محلات کے حصے ھر ایک علیحدہ علیحدہ شان پیدا کرتے تھے ۔ حیدر آباد کا پنج محلہ ، پرانی حویلی ۔ اپنی قدیم طرز تعمیر کے لحاظ سے نظر انداز نہیں کیے جا سکتے ۔ حیدر آباد میں اب بھی بعض مسلمان اور ھندو امیروں کے جو چھوٹے بڑے محل ھیں ان کو دیکھنے سے مسلمانوں کی طرز تعمیر کا اندازہ ھوسکتا ھے ۔ مثال کے طور پر سالار جنگ کے ایوان کے کئی حصے ۔ سالار جنگ کی بارہ دری کے علاوہ مہاراجا کشن پرشاد ۔ راجا شیو راج اور راجا رائے رایاں کے محلات مسلمانوں کی طرز تعمیر کے ھی نمونے ھیں ۔

مسلمانوں کی طرز تعمیر میں چھت کی بلندی ، ستون اور محرابوں پر نقش خصوصیت رکھتے تھے ۔ ان میں روشنی اور ھوا کے آنے کے لیے خاص لحاظ رکھا جاتا تھا ۔

دکن کے مسلمانوں کے تعمیری آثار میں سے جو رفاہی عمارات ہیں ان میں بیدر میں محمود گاواں کا مدرسہ ، حیدر آباد کا چار مینار ، دارالشفا" یعنی دواخانے کی عمارات ۔ عاشور خانہ ۔ قطب شاہی دور کے آثار ہیں ۔ اسی طرح دکن کے دوسرے شہروں اورنگ آباد ، احمد نگر ، میسور ، یہ ارکاٹ ، کرنول وغیرہ میں رفاہی بیسیوں عمارتیں ہیں پل تالاب وغیرہ مسلمانوں کے آثار میں شامل ہیں ۔ جن میں سے کئی اب تک اچھی حالت میں باقی ہیں اور بعض کے کھنڈر اپنی بانی کی یاد دلاتے ہیں ۔

اگر اس موقع پر دکن کے تمام شہروں کے عمارتوں یا قلعوں کا تذکرہ کیا جائے تو اس کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے اس لیے ان کو نظر انداز کر کے صرف حیدر آباد کی بعض عمارتوں پر نظر ڈالی جاتی ہے ۔ کیونکہ دکن کے مسلمانوں کی ریاستوں میں صرف حیدر آباد کی آصفیہ حکومت سنہ ۱۹۴۸ تک باقی رہی تھی ۔

حیدر آباد میں سنہ ۱۹۰۰ ع تک جو سرکاری اور خانگی عمارتیں یا مکانات تعمیر ہوئے ہیں ان میں انگریزی یا مغربی طرز تعمیر کی جھلک نظر آتی ہے ۔ مگر سنہ ۱۹۰۰ ع یا بہ الفاظ دیگر سنہ ۱۹۱۰ ع کے بعد سرکاری عمارتیں بنیں ان میں اسلامی طرز تعمیر کو ملحوظ رکھا گیا ہے ۔ دور عثمانی میں جو عمارتیں بنائی گئیں ہیں ان میں سے بعض کا تذکرہ بے موقع نہیں ہو سکتا ۔

افضل گنج کا دواخانۂ عثمانیہ ۔ جو حیدر آباد کا سب سے بڑا ڈاکٹری علاج کا دواخانہ ہے اسی طرح چار مینار کا دواخانۂ یونانی دونوں دور عثمانی کی رفاہی عمارت میں پیش پیش ہیں ۔

عدالت العالیہ یعنی ہائی کورٹ کو اپنی خوبصورتی کے لحاظ سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ اس کے بازو میں سٹی کالج کی عمارت جو ایک ہائی اسکول کے لیے بنائی گئی تھی اور اب کالج ہے ۔

باغ نامہ کا چوبی ہال ، عثمان ساگر ، حمایت ساگر ، نظام ساگر

یہ سب مسلمانوں کے تعمیر کیے ہوئے ہیں ۔ دور عثمانی میں اضلاع اور تعلقات کے مستقروں پر عدالتی دفاتر ۔ دواخانے اور مدرسے اور کلکٹر کے دفاتر سب کے سب مسلمانوں کی تعمیری آثار میں شامل ہیں ۔ ان کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔

ان سب سے قطع نظر حیدر آباد میں جامعۂ عثمانیہ ، کی عمارت یعنی آرٹ کالج ، سائنس کالج ، انجنیرنگ کالج اور طلبا کے کئی اقامت خانے جو سنہ ۱۹۴۸ ع کے پہلے تعمیر ہوئے ہیں یہ سب مسلمانوں کے تعمیری آثار میں شامل ہیں ۔ معظم جاہی مارکیٹ ، حیدر آباد میوزیم ، سکندر آباد اور حیدر آباد کاچی گوڑہ کے اسٹیشن بھی مسلمانوں کے دور کی عمارات میں شامل ہیں ۔

ان سب کے بعد کتب‌خانۂ آصفیہ کی عمارت کا تذکرہ ضروری ہے جو دور عثمانی میں تعمیر ہوئی ہے البتہ اس کے پیچھے کا حصہ پولیس ایکشن کے بعد تعمیر ہوا ہے ۔ لیکن اگلے حصے اور پچھلے حصوں کا مقابلہ کیا جائے تو واضح ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی تعمیر اور زمانۂ ما بعد کی تعمیر میں کیا فرق ہے ۔

حیدر آباد میں چونکہ جاگیر داریت سنہ ۱۹۴۵ ع تک باقی رہی ہے ۔ اس لیے جاگیر داروں اور عہدہ داروں نے جو عمارتیں اپنے رہنے کے لیے بنائیں ان سب کو مسلمانوں کی تعمیرات میں شامل کرنا چاہیے اگرچہ اکثر عمارتوں میں مغربی خصوصاً جرمنی طرز کو ملحوظ رکھا گیا ہے ۔ مگر اس کے باوجود ان سے مسلمانوں کی طرز تعمیر کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔

مکانوں کی آراستگی اور چمن بندی

اس عنوان کے تحت بھی ہم قطب شاہی دور سے روشنی ڈال سکتے ہیں اگرچہ شہر حیدر آباد میں جو قطب شاہی قصر ، ایوان اور باغات تھے وہ نیست و نابود ہوچکے اور ان کا نام و نشان

مٹ گیا ہے ۔ مگر گولکنڈہ کے شکستہ محل اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ ان کے مکینوں کے مکان کس وضع اور کس نہج کے ہوتے تھے اور انھیں باغوں ، چمنوں ، آبشاروں ، حوضوں اور نہروں سے کس قدر دل چسپی اور دل بستگی تھی ۔ گولکنڈہ کے محلوں سے اب بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ قصر و ایوان کے اوپری منزل پر بھی حوض بنائے جاتے اور چمن لگایا جاتا تھا ۔

محلوں کے دروازے وسیع ، کرسی مرتفع حجرے ، کشادہ اور شہ نشین بلند و بالا ہوتے تھے ۔

جب حیدر آباد میں آصفیہ حکومت قایم ہو گئی تو چونکہ بانی سلطنت آصفیہ مغلیہ حکومت کے تربیت یافتہ تھے ۔ اس لیے مکانات کی ساخت ، ان کی آراستگی ، چمن بندی اور باغات وغیرہ میں مغلیہ کلچر کو پیش نظر رکھا گیا تھا ۔

نواب سالار جنگ کی ڈیوڑھی ۔ مہاراجا کشن پرشاد کی ڈیوڑھی ، حتی کہ راجا شیو راج ، نواب عنایت جنگ ، نواب کمال یار جنگ وغیرہ کے مکانات کو دیکھا جائے تو پوری طرح واضح ہوتا ہے کہ دکنی کلچر میں مکانوں کی تعمیری وضع کس نہج کی ہوتی تھی ۔ لمبا اور بلند دالان ۔ پیش دالان ۔ لکڑی کے ستون کس قدر پست شہ نشمن کے ستون دروازوں اور دریچوں پر لکڑی میں کندہ کیے خوبصورت نقش ۔ بیل بوٹے ۔ جالی دار کنگرے ۔ وغیرہ دکنی کلچر کے نمونے تھے ۔ مکان کی آراستگی میں شیشہ آلات ، دیول کرطاں ، قندیل ، قندیل کے درخت ، روشنی کا زیادہ سے زیادہ اہتمام ، سفید چاندنی کا فرش ، گاؤ تکیے ، مسندیں ، قالین ، سوزنیاں اور تخت وغیرہ اسباب آرایش و زیبایش تھے ۔

سنہ ۱۷۰۰ ع سے جب انگریزوں کی رزیڈنسی قائم ہوگئی اور انگریزی کلچر روز بروز نظر آنے لگا تو مکانوں کی طرز تعمیر میں فرق آ گیا ۔ انگریزی طرز کے مکان تعمیر ہونے لگے حتی کہ اب

جرمنی طرز کے مکانات بھی نظر آتے ہیں اس طرح اسباب آرائش میں کرسیاں ، صوفے ، آرام کرسیاں غرض حیدر آباد میں مختلف کلچروں کا سنگم نظر آنے لگا ۔ خواہ مکان کی طرز تعمیر ہو یا اسباب آرائش ، کھانا پینا ہو یا رہنا سہنا ۔ ہر چیز میں مختلف طرز شامل ہوکر سنگم بن گیا ۔ یعنی ایک جدید تمدن اور جدید کلچر بن گیا ۔ جس کو دکنی کلچر کے امتیازات تصور کرلنا چاہیے ۔ کلچر کی شناخت مکانوں کی زیب و زینت ۔ شیسہ آلات ، دیول گیرہاں ، قندیلیں ، قندیلوں کے جھاڑ ، فانوس ، شمع ، شمع دانوں ، قطعات و تصاویر آرٹ کے نمونوں سے کی جاتی تھی ۔ برقی روشنی آنے کے بعد روشنی میں مزید اضافہ ہوگیا قندیلوں کی وضع بھی تبدیل ہو گئی ۔ پہلے یہ مثل رائج تھی کہ قندیل کے نیچے اندھیرا ۔ برقی روشنی آنے کے بعد یہ مثل معدوم ہو گئی ۔

کھانا پینا

دکن میں جس وقت مسلمان آئے اس وقت ان کا کھانا ۔ پینا اور پکوان کا طریقہ جداگانہ تھا ۔ اور دکن کے باشندوں کا طریقہ جدا تھا دکن کے بعض فرقے گوشت کھاتے تھے اور بعض فرقے گوشت سے پرہیز کرتے تھے ۔ بعض مسلمان اولیا نے اپنے مریدوں کو گائے کا گوشت کھانے کی ممانعت بھی کر دی تھی [1]

مسلمانوں اور ہندوؤں کے اختلاط سے دونوں کے "کھانے" ملتے گئے ۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ قطب شاہی دور میں مہتمم مطبخ ہندو ہوتے تھے چنانچہ شری ۔ یم ۔ نرسنگ راؤ صاحب سابق منسٹر حکومت آندھرا کے اجداد اس کام پر مامور تھے ۔ جس کا

---

۱ ۔ حضرت بابا شرف الدین نے اپنے مریدوں کو گائے کا گوشت کھانے کی ممانعت کر دی تھی ۔

اظہار انھوں نے اپنی تقریر میں کیا تھا ۔ اسی طرح آصفی دور میں آصفی فرماں روا کے یہاں اس خدمت پر ایک عرصۂ دراز تک ہندو اصحاب مامور ہوتے تھے ۔ راجا گردھاری پرشاد آصف جاہ سادس میر محبوب علی خان کے عہد میں اس خدمت پر مامور تھے ۔

اگر اہل حیدر آباد کے کھانوں کی تفصیل کی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ حیدر آباد میں کھانے میں روٹی اور چاول دونوں شامل ہیں ۔ روٹی گیہوں ، جواری ، باجرہ وغیرہ کی ہوتی ہے ۔ گیہوں کی روٹی کے اور اس کے پکانے کے طریقے مختلف رہے اور ان کے نام بھی جدا گانہ ہیں ۔ ان کے پورے نام تو نہیں لکھے جا سکتے البتہ چند یہ ہیں ۔

شیر مال ۔ باقر خانی ۔ کاچے ۔ پراٹھے ۔ ریشمی پراٹھے ۔ چپاتی۔ پھلکے ۔ بن ۔ روغنی روٹی ۔ تندوری روٹی ۔ خمیری روٹی ۔ ڈبل روٹی وغیرہ قابل تذکرہ ہیں ان میں سے اب بعض کا صرف نام باقی رہ گیا ہے۔ مثلاً ''باقر خانی'' روٹی سے کوئی واقف نہیں ہے ۔

چاول

چاول کے پکوان کے مختلف نام ہیں ۔ خشکہ ۔ کھچڑی ۔ بریانی ۔ پلاؤ وغیرہ بریانی ۔ کے اقسام کئی ہیں ۔ مثلاً کچی بریانی ۔ پکی بریانی ۔ سنہری پلاؤ ۔ کوفتہ پلاؤ مرغ پلاؤ وغیرہ ۔

کھچڑی کے بھی مختلف اقسام ہیں ۔ مثلاً قبولی ۔ کھچڑی ۔ تہاری ۔ چنے کی دال اور مسور کی دال کی کھچڑی وغیرہ ۔ جس طرح چاول اور گوشت کی شرکت سے بریانی اور پلاؤ تیار ہوتا ہے اسی طرح گیہوں اور گوشت کی شرکت سے مختلف غذائیں تیار ہوتی تھیں ۔ مثلاً سمبوسے ۔ ورق سمبوسہ ۔ کھاری سویاں ۔ کھچڑہ ۔ حلیم ۔ دم کے روٹ ۔ کھارے روٹ ۔ کری پف وغیرہ ۔

گوشت کے سالن وغیرہ۱

گوشت کے سالن کے مختلف نام ہیں ۔ کباب ۔ دم کے کباب نرگسی کباب ۔ کوفتہ کباب ۔ کوفتہ ۔ شامی ۔ شکمپور ۔ ٹٹی کا گوشت ۔ سالم بکرے کا دم پوخت قورمہ ۔ والا جاہی قورمہ وغیرہ۱۔

مختلف گوشت یعنی بعض چرند اور پرند استعمال ہوتے ہیں ۔ بکرا ۔ گائے ۔ ہرن ۔ اونٹ ۔ خرگوش ۔ مرغ ۔ تیتر ۔ بٹیر ۔ بط ۔ تلبر ۔ فاختہ ۔ کبوتر ۔ وغیرہ

پرندوں میں سوائے کوے ۔ باز ۔ بلبل وغیرہ کے دیگر پرندوں کے کباب اور تلا ہوا گوشت تیار کیا جاتا ہے ۔

مچھلی وغیرہ

پانی کے جاندار یعنی مچھلی ۔ جھنگہ ۔ کے سالن بھی مرغوب سالن ہوتے ہیں ۔ ان کے پکانے کے اقسام مغربی طرز اور مشرقی طرز کے جداگانہ ہیں اعلیٰ سوسائٹی میں معربی طرز سے اور اوسط اور ادنیٰ طبقے میں مشرقی طرز سے پکائی جاتی ہیں ۔

ترکاری کے سالن

ہر قسم کی ترکاری کو گوشت کے ساتھ بھی پکایا جاتا ہے اور بلا گوشت کے بھی ترکاری ہو یا سبزی ۔ بھاجی ۔ دونوں اس میں شامل ہیں ۔ ہر ترکاری کئی قسم سے پکاتے ہیں ۔ یعنی گوشت کے ساتھ بھی اور بلا گوشت بھی ۔

بگھارے بیگن ۔ حیدر آباد کا ایک خاص اور مخصوص سالن ہے جو کئی دن اچھا رہتا ہے ۔ اسی طرح ”کٹ“ بھی حیدر آباد

۱۔ حضرت بابا شرف الدین کے مرید گائے کا گوشت نہیں کھاتے تھے ۔

کا مشہور قدیم سالن ہے۔ ٹماٹر اور کھاتی دونوں سے بنتا ہے۔ ''سالن کٹ'' کے نام سے نواب سالار جنگ کے کتب خانے میں ایک اردو قلمی کتاب موجود ہے۔ جس سے اس کی اہمیت واضح ہو سکتی ہے۔ اس کتاب میں سالن کٹ پکانے کا طریقہ لکھا گیا ہے۔

اس مجمل بیان کے بعد اب کسی قدر تفصیل سے اس مضمون کی صراحت کی جاتی ہے۔ واضح ہوکہ قطب شاہی دور میں ترکی۔ ایرانی اور دکنی پکوان کا رواج رہا۔ جب آصفیہ حکومت قائم ہوئی تو چونکہ آصف جاہ دہلی سے آئے تھے اس لیے مغلیہ پکوان کا رواج یہاں ہوتا گیا اور جب آگے چل کر لکھنؤ میں سلطنت اودھ قائم ہوگئی اور لکھنوی اصحاب ذی وقار حیدر آباد آنے لگے تو لکھنوی پکوان کا بھی رواج ہوگیا۔ اسی طرح مدراس کے اصحاب خصوصاً اہل نرایط کے حیدر آباد آنے سے پکوان میں اور بھی تنوع پیدا ہوگیا۔

مثلاً مغلیہ سرکار میں ''بریانی'' اور اودھ کے دربار میں اس کے مقابل پلاؤ تیار ہونے لگا تھا۔ حیدر آباد میں یہ دونں مروج ہوگئے۔ ابتداء میں تو دہلی کے باورچی حیدر آباد آئے مگر زمانۂ ما بعد میں لکھنؤ کے باورچی آنے لگے۔ خصوصاً جب کہ سلطنت اودھ کا خاتمہ ہوگیا تو دربار لکھنو کے کئی اعلیٰ مہارت کے باورچی حیدر آباد آئے تھے۔ بریانی اور پلاؤ کی کئی قسمیں ہوتی تھیں۔ امراء اور جاگیر دار جو اچھے کھانے کے شوقین ہوتے تھے ان کے دستر خوان پر بہ وقت واحد کئی قسم کی بریانی اور پلاؤ ہوتے تھے۔ بریانی اور پلاؤ میں فرق یہ تھا کہ بریانی میں مسالے کی نفاست اور صفائی ضروری سمجھی جاتی تھی۔

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ معمولی قسم کے پلاؤ سے بریانی اچھی معلوم ہوتی ہے اور پلاؤ محض خشکہ معلوم ہوتا ہے۔ لکھنؤ والے پلاؤ کو اس لیے پسند کرتے تھے کہ پلاؤ میں نفاست ہوتی

ہے ۔ لکھنو میں پلاؤ کا زیادہ رواج رہا ۔[1]

جیسا کہ قبل ازیں تذکرہ کیا گیا ہے حیدر آباد میں دونوں کا رواج رہا ۔ کیونکہ یہاں دو جگہوں کے باورچی آئے اور پھر دونوں جگہوں کے شرفاء اور معززین اور امراء جمع ہوگئے تھے ۔

''گذشتہ لکھنؤ'' کے مصنف نے گلزار پلاؤ ۔ نور پلاؤ ۔ گولر پلاؤ موتی پلاؤ اور چنبیلی پلاؤ کے نام گنائے ہیں ۔ اور یہ بھی صراحت کی ہے کہ اعلیٰ درجے کے دستر خوان پر بیسیوں طرح کے پلاؤ ہوتے تھے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے اقسام متعدد ہوتے تھے اور ہر قسم کے پلاؤ و بریانی میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا تھا ۔ کوفتہ پلاؤ ۔ ترکاری پلاؤ ۔ سنہری پلاؤ وغیرہ کے نام اس فہرست میں شامل کیے جاتے ہیں ۔

بریانی اور پلاؤ کے قطع نظر دیگر چیزیں پکانے کے لیے باورچی مشہور ہوا کرتے تھے چنانچہ ''گذشتہ لکھنؤ'' کے مصنف کی یہ صراحت قابل ملاحظہ ہے ۔

''پیر علی لکھنؤ کا مشہور رکاب دار جو حضور نظام کے باورچی خانے میں ملازم تھا ایک نہایت قیمتی اور لذیذ ارھر کی دال پکایا کرتا جو اگلے فرمان روایان لکھنؤ کے باورچی خانوں میں پکا کرتی تھی ۔ اور سلطانی دال سے مشہور تھی[2] ۔ پیر علی مٹھائی کے انار بناتا تھا ۔ جس میں اوپر کا چھلکا اندر کے دانے کی ترتیب اور ان کے بیچ کے پردے سب اصلی معلوم ہوتے تھے[3]۔

پلاؤ اور بریانی کے متعلق ذیل کی صراحت دلچسپی کا

۱۔ ''گزشتہ لکھنو'' صفحہ (۲۴۳)
۲۔ گذشتہ لکھنو صفحہ ۲۵۴ ۔
۳۔ گذشتہ لکھنؤ صفحہ ۳۵۵ ۔

موجب ہوگی۔

"مسلمانوں کی نیشنل ڈش یعنی قومی غذا پلاؤ اور قورمہ ہے۔ لہذا سب سے زیادہ نزاکت و لطافت انھیں چیزوں میں دکھائی گئی۔ پلاؤ کے متعلق ہم بہت کچھ بیان کر چکے ہیں پھر بھی بعض باتیں باقی رہ گئی ہیں۔ دولت مند اور شوقین امیروں کے لیے مرغ مشک و زعفران کی گولیاں کھلا کھلا کے تیار کیے جاتے۔ یہاں تک کہ ان کے گوشت میں ان دونوں چیزوں کی خوشبو سرایت کر جاتی اور ہر رگ و ریشہ معطر ہو جاتا پھر ان کی یخنی نکالی جاتی اور یخنی میں چاول ڈالے جاتے۔

موتی پلاؤ کی یہ شان تھی کہ معلوم ہوتا تھا چاولوں میں آبدار موتی ملے ہوئے ہیں۔ اس کے لیے موتیوں کے تیار کرنے کی یہ ترکیب تھی کہ تولہ بھر چاندی کے ورق اور ماشہ بھر سونے کے ورق انڈے کی زردی میں خوب حل کیے جاتے پھر اس حل شدہ مرکب کو مرغ کے نرخرے میں بھر کے نرخرے کے ہر ہر جوڑ پر باریک دھاگا کس کے باندھ دیا جاتا اور اسے خفیف سا جوش دے کر چاقو سے نرخرے کی کھال چاک کر دی جاتی اور سڈول آبدار موتی نکل آتے جو پلاؤ میں گوشت کے ساتھ دم کر دیے جاتے۔ یعنی رکابدار پنیر کے موتی بناتے اور اس پر چاندی کا ورق چڑھا دیتے بہر حال ایسی ایسی جدتیں عمل میں آتیں کہ اور کبھیں لوگوں کے خیال میں بھی نہ آئی ہوں گی۔ بعض رکاب داروں نے پلاؤ کی تیاری میں یہ صنعت دکھائی کہ گوشت کی چھوٹی چھوٹی چڑیاں بنا کے اور خوب احتیاط سے اس طرح پکا کے کہ صورت نہ بگڑنے پائے پلیٹ میں بٹھا دیتے چاولوں کی صورت دانے کی کردی اور

معلوم ہوتا کہ ہر مہمان کے سامنے پلیٹ میں چڑیاں بیٹھی دانہ چگ رہی ہیں ۔ پھولے ہوئے سمبوسے جن میں سے توڑتے ہی لال لکل کر اڑ جاتے ۔ حیدر آباد دکن میں غالباً لکھنؤ کے رکاب دار پیر علی نے آ کر تیار کیے جو سرکاری ڈنروں میں میز پر آتے اور معزز انگریزوں اور لیڈیوں کو بہت محظوظ کرتے ۔ اس کی ایجاد سب سے پہلے نصیرالدین حیدر کے دستر خوان پر ہوئی تھی مگر چڑیوں والا سمبوسہ مذکورہ بالا پلاؤ سے بدر جہا زیادہ دلچسپ تھا''۔

شیرینی

اولاً حلوائی کا تذکرہ ''گذشتہ لکھنؤ'' سے پیش کرتے ہیں ۔ اس سے کئی باتیں ظاہر ہو جاتی ہیں ۔

''مٹھائیوں میں یہ امتیاز کرنا دشوار ہے کہ کون اصلی ہندوؤں کی ہے اور کون مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان میں آئی ۔ لیکن ناموں اور مذاق پر قیاس کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حلوا خالص عربی چیز ہے ۔ جو عرب سے ایران ہوتا ہوا ہندوستان میں آیا اور اپنا نام بھی ساتھ لیتا آیا لیکن بظاہر یہ عام فیصلہ نہیں ہوسکتا اس میں تفریق ہے ۔ تر حلوہ ہندوؤں کی چیز ہے جسے وہ موہن بھوگ بھی کہتے ہیں مگر حلوا سوہن کی چار قسمیں ہیں پپڑی ، جوزی ، حبشی اور دودھیا یہ خالص مسلمانوں کے معلوم ہوتی ہیں ۔ جدید عربی مذاق کے حلوے جو جنوبی ہند خصوصاً مدراس میں مروج ہیں ان کا پتہ نہیں وہ واقعی خالص عربی حلوے ہیں جو براہ راست عرب سے ہندوستان میں آ گئے ۔

۱۔ ''گذشتہ لکھنو'' صفحہ ۲۵۲ ۔

مگر ہندو حلوائیوں کی اکثر مٹھائیاں بھی مسلمانوں ہی کے زمانے کی ایجاد معلوم ہوتی ہیں مثلاً برفی کا نام بتا رہا ہے کہ اسے فارسی و عجمی مذاق نے ایجاد کیا۔ بادشاہی خرمے، نکتیاں، گلاب جامن، دربہشت وغیرہ بھی عہد اسلام کی ایجاد ہیں۔

جلیبی کو عربی میں زلابیہ کہتے ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ زلابیہ ہی سے بگڑ کے جلیبی لفظ بنا ہے۔ اس لیے یہ بھی انہیں عربی و فارسی مٹھائیوں میں شامل کرنے کے قابل ہے۔ پیڑا خالص ہندی مٹھائی ہے اور امرتی بھی ہندی ہے۔ مگر مجھے بتایا گیا ہے کہ امرتی خاص لکھنؤ میں ایجاد ہوئی۔ فی‌الحال ان مٹھائیوں کے اعتبار سے لکھنؤ کی کوئی خصوصیت نہیں۔ جو درجہ بندی ہند کے تمام ممتاز شہروں کو حاصل ہے وہی لکھنؤ کو بھی حاصل ہے بلکہ یہ عجیب تماشا نظر آتا ہے کہ لکھنؤ میں تو آگرے اور پنجاب کے حلوائی زیادہ مشہور ہیں اور دوسرے شہروں میں مجھے یہ نظر آیا کہ لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ کے حلوائیوں کو زیادہ نمود حاصل ہے۔ دراصل اس کو کسی دوکان کے چل جانے سے تعلق ہے اس لیے کہ جس حلوائی کی دوکان جس قدر زیادہ چل جاتی ہے اسی قدر اسے مٹھائیوں میں ترقی کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔

حلوائیوں کی نسبت اصل فیصلہ یہ ہے کہ ہندو حلوائیوں کا درجہ بہت بڑھا ہوا ہے۔ مٹھائیوں کے جتنے قدر دان ہندو ہیں مسلمان نہیں۔ مسلمانوں کو شاید گوشت خوری کی وجہ سے علی‌العموم نمکین کھانوں کا زیادہ شوق ہے۔ بخلاف اس کے ہندو مٹھائیوں کے زیادہ شوقین ہیں۔ وہ فقط مٹھائیوں سے پیٹ بھر لیتے ہیں جو مسلمانوں سے غیر ممکن ہے اور ہندوؤں کی رغبت کی وجہ سے متھرا، بنارس اور اجودھیا جو ہندوؤں کے مذہبی مرکز ہیں

مٹھائیوں کے اقسام اور مزے کے اعتبار سے دوسرے شہروں پر فوقیت رکھتے ہیں ۔

مگر حلوہ سوھن کے بنانے میں مسلمان رکاب داروں کے علاوہ اور بہت سے لوگوں نے بھی شہرت حاصل کی ۔ آخر زمانے میں یہاں کے مشہور خوش نویس منشی ھادی علی صاحب نے پیڑی حلوا سوھن میں خاص ناموری حاصل کی وہ سیر بھر سمنک میں بیس تیس سیر گھی کھپا دیتے اور اس کی ٹکیوں پر عجیب عجیب قسم کے خوبصورت طغرے بناتے جن سے حلوا سوھن بنانے کے ساتھ خوشنویسی اور نقاشی کے کمالات بھی ظاھر ہوتے ۔

اس کے بعد مٹیا برج (کلکتہ) میں منشی السلطان بہادر کو جو لکھنؤ کے ایک رئیس زادے تھے اپنی آنکھوں سے بار بار دیکھا کہ چھٹانک بھر سمنک میں دو ڈھائی سیر گھی کھپا دیتے ۔ جو فی سیر چالیس سیر کے قریب پڑا ۔ ان کا پیڑی حلوا سوھن بجائے زرد ہونے کے دھوئے کپڑے کے مانند اجلا اور سفید ہوتا'' ۔[1]

مٹھائیوں میں شکر یا شہد وغیرہ کے ساتھ جو اشیاء شریک ہوتیں ان کے نام سے مٹھائیوں کے نام مختلف ہوتے ۔ گیہوں کا آٹا ۔ دودھ ۔ کھویا ۔ کھجور کے علاوہ مختلف خشک و تر میووں سے خصوصاً بادام اور پستے سے زیادہ کام لیا جاتا تھا ۔ یہاں مدراس کی چند مٹھائیوں کے نام ملاحظہ ہوں ۔

(۱) اشرقی[2] ۔ (۲) امرود پھل ۔ (۳) انڈے کی پھوسی ۔ (۴) بادامی پوریاں ۔ (۵) بادامی حلوا ۔ (۶) بادامی میوا ۔ (۷) باقلا ۔

۱- اس کی تفصیل میں ''تاریخ التوابط'' سے بھی مدد لی گئی ہے صفحہ ۵۲ ۔

۲- ''گذشتہ لکھنؤ'' ۔

(۸) پرت کا حلوا - (۹) پنجری - (۱۰) پورن پوری - (۱۱) پسیوی (۱۲) پیوی - (۱۳) بادام کی جالی - (۱۴) چکنے کے لوز اور حب کا حلوہ - (۱۵) بادام کے روٹ (۱۶) سوزجی کے روٹ - (۱۷) حلوا سوھن - (۱۸) حشت مدن - (۱۹) دھی بڑے - (۲۰) حب کے روٹ - (۲۱) کراھی کھیر - (۲۲) سونڈا - (۲۳) گاجر کا حلوا (۲۴) گل فردوس - (۲۵) بادام کے لوز - (۲۶) کھوے کے لوز - (۲۷) مالیدا - (۲۸) مرصوف - (۲۹) نان خطائی - (۳۰) ورقی سموسہ - (۳۱) ورقی کھجور - (۳۲) کدو کا حلوا - (۳۳) آلو کا حلوا - (۳۴) آلو کا لوز - (۳۵) روٹی کا میٹھا - (۳۶) سیو پوری کا میٹھا - (۳۷) فیرنی - (۳۸) کھیر - (۳۹) کدو کی کھیر - (۴۰) خوبانی کا حلوا - (۴۱) پستے کے لوز -

مدراس کا ایک خاندان جو حیدر آباد میں آ گیا تھا وہ بادام کے میوے اور ترکاری بنانے میں کمال رکھتا تھا - آم - جام - سیب - سنترہ - انجیر - انار - سیتا پھل وغیرہ بالکل اصل میوے کی صورت میں بناتے تھے اور ترکاریوں میں کریلا - گاجر - بیٹھا - کھیرا وغیرہ بناتے تھے - اگر اصل میووں کو ترکاری کے ساتھ رکھ دیا جائے تو تمیز دشوار ھوتی تھی -

انگریزوں کے دکن میں آنے کے عرصۂ دراز کے بعد امیروں کے دسترخوان پر دیسی کھانوں کے ساتھ یورپین کھانے بھی چنے جاتے تھے -

اور پھر جب کبھی اعلیٰ پوزیشن والے یورپین کی ضیافت ھوتی اس وقت جو ڈنر تیار ھوتا اس میں مغلئی اور یورپین کھانے ھوتے تھے -

یورپین اصحاب کے باعث ڈبل روٹی ، بسکٹ ، کیک ، پیسٹری پٹنگ ، آئیس کریم ، فروٹ سلات وغیرہ کا رواج ھوا اور یہ اچھے سے اچھے تیار ھونے لگے -

سلطنت آصفیہ کے زمانے میں ”عامرہ“ نام ایک سر رشتہ

جس کو حکومت کا باورچی خانہ کہا جائے تو درست ہے جب سرکاری طور پر لنچ ، ڈنر ، ایٹ ہوم وغیرہ کی پارٹی ہوتی تو اس کا انتظام اس کے سپرد ہوتا اور ماہرین فن باورچی مامور ہوتے تھے ۔ مثلاً ایک گوا کے باورچی برگنزا تھا ۔ جو یوروپین کھانے پکانے میں ماہر تھا اس کے علاوہ ایک اور یوروپین شخص مامور کیا گیا تھا ۔ جو یوروپین پکوان کا خاص ماہر تھا ۔ ان لوگوں کی تنخواہیں خاصی ہوتی تھیں ۔

شاہی ڈنر خصوصاً آصف جاہ سادس کے زمانے میں ہوتے تھے ۔ ان کے (لوازمات سیکھنے کی فہرست) میں بلا مبالغہ ''پندرہ بیس'' کورس (اشیاء) ہوتے تھے اور تقریباً $\frac{1}{2}$ ، بلکہ دوگنے کھانے میں سرف ہوتے تھے ۔ لارڈ رپن پہلا گورنر جنرل اور وائیسرائے تھا جو حیدر آباد آیا[1] ۔ اس کے بعد وائیسرائے ہند حکومت برطانیہ کے مقرر ہوتے تھے ۔ وہ سب کے سب اپنے دور حکومت میں ایک بار ضرور حیدر آباد آتے تھے اور پھر کمانڈر انچیف پرنس آف ویلز ، گورنران بمبئی ، مدراس وغیرہ اور مہاراجگان ہندوستان کی جو مہمان داری ہوتی تھی اور اس وقت جو شاہی ڈنر ہوتا تھا اس کے کھانوں کی فہرست طویل سے طویل تر ہوتی تھی ۔

آصف جاہ سادس کے بعد خصوصاً یورپ کی جنگ عظیم کے بعد ڈنر کا کورس (کھانے کی اشیاء) میں کمی آ گئی ۔

اگرچہ صفحات بالا میں کھانوں کے متعلق بہت کچھ صراحت کی گئی ہے ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اختصار کے مد نظر بہت ساری باتیں متروک کر دی گئی ہیں ۔

۱۔ ''تزک محبوبیہ'' جلد اول ۔

حیدر آباد کے کھانوں کی تفصیل میں نہ صرف مشرق بلکہ مغربی کھانوں کا تذکرہ بھی ہوسکتا ہے ۔ کیونکہ حیدر آباد میں مشرقی ممالک ؛ عراق ، ایران ، عرب ، ترکی ، چین ، جاپان ، افریقہ وغیرہ کے باشندوں کے اقامت گزین ہونے سے یہاں ان کے پکوان کا رواج ہوگیا تھا اسی طرح یورپین ممالک ؛ اطالیہ ،فرانس ، انگلستان ، ہالینڈ وغیرہ ۔ ممالک کے باشندوں کے قیام کے باعث ان ممالک کے کھانوں کا بھی رواج ہوگیا اور پھر ہندوستان کے دوسرے حصوں ؛ بنگال و پنجاب ، مہاراشٹر ، گجرات وغیرہ کے علاقوں کے کھانے بھی حیدر آباد کے کلچر کے جزو ہوگئے ۔

اس عنوان کو ختم کرنے کے پیشتر پکوان کی فارسی کتابوں کا تذکرہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے ۔

پکوان کی کتابیں

اس موقع پر یہ بھی صراحت ضروری ہے کہ دکن میں پکوان پر مختلف کئی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے ''ایوان نعمت'' اور ''خوان نعمت'' قابل ذکر ہیں ۔ یہاں صرف ایوان نعمت کا تذکرہ کیا جاتا ہے ۔ جو فارسی میں ہے اس کتاب کی (۴۳) فصلیں ہیں ہر فصل میں ایک قسم کے پکوان کا تذکرہ ہے ۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے :

(۱) اقسام نان و کلچہ اور خمیر بنانے کا طریقہ ۔ (۲) اقسام آش ۔ (۳) قلیہ دوپیازہ ۔ (۴) اقسام ساگھ (ترکاری) (۵) اقسام دم پخت ۔ (۶) روغن جوش ۔ (۷) اقسام کلچہ ۔ (۸) اقسام سالن ہندی ۔ (۹) اقسام ھلی ۔ (۱۰) زیر بریانی ۔ (۱۱) اقسام پلاو ۔ (۱۲) اقسام خشکہ ۔ (۱۳) اقسام بریانی ۔ (۱۴) اقسام زاتیہ ۔ (۱۵) اقسام برہ ۔ (۱۶) اقسام چیراتے سکھون (۱۷) اقسام کھچڑی ۔ (۱۸) اقسام شولہ ۔ (۱۹) اقسام کاھے

(۲۰) اقسام طاہری و حلیم کتک - (۲۱) اقسام یخنی - (۲۲) اقسام شش ریکه - (۲۳) اقسام خاگینه - (۲۴) اقسام مربه - (۲۵) اقسام کباب - (۲۶) اقسام مینرولمه - (۲۷) اقسام پوری - (۲۸) اقسام سمبوسه (۲۹) اقسام کینار - (۳۰) اقسام تھوے (۳۱) اقسام فرنی - (۳۲) اقسام شیر برنج - (۳۳) اقسام فالوده - (۳۴) اقسام خربزه ولسی - (۳۵) اقسام مالیده - (۳۶) اقسام گاگله - (۳۷) اقسام کھجور - (۳۸) اقسام شیرنی - (۳۹) اقسام برتا - (۴۰) اقسام اچار (۴۱) ونکھانه و رشنه رنگیں (۴۲) اقسام ملا - (۴۳) اقسام حلوایات -

خوان نعمت جو غلام غوث خان والا جاہ کے زمانے میں لکھی گئی ہے اس میں شریں اور نمکین کھانوں کی تفصیل اور ترکیب درج ہے - چنانچہ اس کی تفصیل کی جاتی ہے -

مختلف قسم کے مٹھائیوں کے اقسام جو دکن میں تیار کیے جاتے تھے ان کی فہرست حسب ذیل ہے -

۱- جالٹی یک تہی دم داده -
۲- جالٹی دوتہی دم داده بادامی -
۳- سنبوسه یک تہی دم داده بادام -
۴- سنبوسه دوتہی دم داده بادام -
۵- پوری دم داده بادام -
۶- سنبوسه حلوه دار -
۷- روٹی دم داده بادام -
۸- لوز بادامی -
۹- لوز ساده دم داده -
۱۰- پیچک بادام داده -
۱۱- لوث لڈوی بادام -

۱۲- اشرق یا روپیه بادام ـ

۱۳- نام خطائی بادام ـ

۱۴- حلوائی بادامی حب ـ

۱۵- حبابی بادامی ـ

۱۶- صابوئی خوش مزه و بهتر است نسخه ـ

۱۷- حلوائی بادام لوث ـ

۱۸- حلوائی بادام روه دار ـ

۱۹- حلوائی خشک بادام ـ

۲۰- لوز بادام روء دار ـ

۲۱- حلوه حب بهتر نسخه ـ

۲۲- لوز حب بهتر ـ

۲۳- لوز مغزیات ـ

۲۴- حلوائی مغزیات ـ

۲۵- لوز بادامی حب ـ

۲۶- شکر پاره بادامی ـ

صنف دوم

۲۷- موصعوف نارجیل خشک ـ

۲۸- موصعوف مرکم بادامی ـ

صنف سوم

۲۹- حلوا موز ـ

۳۰- پیوسی موز ـ

۳۱- حلوه نارجیل نیم رسیده

۳۲- حلواه انبه پخته ـ

۳۳- سنبوسه هائی آنبه ـ

صنف چہارم

۵۸- پیوسی با مغز ـ
۵۹- بولیاده شیر ـ
۶۰- لوز کهوه ـ
۶۱- پژه شیر ـ
۶۲- شیر خرما ـ

صنف پنجم

۶۳- باقلا گندم ـ
۶۴- نان خطائی ساده ـ
۶۵- نان خطائی بهتر نسخه ـ
۶۶- پورن پوری شیر دار ـ
۶۷- نان خطائی حلواه دار ـ
۶۸- پوری حلوه دار دم ـ
۶۹- پوری میوه دار بریان ـ
۷۰- سیوین رومالی دم داده ـ
۷۱- سیوین رومالی ـ
۷۲- بوز سیوین رومالی ـ
۷۳- نسخه سیوین رومالی بطور دیگر ـ
۷۴- بهلا دم گندم ـ
۷۵- سیوین رومالی شیر دار ـ
۷۶- رشته بریان تخته ـ
۷۷- رشته ترکیب تیاری قرص رشته رومالی ـ
۷۸- سیوین تخته دم داده ـ
۷۹- سیوین تخته دهاتره ـ
۸۰- سروله شیرین ـ
۸۱- پورن پوری چوپلره خشک ـ

۸۲- پورن پوری که مد شده نسخه ۔

۷۳- روت دم داده بوت ۔

۸۴- روت دم داده قاض دار یا حلوا ۔

۸۵- مالیده معمولی ۔

۸۶- مالیده مرکب ۔

۸۷- چونگه حلوا دارم داده ،

۸۸- موت لدو ۔

۸۹- چونگه خطائی ۔

۹۰- پهس ساده ۔

۹۱- پهس شیر دار ۔

۹۲- تهلی دم داده ۔

۹۳- لوز هتلی ۔

۹۴- پهانولی شیر ۔

۹۵- هسنی بڑی گندم ۔

۹۶- لوهی بڑی شیر ۔

۹۷- دهی بڑه ۔

۹۸- لوز نشاسته ۔

۹۹- کهجور ساده ۔

۱۰۰- گلگله شیره دار ساده ۔

۱۰۱- گلگله شیره دار مرکب ۔

صنف ششم

۱۰۲- کهیر کڑائی لوز دار زعفرانی ۔

۱۰۳- کهیر کڑائی لوز ۔

۱۰۴- کهیر کڑائی سفید رنگ ۔

صنف هفتم

۱۰۵- شش رنگ ساده ـ
۱۰۶- جالی بیضه بهتر نسخه ـ
۱۰۷- جالی مرکب بیضه نسخه ـ
۱۰۸- حلوا بیضه بهتر نسخه ـ
۱۰۹- شش رنگه ایجاری ـ
۱۱۰- حلواه گاجر ـ
۱۱۱- بکاتا پیاز ـ
۱۱۲- بکات پیشته ساده ـ
۱۱۳- بکات مرکب بهتر ـ
۱۱۴- پیوسی پیاز نسخه ـ
۱۱۵- بکات ترنج نسخه ـ
۱۱۶- حلوه پیاز نسخه ـ
۱۱۷- کهیر کڑائی کدو برنگ سفید ـ
۱۱۸- شیرنی کدوی شیرین نسخه ـ
۱۱۹- شیره دار شکرقند ـ
۱۲۰- نسخه لوز کدوی سبز ـ
۱۲۱- لوز سوهان شیرین رومالی
۱۲۲- پهس شیره دار رشته رومالی نسخه ـ
۱۲۳- پهس خشک رشته رومالی ـ
۱۲۴- پهس رشته ـ
۱۲۵- مزعنبر رشته تخته ـ
۱۲۶- مزعفر شوله رشته تخته ـ
۱۲۷- شیر خرمای رشته تخته نسخه ـ
۱۲۸- رشته تخته ـ

۱۲۹- رشته دم داده تخته۔
۱۳۰- شیر خرمای قرص رشته رومالی ۔
۱۳۱- حلوا نشاته ۔
۱۳۲- لوز خشک نشاسته ۔
۱۳۳- پتلی نشاسته گندم ۔

صنف هشتم

۱۳۴- لڈوی برنج مرکب ۔

صنف نہم

۱۳۵- مرغ دام در اقسام شیر حلوائی ۔

صنف اول

۱۳۶- شیر پیسٹری ششیر ۔
۱۳۷- برفی شیر ۔
۱۳۸- برفی شیر ۔
۱۳۹- حلوا سوهان ۔
۱۴۰- پیڑه شیر ۔
۱۴۱- پیڑه شیر ۔
۱۴۲- فائده ۔

صنف دوم

۱۴۳- برفی نخود ۔
۱۴۵- لڈو بیسن نخود ۔
۱۴۶- لڈو بوندی دار نخود نسخه ۔

صنف سوم

۱۴۷- لڈو سوجی ۔

۱۴۸- لڈو گندم ۔

۱۴۹- لڈو خشک ۔ رشتہ روسالی ۔

۱۵۰- لڈو شیرہ دار رشتہ روسالی ۔

۱۵۱- برفی رشتہ روسالی ۔

صنف چہارم

۱۵۲- امرتی ۔

۱۵۳- لڈو بوندی دار ماش ۔

صنف پنجم

۱۵۴- نسخہ ۔

صنف ششم

۱۵۵- لڈو مونگ ۔

۱۵۶- نسخہ ۔

۱۵۷- زرزری ۔

صنف ہفتم

۱۵۸- لڈو مغزیات ۔

۱۵۹- لڈو انجھ ۔

۱۶۰- لڈو چرونجی ۔

مشروبات

حیدر آباد میں مشروبات میں پہلے مختلف شربت شامل تھے ۔ جو نہایت عمدگی اور نفاست سے بنتے تھے ۔ شربت میوہ اور دوسری چیزوں سے بنائے جاتے تھے ۔

جب یورپین معاشرت داخل ہوگئی تو چاء ، کافی ، لیمن ، سوڈا، کریم سوڈا ، راسبہری ، وسٹو ۔ وغیرہ وغیرہ کے ساتھ شراب

بھی مشروبات میں شامل ہو گئی ۔ یورپیں اصحاب کی آمد کے پہلے شراب کا رواج بہت کم تھا ۔ عوام خصوصاً پست اقوام میں سنیدھی کا رواج تھا ۔ طرب و نشاط کے بعض جلسوں میں شراب اور اور سیندھی استعمال ہوتی تھی ۔

اگرچہ کہ قطب شاہی دور میں خصوصاً سلطان محمد قلی اور سلطان عبداللہ کی نشاط انگریزی اور بادہ نوشی کی تصدیق تاریخوں اور خود ان کے شاعری سے ظاہر ہوتی ہے ۔ اس زمانے میں نہ صرف یوروپین شراب خصوصاً پرتگالی شراب آتی تھی بلکہ حیدر آباد میں بھی شراب سازی ہوتی تھی ۔ آصفی دور کے آغاز میں بادہ نوشی میں کمی آ گئی تھی کیونکہ آصف جاہ اول بڑے مذہبی شخص تھے اور آپ کے اہل دربار پر بھی اس کا اثر تھا مگر آصف جاہ کے بعد جب یوروپین اثر بڑھ گیا اور فرانس اور انگرویزوں کے قدم حیدر آباد میں مضبوط تر اور مستحکم ہوتے گئے تو رقص اور سرور، طرب و نشاط کے لیے مغربی شراب بھی لوازمات میں شامل ہوگئی ۔ چنانچہ هدایت محی الدین خان مظفر جنگ کی دلچسپی کے لیے جنرل ڈوپلے نے فرانس[1] سے نہ صرف نازنینان پیرس کو طلب کیا تھا بلکہ مختلف قسم کی شرابیں بھی منگوائی تھیں تا کہ مظفر جنگ کی بزم طرب و نشاط گرم ہو اور مشرقی عیش و عشرت کے ساتھ مغربی عشرت کا لطف بھی حاصل کرتے رهیں اور امور ریاست کو ڈوپلے جس طرح چاہے انجام دیتا رہے ۔

آصف جاہ خامس بڑے مذہبی آدمی تھے اس لیے شراب خانوں اور سیندھی خانوں کو اندرون شہر حیدر آباد کے باهر

۱- سب رس بابتہ ۵۷

کر دیا تھا[1]۔ کوئی شراب خانے یا سیندھی خانے اندرون شہر حیدر آباد نہیں تھے چنانچہ اب تک بھی اس پر عمل قائم ہے ۔ یعنی افضل گنج کے پل کی جنوبی آبادی میں کوئی شراب خانہ نہیں ملے گا ۔

آصف جاہ سادس کے زمانے کے پہلے مختلف اصحاب شراب کشید کرتے تھے ۔ خصوصاً سال والوں (خاندان راجہ شیو راج) میں شراب کی کشید خصوصیت سے ہوتی تھی اور مختلف اشیاء سے شراب بنائی جاتی ۔ مرغ کی شراب ۔ سونف کی شراب ، انگور کی شراب وغیرہ مشہور تھی ۔ آصف جاہ سادس کے زمانے میں کل مہوے سے شراب بنانے کے لیے سرکاری کارخانہ قائم ہو گیا اور عام طور سے شراب بننے کی ممانعت کر دی گئی لیکن راجہ شیوراج والوں کو اس سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا ۔

حیدرا آباد کے شاہی اور امراء کے دستر خوان

اگرچہ شاہان آصفیہ کے مطبخ یا باورچی خانہ اور کھانوں کی صراحت دشوار ہے تاہم مولف ''گلزار آصفیہ'' نے آصف جاہ ثانی کے باورچی خانے کی جو صراحت اپنی کتاب میں کی ہے اس کا ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے کیونکہ اس سے حیدر آباد کے حکمران کے کھانے پینے کی وضاحت ہوتی ہے ۔

غفران ماب (آصف جاہ ثانی) کا باورچی خانہ تین داروغوں کے تحت نواب انور جنگ سے متعلق تھا جو خلوت کے پہلو میں تھا ۔ روزانہ ایک سو بیس خوان خاصہ کے تیار ہوتے تھے ۔ جو محل شاہی میں ارسال کیے جاتے جو خاصہ تقسیم ہوتا اس کو سالم خاصہ نصف خاصہ اور پاؤ خاصہ کہا جاتا جو بلحاظ مرتبہ اور اعزاز کے

۱۔ ''تاریخ دکن'' محمد سلطان

تقسیم ہوا کرتا ۔

آصف جاہ ثالث کے عہد میں داروغہ باورچی خانہ کے اہتمام میں تیار ہو کر شاہی محلات میں علیحدہ علیحدہ بھیجا جاتا ۔ ہر ایک باورچی خانے میں کئی کئی باورچی رکاب دار اور دوسرے ملازم مامور تھے ۔ اور رکاب داروں کی تنخواہ بیش قرار تھی جو رات دن اپنے فرایض کی انجام دہی میں مصروف اور منہمک رہا کرتے باورچی خانۂ خاص الخاص سے خوان تقسیم ہوتے تھے جو ذایقہ دار کھانوں سے بھرے ہوئے ہوتے تھے ۔

روزانہ معمول کے علاوہ ماہ رجب ۔ رمضان وغیرہ مہینوں میں نواب فیض مآب الدولہ کے زیر نگرانی غیر معمولی کھانوں کی تیاری ہوتی اور تقسیم عمل میں آتی ۔ چنانچہ ماہ رجب میں روانہ پانچ سو روپیہ پہلی رجب سے آخر شعبان تک کونڈوں کی تیاری میں صرف ہوتے ۔ صبح سے شام اور شام سے صبح تک غربا مساکین اور فقرا کو کھلایا جاتا ۔ کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی جو آتا وہ سیر ہو کر کھاتا ۔ ماہ رمضان میں پیر زادوں مشایخوں علماء کو افطاری ارسال ہوتی اور پھر کئی مسجدوں میں روزہ داروں کے لیے افطاری پہنچائی جاتی ۔ کئی ہزار روپیہ اس کے اخراجات ہوتے تھے ۔ خاصہ کے باورچیوں کی ماہوار دو دو سو اور اس سے زیادہ ہوتی ۔ ماہ ربیع الاول، ربیع الثانی میں بڑے اہتمام سے نیازیں ہوتیں ۔ ماہ محرم میں بلاگوشت کی غذا تیار ہوتی تمام مشہور عاشور خانوں کو پہنچائی جاتی اور مسکینوں کو کھلایا جاتا ۔ خوب سیر ہو کر کھاتے اور دعا بھی دیتے[1]۔

آصف جاہ ثالث کے بعد آصف جاہ رابع اور خامس کے دور میں کوئی صراحت اگرچہ نہیں ملی مگر اسی پر قیاس کرنا

۱- ''گلزار آصفیہ'' مطبوعہ صفحہ ۵۰۳ ۔

چاہیے جس کی صراحت سطور بالا میں کی گئی ہے ۔

سلاطین آصفیہ میں آصف جاہ سادس تک قدیم کروفر باورچی خانوں کا باقی تھا ۔ چونکہ آصف جاہ سادس کے کھانے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا تھا ۔ اس لیے باورچی خانہ میں ہر وقت تازہ پکوان ہوتے تھے تاکہ جس وقت کھانے کی طلبی ہو فوراً تازہ اور گرم کھانا دستر خوان پر چنا دیا جائے اور جو پہلا پکوان ہوتا وہ ملازمین اور ان کے متعلقین کی شکم سیری کا ذریعہ بنتا تھا ۔

آصفی حکمرانوں کے دستر خوان پر جو کھانے چنے جاتے وہ تمام لوازمات خوانوں میں رکھ کر کپڑے سے باندھے جاتے اور اس پر مہر ہوتی تھی اور جب دستر خوان پہنچایا جاتا تو وہ مہر توڑی جاتی ۔ اور دستر خوان کھانوں سے آراستہ کیا جاتا ۔

اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خان عموماً پرانی حویلی میں قیام کرتے تھے ۔ اور مہتمم باورچی خانہ (نواب مظفر نواز جنگ) کا مکان پرانی حویلی کے باہر تھا حضور کے لیے ناشتہ کی تیاری کا آغاز صبح پانچ چھ بجے سے شروع ہوتا اور صبح دس بجے تک اس وقت تھا ۔ کھانے کے خوان جو ”چشنگ“ کے نام سے مہتمم باورچی خانہ کے پاس بطور نمونہ بھیجے جاتے اور ان کے چک کر پسند کرنے پر وہ حضور کے لیے بھیجے جاتے جو کھانے ناپسند کرتے وہ تقسیم ہو جاتے۔ چونکہ گرم اور تازہ ناشتہ ہوا کرتا تھا اس لیے یکے بعد دیگرے دس بجے تک پکوان جاری رہا کرتا ۔ مہتمم باورچی خانہ کے پاس جو نمونہ آتا اس سے نہ صرف اہل محلہ بلکہ ان کے عزیز اقارب ملازمین تک سیر ہوا کرتے تھے ۔ اسی طرح دوپہر کے خاصہ کی تیاری دس بجے سے تین بجے تک ہوتی اور اس ”چشنگ“ کے خوان مہتمم کے پاس آتے اور ان کے پسند کیے ہوئے کھانے حضور کے لیے جاتے اور شام کا کھانا چھ بجے شام

سے رات کے دس گیارہ بجے تک جاری رہا کرتا اور اس طرح تقسیم ہوا کرتا ۔ اس سے واضح ہوسکتا ہے کہ کس طرح امیر ہی نہیں بلکہ بلا مبالغہ سیکڑوں غریب بھی عمدہ کھانوں سے روزانہ سیر ہوتے تھے ۔ اور یہ ایک دو یوم یا ہفتہ دو ہفتہ نہیں بلکہ سال ہا سال جب تک نواب میر محبوب علی خان زندہ رہے سنہ ۱۹۱۱ ع تک یہ طریقہ بدستور جاری رہا ۔

دوسرا قابل تذکرہ امر یہ ہے کہ حضور کے پیشی کے ملازمین اور مصاحب یعنی سر آمین جنگ ، افسر الملک ، محبوب یار جنگ ، ڈاکٹر لقمان الدولہ ، ناصر نواز الدولہ وغیرہ جن کی تعداد بارہ تھی روزانہ تین وقت یعنی صبح ، دوپہر اور شام کو دو خوان مغلئی کھانے اور دو خوان انگریزی کھانے کے ان اصحاب کے مکانوں کو جاتے تھے ۔ یعنی ان کے اہل و عیال کے لیے یہ انتظام کیا گیا تھا ۔

شاہی کھانوں سے وہ روزانہ متمتع ہوا کرتا تھے ۔ سالہا سال مرحوم حضور کی زندگی تک اس پر برابر عمل ہوتا رہا[1] ۔

اگر حضور کہیں سیر و سیاحت یا شکار کو جاتے تو بھی اس طرح کی تقسیم برابر ہوا کرتی تھی ۔ اس میں ناغہ یا کوئی فرق نہیں ہوا کرتا تھا ۔

ایک اور مثال یہ ہے کہ ملازمین صرف خاص یعنی عہدہ دار اور دوسرے ملازمین کے یہاں کوئی تقریب شادی بیاہ ، بسم اللہ خوانی وغیرہ ہوا کرتی تو دعوتی اصحاب کی تعداد کے موافق فی اسم آٹھ آنہ داخل کر دیے جاتے تو تعداد سے پانچ چھ گنا اصحاب کے لیے دو گوشتہ بریانی مع تر لوازم کے آ جاتی تھی ۔ مثلاً کسی

۱- مجھ سے محمد اشرف فرزند لقمان الدولہ نے اس کی تصدیق کی ہے ۔

کے پاس سے سو آدمی کے لحاظ سے پچاس روپیہ داخل ہوتے تو اس کے پاس اس قدر بریانی اور لوازمات آ جاتے جس سے پانچ سو اشخاص سیر ہو کر کھاتے تھے ۔ سال کے بارہ مہینے یہ انتظامات جاری رہا کرتے۔

سنہ ۱۹۴۸ ع میں حکومت آصفیہ ختم ہوگئی اور سنہ ۱۹۵۶ ع میں راج پرمکھی سے آصف جاہ سابع نے سبکدوشی حاصل کرلی۔ مگر اس کے بعد بھی حضور نظام کے باورچی خانے کا سالانہ خرچ کئی لاکھ کا ہوا کرتا ہے ۔ اور سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کی پرورش ہوتی ہے ۔ کنگ کوٹھی کے باورچی خانے کی صراحت دشوار ہے تاہم یہ کہا جا سکتا ہے ہر قسم کی روٹی ، بالائی ، مسکہ حتیٰ کہ گھی بھی تیار ہوا کرتا ہے۔ جس طرح شیر مال ، ڈبل روٹی وغیرہ تیار ہوتی ہے اسی طرح بسکٹ ، پیسٹری، بھی تیار ہوتی ہے ۔ مغلئی اور انگریزی باورچی خانے علیحدہ علیحدہ ہیں غرضیکہ اب بھی باورچی خانہ کنگ کوٹھی کو شاہی مطبخ کہنا چاہیے جہاں سے ہزاروں اصحاب شکم سیر ہوتے ہیں ۔

اس موقع پر صاحبزادہ معظم جاہ کے دستر خوان کے بعض حالات دلچسپی سے پڑھے جائیں گے جن کو صدق جائسی صاحب نے اپنے ایک مضمون ''دربار دربار'' کے عنوان سے رسالہ ''ساقی'' کے کئی نمبروں میں لکھا ہے ان میں سے بعض اقتباس پیش کیے جاتے ہیں ۔ یوں تو صدق صاحب نے اپنے مضمون میں جو رسالہ ''ساقی'' کے پندرہ سولہ نمبروں میں شائع ہوا تھا معظم جاہ کے دستر خوان کے متعلق کئی باتیں لکھی ہیں ۔ مگر ان کی تفصیل طوالت کا موجب ہوگی اور بعض امور مبالغہ کی حد تک پہنچ گئے ہین ۔ اس لیے صرف مختصر اقتباس پیش کیا جاتا ہے ۔

''آج ڈنر سوپ کے بعد پیش خدمت نے پہلی ڈش کھچڑی پرنس کے سامنے پیش کی جس کو انھوں نے بہ رغبت لیا اور کئی

چمچے اپنی پلیٹ میں نکال کے خدمت گار کو حکم دیا صدق کے سامنے لے جاؤ خدمت گار میرے سامنے لایا میں نے اس عنایت خاص پر اٹھ کر پرنس کو سات سلام کیے۔ پھر اپنی جگہ بیٹھ کر اس خیال سے ایک ہی چمچہ لیا کہ پیٹ میں پلاؤ کھانے کی گنجایش باقی رہے۔ میں لے چکا تو پرنس نے فرمایا فانی کو بھی دکھاؤ فانی نے بھی میری ہی طرح کھچڑی کو جنس حقیر جان کر ایک ہی چمچہ نکالا ۔ نوالہ منہ میں رکھتا ہوں تو وہ لذت پائی جو عمر بھر کسی پلاؤ یا بریانی میں نہ پائی تھی ۔ اب تو خواهش ہوئی کہ اور مل جائے تو آج کھچڑی کے سوا کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاؤں مگر یہ حسرت دل ہی میں گھٹ کر رہ گئی ۔ فانی بھی اپنی امروز کی نادانی پر کئی برس افسوس کرتے رہے ۔ مگر وہ کھچڑی پھر کبھی کھانے کو نہ ملی ۔ جنت میں فانی کو میسر آئی ہو تو مجھے خبر نہیں ۔ دنیا میں تو اب ویسی نعمت کا ملنا محال معلوم ہوتا ہے ۔ کھوج لگانے پر معلوم ہوا کہ باورچی نے بادام مقشر کے چاول اس خوبی اور صفائی سے تراشے کہ اصل چاول اور ان مصنوعی چاولوں میں بال برابر کا فرق نہ معلوم ہوتا تھا ۔ اس طرح پستے کو تراش کر ماش کی دال سے ملا دیا تھا ۔ دم دیتے وقت اصلی چاول اور دال کے ساتھ ایک حصہ ان نقلی دانوں اور چاولوں کا بھی شریک کردیا تھا ۔ خدا جانے گھی برابر کا کھپایا تھا یا دگنا ۔ کیونکہ ہر پلاؤ اب اس کھچڑی کے آگے مجھے ہیچ معلوم ہوتا ہے ۔ پرنس کی عادت تھی کہ خاصے کے بعد صرف دو انجیر تناول فرماتے تھے کسی میوے کی طرف رغبت فرماتے میں نے کبھی نہیں دیکھا ۔ وہ سب محض میز کی زینت کے لیے رکھے جاتے تھے ۔ جو ڈنر کے بعد خدام کے کام آتے ہوں گے ۔ ایک ایک انجیر از راہ عنایت پرنس میری اور

فانی کی طرف بھی نام لے کر پھینک دیا کرتے تھے ۔

آج ٹیبل پر جموسیاں کو شیطان نے انگلی جو دکھائی تو قبل اس کے کہ پرنس انجیر کی پلیٹ کی طرف متوجہ ہوں انھوں نے اٹھ کرخود ہاتھ بڑھائے اور پرنس کے آگے سے دو انجیر اٹھا لیے ۔ یہ بہت بڑی گستاخی تھی پرنس بد دماغ ہوگئے ۔ ایک خدمت گار کوحکم دیا کہ انجیر کی پلیٹ جمو کے سامنے رکھ دو ۔

جمو اس برھمی کو سرفرازی جان کر دونوں ہاتھوں سے سلام لگے کرنے پرنس میری طرف دیکھ کر بے اختیار ھنسنے لگے میں بھی ھنس پڑا ۔

آصف جاھی سلاطین اور شاہ زادوں کے دربار کا آئین تھا کہ اگر بادشاہ کی کسی چیز کو دوسرا شخص ہاتھ لگا دے تو وہ چیز بادشاہ اسی کو بخش دیتے تھے ۔ پھر اسے اپنےمصرف میں نہ لاتے تھے ۔

آصف جاہ سادس نواب میر محبوب علی خاں خلد آشیاں کی خواب گاہ میں ایک فراش صبح کے وقت کمرے کی صفائی میں مصروف تھا ۔ سرکار مرحوم کی مسہری کے قریب پہنچا تو گول میز پر ایک خوش نما اور بہت چمکیلی شے رکھی ہوئی نظر آئی ۔ فراش اسے ہاتھ میں لے کر حیرت سے دیکھنے لگا ۔ اتفاق وقت اسی وقت سرکار بھی کسی ضرورت سے خواب گاہ میں تشریف لے آئے، سرکار کو دیکھ کر فراش کانپنے لگا ۔ چاھتا تھا کہ وہ چیز پھر اسی میز پر رکھ لے لیکن سرکار نے جن کی داد و دھش کے سامنے حاتم کی داد و دھش بھی ہیچ تھی بہ شفقت فرمایا کہ تولے لے ۔ ہم نے تجھے بخش دیا ۔ فراش کی جان میں جان آئی جھک کر آداب بجا لایا اور اپنے کم قیمت کوٹ کی جیب میں وہ بیش قیمت سگریٹ ہولڈر ڈال کر اس کمرے سے

رخصت ہوگیا ۔

دوسرے دن سے ادنیٰ درجے کے سگریٹ اس ہیرے کی سگریٹ ہولڈر میں لگا کر پینے لگا ۔ کچھ عرصے کے بعد سرکار بمبئی تشریف لے گئے ۔ اسٹاف اور شاگرد پیشہ کے ہمراہ وہ فراش بھی ساتھ گیا ۔ وہاں تاج ہوٹل میں سرکار مرحوم کا دو ہفتے قیام رہا ۔ اس عرصے میں ہوٹل کے ایک ایک بیرے سے فراش کا دوستانہ ہوگیا ۔ فراش حیدر آباد کا سیدھا سادا مسلمان تھا ، جسے آج تک یہ خبر نہ تھی کہ سرکار کی اس بخشش کے بعد وہ اب ادنیٰ درجے کا فراش نہیں رہا بلکہ چاہے تو خود بھی امیروں کی طرح پوری زندگی بسر کر سکتا ہے ۔

بیرا بمبئی کا باشندہ اور چلتا پرزہ تھا ، وہ سمجھ گیا کہ میرا بے وقوف دوست اپنے سگریٹ ہولڈر کی قدر و قیمت سے لا علم ہے ۔ روز فراش کی خاطر مدارات کرتا اور اس سے بہ تپاک ملتا ۔

جس روز فراش حیدر آباد کو واپس آتا تھا اس دن بیرے نے اسے لذیذ کیک اور نفیس پیسٹریاں کھلائیں۔ عمدہ سے عمدہ کولڈ ڈرنکس پلائے اس تواضع کے بعد حرف مطلب زبان پر لایا ۔ ”یار اب نہ جانے تم سے کب ملاقات ہو اگر مضائقہ نہ سمجھو تو اپنا سگریٹ ہولڈر مجھے دیتے جاؤ میرے پاس تمھاری مستقل یادگار رہے گی ۔ جس وقت میں اس میں سگریٹ لگا کر پیوں گا تم کو یاد کروں گا ۔ سادہ لوح اور بدنصیب فراش اپنے عیار دوست کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گیا اور بہ خوشی وہ سگریٹ ہولڈر اس کے حوالے کرکے شاہی اسٹاف کے ساتھ حیدر آباد چلا آیا ۔

بیرا اپنی پہلی فرصت میں اس سگریٹ ہولڈر کو ایک جوہری کے پاس لے گیا ۔ جوہری نے اس ہیروں کے سگریٹ ہولڈر اور بیرے کو بہ نگاہ حیرت دیکھا اور پہلی ہی نظر میں ڈیڑھ لاکھ

قیمت لگائی مگر یہ سوچ کر کہ یہ چوری کا مال ہے ایسا نہ ہو کہ مفت میں کسی مصیبت میں خود پھنس جاؤں اس نے بیرے کو سگریٹ ہولڈر سمیت حوالۂ پولیس کر دیا ۔ بمبئی کی پولیس تین دن کے اندر اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ ہو نہ ہو یہ بیش قیمت ہیرا حضور نظام کا ہے ۔ بیرے کا اظہار قلم بند کرکے اسے تو حوالات میں رکھا اور خود ایک افسر پولیس اسے لے کر حیدر آباد حاضر ہوا ۔

کوتوال شہر نے وہ ہیرا سرکار مرحوم کے سامنے پیش کیا ۔ واقعات سنائے اور عرض کی کہ سرقے کی علت میں تاج ہوٹل کا ایک بیرا ماخوذ ہوا ہے ۔ وہ کہتا ہے حضور نظام کے ایک فراش نے اسے چلتے وقت دوستانے میں دیا ہے ۔

سرکار مرحوم کو یاد آگیا کہ انہوں نے اپنا سگریٹ ہولڈر فلاں فراش کو عطا کیا تھا ۔ فراش طلب کیا گیا ۔ اس نے اقرار کیا کہ میں نے بمبئی سے روانگی کے دن بہ خوشی اس بیرے کو دیا تھا ۔

سرکار نے کوتوال کو حکم دیا کہ تم بمبئی کی پولیس کو اطلاع دے دو کہ سگریٹ ہولڈر بے شک ہمارا ہے مگر ہم نے اسے اپنے ایک فراش کو دے دیا تھا اس نے اپنی خوشی سے اس بیرے کو دیا ہے لہٰذا اب سگریٹ ہولڈر اسی بیرے کا ہے ۔ اس نے چوری نہیں کی بیرا فوراً رہا کردیا جائے اور سگریٹ ہولڈر اس کو دے دیا جائے ۔

قسمت کے کھیل دیکھیے کہ فراش عمر بھر فراش ہی رہا اور اس کی بدولت ایک ادنیٰ بیرا لمحوں میں دولت مند بن گیا ۔

جیب خالی پا کر میں نے ہاتھ نکالے ہی تھے کہ پرنس اصلِ حقیقت کو پا گئے اپنی عادت کے مواقق بہ آواز بلند ارشاد

فرمایا آج کیا بات ہے میں دیکھتا ہوں صدق جگالی نہیں کررہے ہیں ۔ میں اپنی جگہ کھڑا ہوگیا اور دست بستہ ہو کر عرض کیا بدقسمتی سے فدوی پان کی ڈبیا جیب میں رکھنا بھول گیا ۔ پرنس نے ہنس کر فرمایا اس میں بدقسمتی کی کیا بات ہے ۔ فانی آج تمھیں اپنی ڈبیا سے پان کھلائیں گے ۔ اس ارشاد کو سن کر فانی اپنی جگہ کھڑے ہوگئے اور ہاتھ جوڑ کر عرض کیا بدقسمتی سے آج فدوی بھی جیب میں ڈبیا رکھنا بھول گیا ۔ اس بد اتفاق پر پرنس ہنسنے لگے پھر خدام کو آواز دی اور ایک خادم سے فرمایا ''دیکھو ہمارے خاصے کے پانوں سے دوسو گلوریاں ایک کشتی میں رکھ کر بیچ میں خاصے کا قوام ایک شیشی میں نکال کر فوراً لاؤ اور صدق و فانی کے درمیان رکھ دو تا کہ دونوں جگالی شروع کریں ۔''

خادم بہت خوب کہہ کر پیچھے ہٹا ہم دونوں نے اس سرفرازی پر سات سات سلام کیے۔ میرا خیال تھا کہ اس حکم کی تعمیل میں کم از کم نصف گھنٹہ تو ضرور صرف ہوگا ،مگر آپ ہماری اس حیرت کا اندازہ نہیں فرما سکتے کہ جب اس خادم نے پانچ منٹ کے اندر چاندی کے ایک ٹرے میں دو سو گلوریاں نہایت سلیقے سے سجا کر ہم دونوں کے سامنے رکھ دیں۔ بیچ میں خوبصورت سی ایک شیشی میں خاصے کا قوام بھی تھا ۔ ہم دونوں پھر کھڑے ہوکر آداب بجا لائے ، لیکن پرنس نے منہ سے یہ نہیں فرمایا کہ پان کھاؤ اور بے اجازت خود گلوری کا اٹھا لینا آداب دربار کے خلاف تھا ''۔[1]

۱- ''رسالہ ساقی'' اپریل سنہ ۱۹۵۹ع -

امرا اور جاگیرداروں کے باورچی خانے

حیدر آباد کے بڑے امرا اور ذی مرتبہ جاگیر دار مثلاً پائے گاہی امرا سالار جنگ ، فخرالملک ، مہاراجا کشن پرشاد وغیرہ کے یہاں دو دو باورچی خانے ہوا کرتے تھے ایک مغلئی کھانوں کا باورچی خانہ اور دوسرا انگریزی کھانوں کا باورچی خانہ۔ ہر باورچی خانے میں کئی کئی باورچی اور دیگر ملازمین ہوتے تھے۔ امرا کے کھانے کے وقت کئی کئی خوان مطبخ سے مہر توڑے کے ساتھ جاتے اور دسترخوان پر چنے جاتے۔ بیسیوں طرح کے مغلئی اور انگریزی کھانے ہوا کرتے جو کھانا بچ جاتا وہ تقسیم کر دیا جاتا ۔

شاہان آصفیہ کے علاوہ بڑے بڑے جاگیر داروں کے پاس بھی یہ دستور تھا کہ باورچی خانے سے لوازمات ہر قسم کے کھانے بڑے بڑے خوانوں میں رکھ کر بستنیوں سے باندھ کر اوپر ایک چوکور کپڑا جو خاص اہتمام سے تیار کیا جاتا اور رنگ به رنگ کے ساتھ چمکتے مصالہ سے تیار ہوتا اس کو تورہ پوش کہتے ہیں اڑھائے جاتے اور خاصہ کے دسترخوانوں یا میزوں پر چنے جاتے۔ جاگیردار کے ساتھ کھانے والے اصحاب میں مصاحبوں ، دوستوں اور علاقے کے اعلیٰ عہدے داروں کی خاصی تعداد ہوتی ۔ تمام کھانے سلیقے سے چنے جاتے۔ صاحب خانہ (جاگیردار) وسط دستر خوان پر بیٹھا کرتا اور ان کے دونوں بازووں پر حسب مراتب صدر الذکر اصحاب بیٹھ جاتے ۔ صاحب خانہ کے بالکل سامنے میر مطبخ بیٹھا کرتا اور اس کا کام یہ ہوتا کہ ہر شخص کے لیے اس کے پلیٹ میں اشیائے خوردنی دیا کرتا پلیٹ یا رکابی عمدہ قسم کے ہوتے ۔

بعض جاگیرداروں کے پاس کھانا بجائے دسترخوان کے میز پر چنے جاتے اور بعض مرتبہ انگریزی طریقے پر کھانے تقسیم

کرتے تھے ۔

یہاں یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ جب انگریزی معاشرت کا رواج زیادہ ہوگیا ۔ تو روزانہ جاگیرداروں کے یہاں انگریزی طریقے پر ڈنر اور لنچ کا رواج ہوتا گیا ۔

راقم الحروف کو نواب معین‌الدولہ اور نواب سالار جنگ بہادر کے ساتھ کھانے کا اتفاق ہوا ہے ۔ انگریزی اور مغلئی دونوں طریقے کے کھانوں میں شرکت کا موقع ملا ہے ۔ بہر حال دولت اور تمول کے ساتھ سلیقہ اور سخاوت کی وجہ سے سینکڑوں اشخاص کی پرورش ہوتی تھی ۔

یہاں یہ بھی یاد رہے کہ جس طرح مسلمان امیروں اور جاگیر داروں کے دستر خوانوں پر بیسیوں اقسام کے کھانے آراستہ ہوتے اسی طرح ہندو جاگیرداروں کے یہاں بھی ہوتا ہے ۔ لوازمات میں کوئی فرق نہیں ہوتا ۔ مہاراجا کشن پرشاد راجا سیو راج وغیرہ کے دسترخوان اسی طرح کے ہوتے جس طرح مسلمان جاگیرداروں کے ہوتے تھے ۔ کھانے کا سلیقہ اور ہاتھ دھونے کے طریقے سب یکساں تھے ۔

امرائے پائے گاہ کے ذیل میں بعض واقعات درج کیے جاتے ہیں ۔ جن سے ان کے باورچی خانے کا حال منکشف ہوسکتا ہے ۔

ایک امیر پائے گاہ (مدار المہام سلطنت آصفیہ) کے پاس ایک باورچی ملازمت کے لیے آیا اور دو سو روپیہ ماہوار پر ملازم ہوا۔ کئی دن کے بعد مصاحبوں کے اصرار سے اس باورچی سے پکوان کی صراحت چاہی گئی کہ کیا پکوان تیار کرے گا ۔ اس نے کہا ”پہلے صرف ”دال“ تیار کی جاتی ہے“ اور اس کے لیے تین چار سو روپیے کی فرد حساب پیش ہوئی۔ اس فہرست میں دو اشرفی بھی شامل تھے ۔ یہ رقم اس کو دے دی گئی ۔ دال کے لیے بیسیوں مغزیات وغیرہ طلب کیے گئے اور جب دال تیار ہوئی تو اس باورچی نے

مہتمم مطبخ سے مطبخ میں آنے کی خواہش کی اور ان کے سامنے اشرفیوں کو آگ پر گرم کر کے "دال" میں ڈوبانا گیا ۔ اس طرح دونوں اشرفی راکھ بن کر دال میں محلول ہوگئیں ۔ اب دال تیار ہوئی اور دستر خوان پر پیش ہوئی ۔ سب نے عمدگی کی تعریف کی مگر بعض مصاحبوں نے کہا کہ صرف دال کے لیے اس قدر رقم خرچ کرنا کوئی عقلمندی نہیں ۔ نواب صاحب نے بلا کسی کام کے باورچی کو دو سو روپے پر ملازم رکھ لیا ہے ۔ باورچی خود دار تھا مفت تنخواہ لینے سے انکار کیا اور رخصت ہوگیا ۔

دوسرا واقعہ پائے گاہی عہدے دار اپنی اولاد کی شادیوں میں اپنے آقا کے دسترخوان کے لیے دعوت کا انتظام کرتے اس کا طریقہ یہ تھا کہ مہتمم باورچی خانے کو نقدی دی جاتی اور وہاں سے کھانے تیار ہوکر امیر کے دستر خوان پر پیش ہوتے ۔ مطبخ سے "چشک" کے طور پر اس عہدے دار کو نمونے کا کھانا جاتا ۔ یہ نمونے کے کھانے بھی کئی طرح کے ہوتے اور اس قدر کثیر ہوتا کہ کئی اصحاب کھاسکتے مثلاً میرے نانا مولوی حسین عطاءاللہ صاحب نے اپنے چھوٹے فرزند کی شادی کے موقع پر بیگم صاحبہ (محل نواب سر آسمان جاہ) جو اس وقت پائے گاہ آسمان جاہ کی حکمران تھیں (۱۴) خوان کا "تورہ" (دعوتی خاصہ کے مجموعے کا نام) ارسال کرنے کا انتظام کیا تھا اس چشک کے خوان نانا صاحب کے یہاں آئے تھے ۔ گھر کے تقریباً بیس پچیس خورد و کلاں نے سیر ہوکر کھائے تھے ۔

دکن کے دوسرے حصوں یعنی میسور اور ارکاٹ (مدراس) کے بادشاہوں اور دیگر اصحاب کے مکانوں کی تفصیل درج کی جائے تو کتاب غیر معمولی طور پر ضخیم ہو جائے گی ۔ خصوصاً مدراس کے رئیسوں اور اہل نوایط کے یہاں اہتمام سے جو شیریں اور نمکین پکوان تیار ہوتے تھے اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ

والا جاہ غلام محمد غوث کے زمانے میں کئی کتابیں پکوان کے متعلق تیار ہوئی ہیں جس میں اقسام طعام کی صراحت ہوتی ہے ۔ چنانچہ اس کتاب میں دوسری جگہ ان کی صراحت ہوئی ہے ۔

دکن کے کلچر میں اگر صرف نمکین اور شیریں کھانوں اور مشروبات کا تذکرہ کیا جائے تو ایک مستقل کتاب تیار ہوسکتی ہے ۔

ضیافتیں

شادی بیاہ کے موقع پر ضیافتوں کا سلسلہ طویل ہوتا تھا یعنی منجے ، ساچق ، مہندی ، عقد خوانی ، چوتھی ۔ ولیمہ اور جمعگی کے تقریبات میں حسب حیثیت ضیافتیں ہوتی تھیں ۔

طویل دستر خوان بچھائے جاتے اور ہر شخص یا چار اشخاص کے لوازمات سلیقے اور تکلف سے چنے جاتے کم سے کم چار اور زیادہ سے زیادہ دس پندرہ لوازمات ہوتے۔

دستر خوان کے تیار ہونے اور کھانے کے لیے مہمانوں کو طلب کرنے ، ہاتھ دھلانے ، پان سپاری تقسیم کرنے وغیرہ کا جو سلیقہ ہوتا تھا وہ اپنی آپ نظیر تھا ۔

ضیافتوں میں دوسری جنگ کے بعد کمی ہوگئی اور پولیس ایکشن کے بعد تو گویا اچھی ضیافتیں معدوم ہوگئیں ۔ نہ اہتمام رہا نہ تکلف ۔ دستر خوان کے چننے میں جو اصلاح زمانۂ مابعد میں ہوئی وہ یہ ہوئی کہ کھانے کے لیے چوکیاں رکھی جانے لگیں ۔ جس پر آٹھ اصحاب کے کھانے کا انتظام ہوا کرتا تھا ۔ کھانے کے لوازمات سلیقے اور تکلف و اہتمام کے ساتھ چنے جاتے تھے ۔ ایک عرصۂ دراز تک عقد خوانی صبح میں ہوتی تھی بعد طلوع آفتاب جلدسے جلد نکاح پڑھایا جاتا اور اس کے بعد مہمانوں کے کھانے

کا سلسلہ شروع ہوتا جو تین چار بجے تک تمام ہوتا ۔ مردانے کے کھانے کے بعد عورتوں کے کھانے کا سلسلہ شروع ہوتا تھا اور مہمانوں کے کھانے کے ختم کے بعد جلو کی تیاری ہوتی تھی ۔

گذشتہ جنگ یورپ کے دوران سے عقد خوانی کی ضیافت موقوف کرا دی گئی صرف چوتھی ہی کی دعوت ہونے لگی ۔

شادی بیاہ کے موقع پر حسب حیثیت عزیزوں ، دوستوں اور رشتہ داروں کی شادی کے گھر میں مہمان داری ہوتی تھی ۔ چار چار دن بلکہ آٹھ آٹھ پندرہ پندرہ دن تک بریانی اور لوازمات سے شکم سیر ہوتے پرتکلف ضیافت ہوا کرتی ۔

شادی بیاہ کے رسومات کے علاوہ تسمیہ خوانی ، ختنہ اور روزہ رکھائی وغیرہ کی ضیافتیں بھی اہمیت رکھتی تھیں ۔ خوشی کے تقریبات کا ایک طویل سلسلہ ہوتا تھا ۔ غم کے تقریبات میں بھی خصوصاً چہلم کی فاتحہ بڑے اہتمام سے ہوتی اس طرح سالانہ بھی ہوا کرتا ۔

ربیع الاول اور ربیع الثانی اور ماہ رجب میں نیازوں کا سلسہ رہا کرتا ۔ عقد کے ساتھ یہ تیاری ہوتی تھی ۔ سیکڑوں مہمان مدعو ہوا کرتے ۔ عام طور سے مسلمان طبقے میں کھانے کے لیے چینی اور تام‌چینی کے برتن استعمال ہوتے مگر دعوت کے موقع پر ہمیشہ چینی کے برتن استعمال ہوتے ۔

البتہ ادنیٰ طبقے میں تانبے کے برتن ہوتے ہیں ۔ ہندو اصحاب بھی جو جاگیردار وغیرہ ہیں اور اعلیٰ طبقے میں چینی کے برتن ہی کا رواج ہے ۔ یعنی تقریباً نصف حصہ چینی کے برتن کا استعمال کرتا اور نصف حصہ پیتل وغیرہ کے برتنوں یا پتروں میں کھاتا ۔ پولیس ایکشن کے بعد تھالیوں جو پیتل اور تانبے کے ہوتے ہیں اور اس کے کٹوروں کا استعمال ہونے لگا ۔

جس وقت صدر جمہوریہ حکومت حیدرآباد کے زمانے میں

حیدر آباد آئے تو آصف جاہ راج پرمکھ نے ان کے کھانے کے لیے چاندی کے برتن بنوائے تھے ۔

غرضیکہ کھانے کے لوازمات کے ساتھ اس کے کھانے کے برتن بھی اہمیت رکھتے ھیں ۔

تقریبات اور رسومات میں دعوت دینے کا طریقہ شمالی ھند کی طرح ”نائی“ کے ذریعے نہیں ھوتا تھا بلکہ خود میزبان جا کر دعوت دیا کرتے ۔

مگر زمانہ ترقی کرتا گیا تواولاً دعوتی رقعے تقسیم ھونے لگے یہ رقعے ایک سفید یا رنگین کاغذ پر لکھے جاتے اور ان کو لپیٹ کر دوسرے بڑے کاغذ میں لپیٹا جاتا اور اس کو ایک لیبل لگا کر بند کرتے اور نام لکھا کرتے تھے ۔

اس کے بعد جب مزید ترقی ھوئی تو رنگین بڑے بڑے کاغذوں پر رقعے طبع ھونے لگے اور ان کو تین تہہ کرکے موڑا جاتا ۔ ان پر بیل بوٹے ھوتے ۔ رقعوں کی عبارت فارسی میں لکھی جاتی ۔ نیاز ۔ فاتحہ ۔ چہلم کے رقعے سفید ھوتے ۔

اس کے بعد چھوٹے بڑے کارڈ طبع ھونے لگے اور عبارت اردو کردی گئی اور اب تو عبارت کو بالکل مختصر کر دیا جاتا ھے ۔

عورتوں کی دعوت کے لیے میزبان کی جانب سے قریبی عزیز خواتین جا کر مصری اور الائچی جن کو ورقعہ لگا ھوا ھوتا ھے اس کو ایک خوب صورت ڈبیا میں رکھ کر لے جاتیں اور اس طرح گھر کی تمام مستورات کو مدعو کرتیں ۔ اس کے بعد عورتوں کے نام بھی دعوت نامے ارسال ھونے لگے ۔ رقعوں کے نمونے ادارۂ ادبیات اردو میں موجود ھیں ۔

حقہ ۔ سگار ۔ سگریٹ وغیرہ

دکن کے تمدن کلچر میں حقہ ، سگار ، سگریٹ ، بیڑی وغیرہ کی صراحت کرنی ضروری ہے ۔

حقہ ہماری معاشرت کے قدیم لوازمات میں شامل ہے اس کا آغاز کب ہوا مجھے اس سے یہاں بحث نہیں ہے ۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ دکن کے مسلمان حکمرانوں کے زمانے سے دکن میں حقے کا رواج ہے ۔ حقہ در اصل کئی اجزا کے مجموعے کا نام ہے اور ہر چیز کا ایک خاص نام ہوتا ہے ۔ سب سے پہلے حقے کے نیچے کا وہ حصہ ہے جس میں پانی بھرا جاتا ہے اس کے اوپر کی جانب کھلا ہوتا ہے اور بازو کی جانب ایک ٹوٹی نما حصہ ہوتا ہے ۔ اس نیچے کے حصے کے کئی نام ان کی وضع کے لحاظ سے ہوتے ہیں چنانچہ ملاحظہ ہو ۔

حقے کا دوسرا جز لکڑی کا ایک اسٹینڈ ہوتا ہے ۔ جو درمیان سے نالی دار ہوتا ہے ۔ اس جزکو نیچا کہتے ہیں اس کا ایک سرا حقے کے نیچے کے حصہ میں بطور ڈاٹ کے لگایا جاتا ہے اور دوسرے سرے پر چلم رکھی جاتی ہے ۔ چلم مٹی کے علاوہ مختلف دھاتوں کی بھی بنائی جاتی ہے اور اس کی صورت کسی قدر مختلف ہوتی ہے ۔ چلمیں بعض زیادہ گہری ہوتی ہیں اور بعض کشادہ ۔ اس کے اندر توے پرگڑاقو لگا کررکھتے ہیں ۔ گڑاقو لگے ہوئے حصےکو اندر کی طرف اور توے کی پشت اوپر کی طرف ہوتی ہے ۔ اس پر آگ سے گڑاقو گرم ہوتا ہے تو لکڑی کی نالی سے دھواں نیچے اترتا ہے اور پیچ دان کے ذریعے حقہ پینے والے کے منہ میں آتا ہے ۔ پیچ دان نیچے کے سوراخ میں لگایا جاتا ہے ۔ نیچہ طویل بھی ہوتا ہے اور مختصر بھی ۔ نیچے کم قیمت کے اور زیادہ قیمت کے بھی ہوتے ہیں یہ بانس کی نالی پر سوتی پارچہ یا مخمل وغیرہ پر لپیٹا جاتا ہے ۔ زریں کلابتو بھی

اس میں استعمال کیا جاتا ہے ۔ حقہ ایک کشتی میں رکھا جاتا ہے اور بغیر کشتی کے بھی فرش پر رکھتے ہیں اس طرح حقے کے پانچ چھ اجزا ہوتے ہیں ۔

قدیم زمانے میں حقہ گویا مجلس اور محفل کے لوازمات میں شامل تھا ۔ بڑی محفلوں میں کئی کئی حقے رکھے جاتے تھے حقہ مشرقی تہذیب کے لوازمات میں شامل تھا گڑاقو قیمتی اور معمولی دونوں قسم کا ہوتا ہے جو قیمتی ہوتا ہے اس میں خوشبو زیادہ ہوتی ہے ۔ اس کے بنانے کا خاص طریقہ ہوتا ہے ۔ عموماً لکھنؤ کا گڑاقو زیادہ شہرت رکھتا ہے اس میں خوشبو کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے ۔ نیچے پر جو کپڑا لپیٹا جاتا ہے وہ اکژ و بیشتر سرخ یا نیلے رنگ کا ہوتا ہے ۔ جو زیادہ قیمت کا ہوتا ہے اس میں زر کی تار زیادہ استعمال کی جاتی ہے ۔

سگار اور سگریٹ مغربی تہذیب کے لائے ہوئے ہیں اور انگریزوں کے ساتھ ساتھ ان کی ترقی ہوتی گئی اب سگار اور سگریٹ حیدرآباد کا ایک بڑا حصہ استعمال کرتا ہے ۔

سگار جنوبی ھند میں عمدہ تیار ہوتا ہے ۔ سگریٹ کی دو بڑی فیکڑی یعنی چار مینار اور گول کنڈہ ہیں ۔ سگریٹ حیدرآباد میں تیار ہوتے ہیں اور دور دراز تک شہرت رکھتے ہیں ۔

بیڑی کا استعمال بھی حیدر آباد میں ہوتا ہے ۔ بیڑی تمباکو اور پتے سے بنائی جاتی ہے ۔ جو پتے بیڑی کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں اور تمباکو دونوں حیدر آباد میں کثرت سے ہوتا ہے ۔ بیڑی بنانے کے بھی کارخانے حیدر آباد کے علاوہ اضلاع اور دیہات میں بھی ہیں ۔ بیڑی کے لیبل رجسٹرڈ ہوتے ہیں تاکہ کوئی اس نمونے کا لیبل نہ بنا سکے ۔

بعض اصحاب انگریزوں کے طریقے پر تمباکو کو پائپ میں ڈال کر پیتے ہیں ۔

مہمان نوازی

کلچر کا ایک شعبہ مہماں نوازی بھی ہے حیدر آبادی اصحاب مہماں نوازی میں خاص شہرت رکھتے تھے - مہماں کی عزت ، تعظیم و تکریم جس خلوص اور محبت سے ہوتی اور مہماں داری کی جاتی ہے وہ مہمانوں کے اعتراف سے ہی ہوسکتی ہے -

حیدر آباد میں شخصی مہمانوں اور حکومت کے مہمانوں کی کمی نہیں تھی اور نہ ہے - حکومت آصفیہ کے دور میں حیدر آباد کے امراء ، جاگیردار اور عہدے دار اس وصف میں ہمیشہ ممتاز رہے -

ایک زمانہ تھا کہ حیدر آباد میں صرف چند ہوٹل تھے اور اس زمانے میں باہر سے آنے والے اصحاب عموماً اپنے احباب کے پاس ہی قیام کرتے تھے -

جامعۂ عثمانیہ کے قیام کے بعد حیدر آباد میں علم و فن سے زیادہ شغف ہوگیا اور باہر سے اصحاب علم زیادہ تعداد میں آنے لگے اور اس طرح حیدر آباد کی مہماں نوازی میں اضافہ ہوا -

اس موقع پر اس امر کا یہاں موقع نہیں ہے کہ حیدر آباد کی شخصی مہماں نوازی کے متعلق صراحت کی جائے اس کے لیے ایک حیثیت سے خود نمائی اور خود ستائی ہوگی - اس لیے صرف حکومت کے مہمانوں پر سرسری نظر ڈالی جاتی ہے -

واضح ہو کہ ہندوستان میں حکومت انگریزی کے زمانے میں برٹش انڈیا کے اعلیٰ سیول اور فوجی‌عہدے داروں کے علاوہ انگلستان کے شاہی خاندان کے افراد اور پھر ہندوستان کے گورنر جنرل حیدر آباد آتے رہے ہیں -گورنر جنرل جو حیدر آباد آئے ان میں لارڈ رپن سے آغاز ہوا اور لارڈ مونٹ بیٹن کے سوا باقی گورنر جنرل حیدرآباد آئے ہیں - پرنس آف ویلز کی حیثیت سے کنگ جارج اور کنگ ایڈورڈ اور جرمنی کے ولی عہد بھی حیدر آباد آئے - دیسی

ریاستوں کے کئی راجے مہاراجے آتے رہے ان کے حسب مراتب حکومت آصفیہ کی جانب سے مہان نوازی ہوتی رہی ۔

ایک زمانہ تھا کہ حیدر آباد میں ہوٹل کا قیام معیوب تصور کیا جاتا تھا اور جو اصحاب باہر سے آتے اگر ان کے دوست احباب عزیز و اقارب ہوتے تو ان کے رہنے کی سہولت ہوتی ۔ جو ایسے اصحاب نہیں ہوتے ان کی آمد بہت کم ہوتی تھی ۔ سنہ ۱۸۸۳ ع کے بعد انگریزی اور دیسی ہوٹل قائم ہونے لگے ۔ بتدریج اس میں اضافہ ہوتا گیا ۔ ہوٹلوں کے ساتھ کیفے اور ریسٹورنٹ بھی کھلنے لگے ۔ قدیم ہوٹلوں کی صراحت کی جائے تو ہمارا مقالہ ضخیم ہوتا جائے گا ۔

گذشتہ جنگ عظیم اور ہندوستان کی آزادی اور آندھرا پردیش کے بن جا ۔ کے بعد ہوٹل اور رسٹورنٹ میں بہت بڑا اضافہ ہوا ہے ۔

ہوٹل اور رسٹورنٹ دو قسم کے ہیں یعنی جہاں گوشت کی غذا ملتی ہے اور وہ جہاں گوشت کی غذا نہیں ملتی بعض ایسے ہوٹل بھی ہیں جہاں دونوں قسم کے پکوان ہوتے ہیں ۔ ایرانی کیفے اور رسٹورنٹ کی کثرت ہوگئی ہے ۔ اس موقع پر حیدر آباد کے قدیم ہوٹلوں اور جدید ہوٹلوں کا مختصر تذکرہ دلچسی سے دیکھا جاسکتا ہے ۔

شاہی مہمانوں کا جلوس

حیدر آباد کے قدیم جلوس میں شاہی مہانوں کا جلوس بڑی اہمیت رکھتا تھا ۔ حیدر آباد میں وائسرائے اور گورنر جنرل کی حیثیت سے اولاً لارڈ رپن سنہ ۱۸۸۳ ع میں حیدر آباد آئے ان کے بعد جو گورنر جنرل و وائسرائے مقرر ہوتے گئے وہ حیدرآباد آتے رہے اس کے علاوہ پرنس آف ویلز بطور کمانڈر انچیف اور بعض

گورنروں کی آمد بھی ہوئی ۔ قیصر جرمن کے شہزادے نے بھی حیدرآباد کا سفر کیا تھا ۔ مجھے لارڈ کرزن کی آمد کے بعد کے جلوسوں کا علم ہے ۔

اس کے بعد کنگ جارج اور پھر کنگ ایڈورڈ کی اپنے پرنس آف ویلز کے زمانے میں اور شہزادۂ جرمن کی آمد ہوئی تھی ان کے علاوہ کئی ایک وائسرائے حیدرآباد آئے۔

ان شاہی مہمانوں کا یہاں استقبال کا بڑا اہتمام ہوتا تھا لاکھوں روپئے صرف ہوتے تھے ان کے متعلق تین چار جلوس بڑی اہمیت رکھتے تھے - پہلا جلوس مہمان کی آمد پر ، دوسرا جلوس مہمان اور حضور نظام کی ملاقات کا ، تیسرا جلوس شاہی دعوت کا اور چوتھا جلوس بعض مرتبہ مہمان کی واپسی کے لیے ہوتا تھا ۔ بعض مرتبہ واپسی خانگی طور پر ہوتی تھی ۔

مجھے اس وقت تفصیلی صراحت کی ضرورت نہیں ہے کہ کس طرح شہر حیدرآباد کو جھنڈیوں عارضی کمانوں وغیرہ سے سجایا جاتا تھا ۔ اسٹیشن نام پلی سے شاہی مہمان کی قیام گاہ اور پنچ محلہ تک دو طرفہ رنگ برنگ کی جھنڈیاں آویزاں رہتیں اور راستوں میں کئی ایک کمانیں جو خوش نما ، خوش وضع اور خوش رنگ ہوتیں تعمیر کی جاتیں ۔ حیدرآباد میں اس زمانے میں سیمنٹ کے راستے تعمیر نہیں ہوتے تھے اس لیے راستوں پر گرد و غبار نہ ہونے کے لیے کثرت سے پانی کا چھڑکاؤ ہوتا تھا۔ بلدیہ کی جانب سے پانی کے چھڑکاؤ کا نہایت معقول انتظام ہوا کرتا ۔ اسٹیشن سے افضل گنج کے پل تک دو طرفہ باقاعدہ فوج کے سوار دس دس بارہ بارہ فٹ کے فاصلے پر ایستادہ کیے جاتے جن کے موسم گرما میں تو سفید ورنہ باناتی خوش رنگ زریں ملبوس ہوتے۔ افضل گنج کے پل اور شہر کے اندر (چونکہ پتھر گٹی کا راستہ کشادہ نہیں تھا ۔) باقاعدہ پیدل و انفنٹری کے سپاہی ایستادہ ہوتے تھے ۔ جلوس کے دیکھنے

کے لیے ہزاروں اشخاص مکانوں دوکانوں اور گھر کی چھتوں پر بڑی دیر سے منتظر ہوتے ۔ مہمان کو ، ریل کے آنے کے بہت پہلے سے سرکاری عہدے دار بڑے بڑے ساہوکار اور مشاہیر ملک اور امراء جاگیردار جن کو اسٹیشن پر آنے کی دعوت ملتی ، گھوڑا گاڑی کی سواریوں میں جاتے ۔ امرائے ملک یکے بعد دیگرے اپنے جلوس میں یعنی گاڑی کے آگے کئی سوار پھر ان کی گاڑی اور پھر پیچھے کئی سوار ہوتے ۔ مہمان کی اسپشل ٹرین پہنچنے کے پانچ دس منٹ پہلے حضور نظام کی سواری جلوس کے ساتھ آتی ۔ اولاً سدی رسالہ کے سوار جو خوش نما سیاہ کوٹ اس پر سرخ سفید لیس والے ڈریس میں برہنہ تلوار لیے ہوئے ، اس کے پیچھے حضور نظام کے خاص باڈی گارڈ ذرد کوٹ اس پر سرخ و سفید لیس اسی طرح برہنہ شمشیر لیے ہوئے ، اس کے بعد حضور کی گاڑی جس کو چار گھوڑے لگے ہوئے ہوتے گذرتی ۔ اس کے پیچھے پھر سواروں کا دستہ ہوتا اس کے بعد مصاحبوں ۔ شاگرد پیشوں اور خاصہ کے ملازمین کی کئی گاڑیاں ہوتیں ۔ حضور کی سواری میں کئی قسم کی گاڑیوں کا ہونا لازمی تھا ۔

امرائے ملک کے جلوس میں نواب معین الدولہ کا باڈی گارڈ ، جو پٹھانوں پر مشتمل تھا ، سبز کوٹ اور زرد لیس میں بڑا جاذب نظر منظر پیش کرتا تھا ۔ نواب صاحب کے ہمراہ زیادہ سے زیادہ سوار ہوتے دوسرے امراء کے ساتھ جو سوار ہوتے ان کی تعداد کم سے کمتر ہوتی تھی ۔

ان شاہی مہمانوں میں صرف لارڈ کرزن نے رزیڈنسی میں قیام کیا تھا مگر اس کے بعد جس قدر اعلیٰ حیثیت کے مہمان آئے وہ سب کے سب فلک نما میں مقیم ہوتے تھے ۔

اصل جلوس مہمان کی آمد کا ہوتا ۔ اسٹیشن میں گارڈ آف آنر کی سلامی ، امرائے ملک کی ملاقات اور عہدے داروں کے سلام کے

بعد جلوس روانہ ہوتا ۔ لارڈ کرزن کے جلوس کی صراحت یہ ہے ۔

اولاً سولجروں کا باڈی‌گارڈ ، اس کے بعد چوگڑہ میں لارڈ کرزن اپنی بی‌بی کے ساتھ ، سامنے وایسرائے کے سکریٹری اور رزیڈنٹ حیدز آباد ، ان کی گاڑی کے بعد پھر سولجروں کا رسالہ ، اس کے بعد حضور نظام کا سدی رسالہ اور باڈی گارڈ ، اس کے بعد اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خان اپنے ولی عہد (نواب میر عثمان علی خان کے ہمراہ) ، سامنے افسر الملک اور مولوی احمد حسین (امین جنگ) ، اس کے بعد وائسرائے اور اعلیٰ حضرت کے اسٹاف کی گاڑیاں ، پھر امرائے ملک کی سواریاں تھیں ۔ چونکہ اسٹیشن آتے وقت علیحدہ علیحدہ وقفے وقفے سے یہ اصحاب آتے تھے اور اسٹیشن سے واپسی پر یکے بعد دیگرے فوراً روانہ ہوتے اس لیے یہ جلوس خاصا طویل ہوتا اور کم از کم اسٹیشن سے رزیڈنس تک جلوس کا سلسلہ باقی رہتا تھا ۔ لارڈ کرزن کے بعد جب دوسرے مہمان یعنی پرنس آف ویلز اور شہزادۂ جرمن اور لارڈ منٹو آئے تو ان کے جلوس میں سولجروں کا باڈی گارڈ اور حضور نظام کا باڈی گارڈ ایک کے پیچھے دوسرا ہوتا اور ایک ہی گاڑی میں معزز مہمان اپنے اعلیٰ مرتبہ میزبان (حضور نظام) کے پہلو میں بیٹھا کرتے ، اس کے بعد دوسری گاڑی میں ان کی بی‌بی ہوتی تھی ، اس کے بعد ان کے اسٹاف کی گاڑیاں اور پھر امرائے ملک ہوتے تھے ۔ شاہی گاڑی کے ایک طرف کوتوال شہر اور دوسری طرف علاقۂ انگریزی کا کمانڈر گھوڑوں پر ساتھ ساتھ ہوتے ۔

شاہی مہمان کو قیام گاہ پر پہنچا کر حضور نظام اپنے جلوس کے کے ساتھ واپس ہوتے اس کے کچھ عرصے بعد چار امرائے ملک ایک ہی گاڑی میں معزز مہمان کی مزاج پرسی کے لیے جاتے ۔ یہ چار امراء اولاً شہاب جنگ ، فخر المک ، خان خانہ اور ظفر جنگ تھے ۔ مزاج پرسی کے بعد اعلیٰ حضرت کی سواری سابقہ جلوس کی طرح

یعنی سدی رسالہ اور خاص باڈی گارڈ کے ساتھ ملاقات کو جاتی اور اس کے چند گھنٹے کے بعد معزز مہمان باز دید کے لیے جلوس سے آتے۔ تیسرا جلوس شاہی دعوت کے موقع کا ہوتا یہ دعوت عموماً رات میں ہوتی مہمان کی قیام گاہ سے پنج محلہ اور رزیڈنس تک ٹٹیاں لگا کر گلاسوں کی روشنی ہوتی (کیونکہ اس زمانے میں برق روشنی حیدر آباد میں نہیں آئی تھی) لاکھوں گلاس اور لاکھوں قندیلیں اپنی روشنی سے روز روشن کا سماں پیش کرتے۔ شاہی ڈنر چو محلہ کے ''کل ہیران'' کے ایوان میں ہوتا تھا۔ جو خاصا کشادہ تھا۔ ڈنر کے بعد شاہی مہمان اور حضور نظام کی تقریریں ہوتیں اور جام صحت پیا جاتا تھا۔ ڈنر سے واپسی اسی طرح جلوس سے ہوتی مگر لارڈ کرزن کے وقت اکثر سولجر سوار گھوڑے پر سے گر پڑے کیونکہ ان کے لیے علیحدہ کھانے انتظام کیا گیا تھا اور کثرت سے شراب پی کر وہ بد مست ہوگئے تھے۔

جس زمانے سے برق روشنی حیدر آباد میں آگئی اس وقت سے تیل کے چراغوں کی روشنی بند ہوگئی۔ بہر صورت ڈنر کے موقع کی روشنی بڑی بہار دیتی اور اس کو دیکھنے کے لیے لوگوں کا بڑا مجمع ہوتا۔ عام آمد و رفت کو شاہی سواری کے گذرنے کے کچھ پہلے روک دیا جاتا اور سواری گذر جانے پر عام اجازت آمد و رفت کی ہو جاتی تھی۔ پولیس کا انتظام ٹرافک کا بہت اچھا ہوتا یک طرفہ گذرگاہ نہیں ہوتی بلکہ آمد و رفت کی دونوں طرف سے اجازت ہوتی اس کے باوجود پولیس کے حسن انتظام سے کوئی حادثہ نہیں ہوتا۔ روشنی کو دیکھنے کے لیے نہ صرف پیدل بلکہ سواریوں میں بھی لوگ اور پردہ نشین خواتین بھی جاتی تھیں۔ چونکہ ڈنر اور تقاریر وغیرہ کے لیے دو ڈھائی گھنٹے بعض مرتبہ ڈانس ہوتا تو چار گھنٹے بھی واپسی کے لیے ہو جاتے۔ اس لیے اس عرصے میں تماش بین اصحاب کی آمد و رفت ہوتی رہتی۔

پہلی جنگ یورپ کے بعد جب حیدر آباد میں موٹریں زیادہ ہوگئیں تو شاہی سہان کے جلوس موٹروں میں نکلنے لگے ۔ گاڑیاں اور ان کے آگے سوار باڈی گارڈ موقوف ہوگئے ۔ گھوڑے گاڑیوں کے زمانے میں جلوس کی جو شان و شوکت نظر آتی تھی وہ موٹروں کے زمانے میں موقوف ہوگئی ۔ گھوڑوں کی پرداخت اور نگہداشت پر بڑا اثر ہوا ۔ امراء اور عہدے داروں کے پاس جو بیسیوں گھوڑے اور ان کے متعلق نوکر ہوتے تھے سب موقوف ہوگئے۔ شان و شوکت کے رخصت ہونے کے ساتھ افلاس کا بھی دور دورہ ہوگیا ۔

لنگر کے بند ہونے سے جس طرح کئی باتوں کا نقصان ہوا اس طرح ان جلوسوں کے قدیم طریقے کے بند ہونے سے بھی کئی باتوں کا نقصان ہوا ۔ میسور میں اب تک دسہرے کا جلوس اسی شان و شوکت اور قدیم طریقے سے نکلتا ہے ۔ جو ایک قدیم رسم ہونے کے علاوہ اندرونی طور پر کئی اچھی باتوں کو پوشیدہ رکھتا ہے ۔ جس کے اظہار کی چنداں یہاں ضرورت نہیں ہے ۔

لباس

کلچر میں لباس کی بھی خاص اہمیت ہوتی ہے ۔ جب مسلمان دکن میں آئے تو وہ اپنا قومی لباس عربی ، ایرانی ، مغل اور افغانی استعمال کرتے تھے اور دکن کے ہندوؤں کا لباس جدا گانہ تھا ۔

مسلمانوں کے لباس میں عمامہ ، چوغہ ، شایا اور پائجامہ وغیر شامل تھے ۔ ہنود و انگرکھا اور دھوتی استعمال کرتے اور ایک خاص وضع کی پگڑی سر پر باندھتے تھے ۔

فیروز شاہ بہمنی اور سلطان محمد قلی قطب شاہ دکنی کلچر کو فروغ دینے والے تسلیم کیے گئے ہیں ۔

پروفیسر عبدالمجید صدیقی نے اپنی ”تاریخ گول کنڈہ“ میں لباس

سے متعلق جو صراحت کی ہے وہ حسب ذیل ہے ۔

"محمد قلی قطب شاہ نے جو قطب شاہی خاندان کا پانچواں بادشاہ ہے اپنے بدن سے تاتاری لباس بالکل اتار کر پھینک دیا تھا ۔ سر پر سمور کی کلاہ کے بجائے دکنی وضع کی پیچ دار پگڑی، پوستین اور باناتی قبا کے عوض ململ کا جامہ اور شبنم کا نیمہ پہنتا تھا اور ہاتھوں میں جڑاؤ کڑے ہوتے تھے ۔

امراء اور عوام بھی یہی لباس پہننے لگے تھے ۔ بعض بجائے قبا اور پوستین کے جو ترکستان اور ایران سے آئی تھیں جامہ اور نیمہ پہنتے تھے اور کم درجے کے لوگ ململ کا انگرکھا اور چوغہ پہنتے تھے ، جو خاص دکن کا ہوتا تھا ۔ سر پر دکنی وضع کی سفید یا رنگین پگڑی باندھتے تھے جو خاص دکن کاہوتا تھا اور پیر میں آبشاہی جوتی ہوتی ۔ سپاہیوں کے علاوہ عام لوگ بھی باہر نکلتے تو کمر بستہ اور مسلح ہوتے تھے اور تقریباً ہر شخص تلوار اور لکڑی کے ہاتھ جانتا تھا جو دکن کا خاص فن تھا ۔ جب امراء دربار میں جاتے تھے تو سر پر دکنی دستار پہنتے تھے اور کمر میں بکلوس باندھتے تھے[۱]۔"

یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مرد بھی قبا تنگ آستین کی استعمال کرتے ۔ بعض اوقات ایک نیم آستین قبا بھی اس پر ہوتی ۔ پاجامہ کبھی تنگ اور کبھی گھیر دار استعمال ہوتا تھا ۔ عام طور سے عمامہ باندھا جاتا جس کو کبھی پہنے بھی ہوتے تھے ۔

سلاطین دکن کے دورمیں عورتوں کے لباس میں لہنگا اور دامن اور چولی کا رواج تھا پیٹ اور پیٹ نظر آتا تھا[۲]۔

---

۱ - "تاریخ گولکنڈہ" صفحہ ۲۷۲

۲ - "مقالات ہاشمی" صفحہ ۵۲

جب مغلیہ دور کے بعد آصفیہ دور آیا تو کم و بیش یہی لباس رائج رہا ۔ سفید جامہ گھیر دار عام طور سے استعمال کیا جاتا تھا ۔ امراء اور وزراء کے جامے زیادہ گھیر دار ہوتے تھے ۔ جب انگریزی معاشرت حیدر آباد میں رائج ہوئی تو لباس بھی تبدیل ہوتا گیا ۔

ترکی ٹوپی ، ایرانی ٹوپی ، شیروانی ، قمیص اور پاجامہ مردوں کے لباس کے اجزاء بن گئے ۔ چڑاوا ، بوٹ اور شوز بھی استعمال ہونے لگے ۔

لباس کے متعلق مصنف ''گذشتہ لکھنؤ'' نے بڑی اچھی صراحت کی ہے اور اس اس کا اعتراف کیا ہے کہ شیروانی کی ایجاد حیدر آباد دکن میں ہوئی چنانچہ ایک اقتباس پیش ہے :

''پہلے عرب مسلمان جو یہاں پہنچے وہ اگرچہ کرتے ، تہبند ، اور عبائیں پہنتے تھے ۔ مگر لباس و وضع میں انھیں یہاں کے لوگوں پر کچھ زیادہ فوقیت حاصل تھی ۔ لباس میں ترقی اس وقت سے شروع ہوئی جب ساسانی معاشرت اختیار کرکے بغداد کے عباسی دربار نے شرفائے عرب کے لیے پاجامے ، عبا ، قبا اور خوش قطع عمامے ایجاد کیے ۔ جو لباس کہ کلیتاً زیادہ تر ساسانی دربار کے امراء و اعیان کی وضع سے ماخوذ تھا ، چند ہی روز میں وہی لباس ان تمام مسلمانوں کا ہوگیا جو مصر سے دریائے سندھ کے کنارے تک پھیلے ہوئے تھے اور آخر وہ اس لباس کو لیے ہوئے ہندوستان میں آئے ۔ تصویروں میں جو لباس عہد اولین کے مسلمان تاجداران ہند کا نظر آتا ہے وہ قریب قریب وہی ہے جو عجمی و عباسی امراء فرمان رواؤں کا تھا ۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں کے سلاطین ہند دوسرے راجاؤں کی تقلید میں جواہرات بہت پہنا کرتے تھے ۔

دھلی میں دربار مغلیہ کا آخری لباس جو ہمیں معلوم ہوسکا

یہ تھا کہ سر پر پگڑی ، بدن میں نیم جامہ ، ٹانگوں میں ٹخنوں سے اونچا تنگ مہری کا پاجامہ ، پاؤں میں اونچی ایڑی کا کفش نما جوتا اور کمر میں جامے کے اوپر پٹکا ۔ بس یہی دھلی کی قدیم شرافت کی وضع تھی ۔ جس میں محمد شاہ رنگیلے کے زمانے تک کسی قسم کا رد و بدل نہیں ہوا تھا اور اگر ہوا بھی ہو تو اتنا نہ تھا کہ ہم کو نظر آ سکے ۔

اس لباس میں نیمے سے مراد کہنیوں تک کی آدھی آستینوں کا شلوکا تھا اور سینے پر سامنے اس میں کھنڈیاں لگائیں جاتی تھیں ۔ اس کو نیچے پہن کے اس کے اوپر جامہ پہنا جاتا تھا جو عجمی قبا میں ترمیم کر کے بنایا گیا تھا ۔ اس میں گریبان نہ ہوتا تھا ، بلکہ دونوں جانب کے کنارے جو "پردہ" کہلاتے تھے ترچھے ایک دوسرے پر آکے سینے کو ڈھانک لیتے تھے ۔ سینے کا بالائی حصہ جو گلے کے نیچے ہوتا ہے اسی طرح کھلا رہتا تھا جیسے آج کل انگریزی کوٹوں میں کھلا رہتا ہے ۔ جس طرح فی الحال قمیص سینے کے اوپر والے حصے کو چھپاتی ہے اسی طرح ان دنوں نیمہ اس کو ڈھانکے رکھتا تھا ۔ سینے پر جامے کا وہ پردہ جو بائیں طرف سے آتا ہے نیچے رہتا اور داھنے پہلو پر بندوں سے باندھ دیا جاتا تھا اور اس پر داھنی طرف کا پردہ رہتا جو اوپر بائیں پہلو میں باندھا جاتا ۔ پھر اس میں کمر کے پاس سے دامنوں کی عوض ایک اسکرٹ میں جوڑ دی جاتی جو ٹخنوں کے اوپر تک لٹکتی رہتی اور اس میں بہت سی چنت دی جاتی اور اس کا گھیر بہت بڑا ہوتا ۔ جامے کی آستینیں آدھی کلائی تک بے سلی اور کھلی ہوتیں جو دونوں جانب لٹکا کرتیں ۔ اس کے نیچے سیدھی سادی تنگ مہریوں کا پاجامہ ہوتا جو امراء میں مشروع اور گلبدن کا ہوتا تھا پھر جامے کے اوپر کمر میں پٹکا باندھ لیا جاتا ۔

دوتین صدی پیشتر ہمارے بزرگوں ، ہندوستان کے امیروں اور تمام شریفوں کا یہی لباس تھا ۔ ٹوپیوں ، پگڑیوں اور پاجاموں میں جو ترمیمیں ہوئیں ان کا مفصل و مشرح حال تو اصلی لباس ہے ۔ اور اس سے انسان کی وضع قطع مشخص و متعین ہوتی ہے یہی اس دور کا درباری لباس تھا اور یہی لباس پہنے ہوئے نواب برہان‌الملک ، میسور جنگ اور شجاع الدولہ دہلی سے اودھ میں آئے تھے۔ جامے عموماً باریک ململ کے ہوتے تھے جو ہندوستان کے مختلف شہروں میں نہایت باریک اور سبک بنی جاتی اور ساری دنیا میں مشہور تھی ۔ ڈھاکے کی ململ اور جامدانی عالی مرتبہ امیروں اور بادشاہوں کے لیے مخصوص تھی ۔

اس کے بعد ایرانی قبا سے ماخوذ کرکے بالابر ایجاد ہوا ۔ جس میں گول گریبان بالکل کھلا رہتا ، اس لیے کہ سینے کے ڈھانکنے کے لیے نیمہ کافی تھا جو اس کے نیچے بھی پہنا جاتا تھا ۔ چنت اور گھیر اس میں سے نکال دیا گیا تھا ، اس ضرورت سے کہ دامن آگے کی طرف نہ کھلیں ، داھنے دامن میں ایک چوڑی کلی لگا دی جاتی تھی ۔ یہی کلی اس کلی کا نقش اولین ہے جو فی‌الحال شیروانیوں میں بائیں جانب نیچے لے جا کے بند سے باندھی یا ھک سے اٹکائی جاتی ہے ۔ بالابر بھی دہلی ھی کی ایجاد ہے ۔

اسی بالابر کو ترقی دے کر دہلی میں انگرکھا ایجاد کیا گیا ، جس میں دراصل جامہ اور بالابر دونوں کو ملا کے ایک قطع پیدا کی گئی ۔ اس میں سینے پر چولی قبا سے لی گئی مگر سینہ کھلا رکھنے کی جگہ ایک گول اور لمبوتڑا گریبان بڑھایا گیا ۔ جس کے اوپر گلے کے نیچے ایک ہلال نما کنٹھا لگایا جاتا اور وہ بائیں طرف گردن کے پاس گھنڈی یا تکمے سے اٹکا

دیا جاتا اور چولی نیچے رہتی ۔ جس میں پہلے داھنی طرف کا پردہ نیچے بغل میں بندوں سے باندھ دیا جاتا ۔ پھر اوپر بند ہوتے جس سے دونوں طرف سینے کے نیچے بیچوں بیچ میں لا کے باندھ دیے جاتے ۔ اس میں بائیں جانب تھوڑا سا سینہ کھلا رہتا ، چولی نیچی رہتی اور نیچے دامن اگرچہ قبا کے سے ہوتے مگر پرانے جامے کی یادگار میں دونوں پہلو پر بغلوں کے نیچے چنت ضرور رکھی جاتی ۔

یہ پرانا انگرکھا تھا جو دھلی کے آخری دور میں رواج پا چکا تھا اور وہاں سارے ہندوستان میں پھیل گیا ۔ لکھنؤ میں آنے کے بعد اس انگرکھے مین زیادہ چستی اور قطع داری پیدا کی گئی ۔ چولی خوب گول ، اونچی اور کھنچی ہوئی چست ہوگئی ۔ بغلوں کی چنت بالکل نکل گئی ۔ دامنوں میں بجائے موڑ کے ٹانک دینے کی سنجافی گوٹ لگائی ، پھر اس کے بعد نواب زادوں اور شوقین وضع داروں نے ایک کمرتوتی کے عوض جو چولی کے نیچے بند لگانے پر ہوتی ، پلیٹوں کی وضع تین تین کمرتوئیاں لگائیں ۔ جا بجا گوٹ اور کمرتوئیوں کے پاس کٹاؤ کا کام بنایا ۔

دھلی میں انگرکھے کے ایجاد ہونے کے بعد نیمہ چھوٹ گیا اور بائیں جانب سینے کا کھلا رہنا معیوب نہ تھا ۔ بلکہ وضع داری کا خیال کیا جاتا تھا ۔ لکھنؤ میں اس کے نیچے نیمے کے عوض شلوکا ایجاد ہوا ، جس میں آگے کی طرف بوتام لگائے جاتے ، اس لیے کہ اب یورپ کے بوتام یہاں پہنچ گئے تھے ۔ شلوکوں میں خاص وضعداری دکھائی جاتی تھی ۔ نازک مزاج لوگ جالی یا بابرلیٹ کے چست شلوکے پہنتے تھے جن میں کچے سوت سے نقش و نگار کاڑھے جاتے تھے ۔ بعض لوگ رنگین شلوکے پہنتے تھے اس لیے کہ اس کے بیل بوٹے اور اس کا رنگ

تنذیب کے سپید الگرکھے کے نیچے سے اپنی جھلک دکھا کے خاص لطافت اور خاص نفاست پیدا کرتے تھے ۔

دوسری ترسیم بالاپر میں دربار لکھنؤ آنے کے بعد یہ ہوئی کہ چکن کے نام سے ایک چست قبا ایجاد ہوئی اس میں ویسا ہی گول گول گریبان رکھا گیا اور اس میں انگرکھے کی طرح سینے پر پردہ بھی لگایا گیا ۔ مگر وہ پردہ داھنی جانب قوس نما صورت میں بوتاموں سے اٹکایا جاتا تھا ۔ اس میں داھنی جانب گلے کے پاس سے بوتاموں کی ایک خوشنما قوس گولائی لیتی ہوئی کوڑی تک آتی اور اس کے مقابل دوسری جانب کی قوس میں اصلی قبا سے سی دیا جاتا ۔ اس میں بھی بالابر کی طرح چوڑی کلی اوپر لگائی جاتی جو بغل کے نیچے بائیں طرف بوتام یا گھنڈی سے اٹکا دی جاتی ۔ یہ چکن جو شال یا کسی بھاری کپڑے کی ہوتی تھی جاڑوں کے موسم کے لیے زیادہ موزوں تھی ۔ ایک زمانے میں یہاں اہل دربار اور خاصتاً اہل‌کار و باریابان دربار کا معزز لباس تھی ۔ اسے انگریزوں نے بھی بہت پسند کیا اور اپنے ملازمین کو ایک مدت تک وہی پہناتے رہے ۔

سب کے بعد لکھنؤ کے بالکل آخری عہد میں چکن اور انگرکھے دونوں کے ترتیب دینے سے اچکن ایجاد ہوئی ۔ اس میں انگرکھے اور چکن کا سا گریبان قایم رکھا ، جو بیچ سے سیدھا کاٹ کے آدھا دونوں جانب سی دیا جاتا اور سلائی کی جگہ پر سنجاف گوٹ کے ذریعے گریبان کی گولائی اور قطع برقرار رکھی جاتی ۔ بیچ کے چاک میں جو گلے سے لے کے سیدھا کوڑی تک آتا بوتام لگا دیے جاتے ۔ بالابر کی کلی جو اوپر لگائی جاتی تھی اس میں نیچے کو دی گئی تاکہ دامن بھی نہ کھلیں اور بالابر کی کلی کے اوپر کی طرف لگانے سے

جو بدمذاق ظاہر ہوتی تھی اور دور ہو جاتے۔ اچکن کے نیچے کا حصہ بالکل چمکن اور انگرکھے کا سا ہوتا۔ شوقین لوگ اس میں بھی ویسی ہی دو دامن کوٹ اور اسی طرح کی تین تین کمرتوئیاں لگاتے اور کٹاو کا کام بناتے۔

یہ آخری ایجاد اچکن کی لوگوں کو بہت پسند آئی۔ اس کا رواج شہر سے گذر کے دیہاتوں میں بھی شروع ہوا اور آناً فاناً سارے ہندوستان میں پھیل گیا۔ یہی اچکن حیدر آباد پہنچ کے تھوڑی سی ترمیم کے بعد شیروانی بن گئی۔ وہاں اس کی آستینیں انگریزی کوٹ کی سی کر دی گئیں۔ گریبان جو گوٹ لگا کے سینے پر نمایاں کیا جاتا تھا نکال ڈالا گیا۔ قطع و برید میں انگریزی کوٹ کی وضع دامنوں وغیرہ میں بھی اختیار کی گئی اور وہ لباس ایجاد ہو گیا جو آج کل ہندوستان کے تمام لوگوں کا قومی لباس کہے جانے کے قابل ہے۔ لکھنؤ والوں نے بھی جب چند روز بعد اپنی پرانی ایجاد میں حیدرآباد کی مناسب اصلاح دیکھی تو اسے بہت ہی پسند کیا۔ اور تھوڑے ہی زمانے میں شیروانی کا رواج ہر شہر اور قصبے کی طرح لکھنؤ میں بھی ہوگیا۔

انگرکھے کے نیچے جو شلوکا پہنا جاتا تھا اس کے عوض پہلے ڈھیلا اور اونچا کرتا اختیار کیا گیا اور چند روز بعد مغربی اثر نے کرتا چھڑا کے انگریزی قمیص کو رواج دیا۔ اس میں کف اور کالر ہوتے ہیں۔ قمیص اور کالر کے رواج نے شیروانی کے تکلفات اور بڑھائے یعنی لازمی ہوگیا کہ سفید کالر اوپر نکلا رہے اور شیروانی کے اوپر کا سرا اگلے ہک سے اٹکا کے قمیص کے اس بالائی بوتام کے نیچے رہے جس میں کالر لگایا جاتا ہے۔ آستینیں اتنی رہیں کہ کفوں کا کسی قدر حصہ نکلا رہے۔ تعلیم یافتہ لوگوں اور متوسط طبقے والوں

کے لباس میں دوسرے شہروں کی طرح فی الحال لکھنؤ میں بھی یہی شیروانی ہے مگر اس کو لکھنؤ سے خصوصیت نہیں ۔ لکھنؤ کی ایجاد و اختراع کا خاتمہ اچکن پر ہوگیا ۔ جو اب قریب قریب بالکل متروک ہوگئی ہے۔[1]''

دکن خصوصاً حیدر آباد کے لباس کی پوری تفصیل کے لیے ولا گزیٹر کی صراحت قابل ملاحظہ ہے :

''دیہاتی لوگوں کا عام لباس مرہٹواری (مہاراشتر) میں ایک دھوتی و جانگیا یا صدریہ اور سرخ یا سفید پگڑی پر مشتمل ہے اور تلنگانہ (اندھرا) میں سفید ہی پگڑی سر پر رکھتے ہیں ۔ علاوہ اس کے کمل تو سب کے لیے ناگزیر ہے ۔ عورتیں ایک ساڑی پانچ چھ گز کی لمبی اور سوا گز عرض جس کا ایک سرا کمر کے اطراف لپیٹا جاتا ہے اور دوسرا پلو سر اور جسم کو ڈھانپ لیتا ہے اوڑھتی ہیں ۔ اس کے علاوہ چولی بھی ہوتی ہے جو سینے کی حفاظت کرتی ہے ۔ یہ لباس دیہات میں مسلمانوں اور ہندو دونوں میں مشترک ہے ۔ لیکن اکثر مسلمان عورتیں لہنگا ، چولی اور دوپٹا بھی اوڑھتی ہیں ۔ گونڈ اور وڈر ذاتوں کی عورتیں چولی بالکل استعمال نہیں کرتیں ہیں ۔ بلکہ اسی ساڑی کے بالائی پلو سے سینے کو ڈھانپ لیتی ہیں ۔[2]''

اب ہم لباس کے اجزاء کی طرف توجہ کرتے ہیں ۔ دکن میں مردوں اور عورتوں میں آج سے پچاس ساٹھ سال سے پہلے جو لباس مروج تھا اور اب جو لباس رائج ہوگیا ہے اس کی صراحت کی جاتی ہے ۔

۱۔ ''گذشتہ لکھنؤ'' صفحہ ۱۶۶ تا ۱۷۱

۲۔ ''گزیٹر حیدر آباد'' صفحہ ۳۸ ۔

سر کے لباس میں عمامہ جس کو شملہ کہتے ہیں ، ترکی ٹوپی اور ایرانی ٹوپی رائج تھی - سب سے زیادہ غلبہ ترکی ٹوپی کو تھا - شیروانی ہر قسم کے کپڑے کی ہوتی تھی - شادیوں میں مرد بھی رنگین ریشمی و اطلسی، ہمرود کی استعمال کرتے - موسم سرما میں ٹوٹ کی شیروانیاں اور بارش اور گرما میں سلک اور سفید باریک سوتی کپڑے کی پہنی جاتی تھیں - سوتی کپڑے کی شیروانیاں عام تھیں - شیروانی کے اندر ململ کا کرتا یا قمیص جو خاص طور سے قمیص کے لیے تیار ہوتے ہیں استعمال ہوتے - پاجامہ دوہرا یا کشادہ پائنچے کا استعمال ہوتا - پاؤں میں بوٹ شوز - چڑاوا اور سرما میں پائتابہ بھی استعمال ہوتے -

اس مجمل تذکرے کے بعد مزید صراحت کی جاتی ہے تاکہ گذشتہ لباس کی پوری تاریخ سامنے آ جائے - واضح ہو کہ دکن کے لباس کے متعلق اولا سر سے آغاز کرنا چاہیے - مسلمانوں کی حکومت کے آغاز سے ہی حکومت کا شاہی اور درباری لباس اور عام لباس میں زیادہ تر عمامہ دستار کا رواج رہا - مگر اس میں نہ صرف امراء کے خاندانوں اور بعض بڑے مخصوص جاگیر داروں کے دستار کی بناوٹ میں فرق اور امتیاز رہا بلکہ طبقہ وار اور ملازم ادنیٰ مثلاً چوب دار ، بھال دار اور شا گرد پیشہ وغیرہ کے دستاروں میں فرق مراتب کا لحاظ ہوتا تھا - پھر حکومت میسور ارکاٹ اور آصفیہ دور کے دستاری وضع میں فرق ہوا - دستار باریک ململ کے چیریوں سے بنائی جاتی - سفید اور رنگین دونوں دستار بنائی جاتی تھیں - ''دستار بندی'' ایک پیشہ ہوگیا تھا جن کی کمائی دستار بندی سے ہوتی تھی - اکثر شاہی دستار اور امراء حکومت اور ملازمین شاہی وغیرہ میں جس نہج کی دستار استعمال ہوتی تھی اگر ان کے نمونے پیش کئے جائیں تو کئی صفحے درکار ہوں گے -

''دستار'' کے بعد ''شملہ'' عمامہ (عربی وضع کی پگڑی) کو

لیجئے - مارواڑ گجرات ، مہاراشٹر اور تلنگانہ وغیرہ کے عوام سر کے لیے پگڑی بھی استعمال کرتے تھے اور اب بھی پگڑیوں کا رواج ہے - اس کے علاوہ ترکی ٹوپی ، اقبال شہی ٹوپی (جس کو حیدرآباد میں نواب اقبال الدولہ امیر پائیگاہ نے ایجاد کیا تھا) اور کشتی نما ٹوپی ، ایرانی ٹوپی ، پارسی ٹوپی مخملی چھوٹی دیوار والی ٹوپی ، سفید کپڑے کی ٹوپی - غرض سر کے جو لباس تھے اس کے بیسیوں اقسام اور نہج تھے - اب ان سب کا رواج باقی نہیں رہا -

''سر'' کے بعد جسم کے لباس ہیں - پہلے جامہ ، نیمہ اور انگرکھا رہا - حیدر آبادی نواب مختار الملک اول کے دور سے ''شیروانی'' کا رواج تھا اور شیروانی کی ایجاد کا سہرا حیدر آباد کے سر ہے - جس کا اعتراف مولانا شرر نے ''گذشتہ لکھنؤ'' میں کیا ہے -

جب شیروانی کا آغاز ہوا تو اس کی صورت موجودہ شیروانی سے کسی قدر مختلف تھی - یعنی اب ایک طبقہ کلی‌دار شیروانی کا استعمال کرتا اور ایک طبقہ بلا کلی کے - اس کو اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ آج کل جو شیروانی استعمال ہوتی ہے وہ بلا کلی‌دار ہے ، کلی دار شیروانی میں اگلے اور پچھلے حصے میں ایک سہ کونا کپڑا مزید استعمال ہوتا ہے - کلی‌دار شیروانی کے بعد بلا کلی کے شیروانی استعمال ہونے لگی - علماء ، مشائخین اور بعض خاص خانوادوں میں شیروانی کے اوپر جبہ بھی پہنا کرتے تھے -

شیروانی کے اندر قمیص یا کرتا پہنا جاتا ہے - کرتا باریک ململ کا ہوتا ہے اور قمیص کسی قدر دبیز کپڑے کی -

پاجامے کے بھی نہج جداگانہ تھے - حیدر آباد میں دوھرا یعنی جو کسی قدر تنگ ہوتا ہے - اس کی ایجاد کا سہرا نواب اقبال الدولہ کے سر ہے - حیدرآبادی خواص اور عوام میں اس کا زیادہ رواج تھا - پاجاموں میں پائنچے تنگ ، کشادہ اور کشادہ تر استعمال ہوتے تھے-

دکن کے دوسرے حصوں میں بھی پاجامہ کشادہ پائنچوں کا استعمال ہوا کرتا۔

پاجامے کے بعد پاؤں کے لیے چڑاوا ، بوٹ ، شوز ، سلیپر اور اپا شاہی جوتے رائج تھے۔ انگریزی طرز کے لباس کے پہلے زیادہ تر چڑاوا جس کو سلیم شاہی اور پنجابی کہتے تھے زیادہ رواج تھا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ بوٹ شوز نے جگہ لے لی۔

پہلے زمانے میں ایک رومال ضرور رکھا جاتا تھا۔ بہترین تہذیب نے اس کی جگہ دستی کو دے دی۔ پہلے زمانےمیں شال بھی اوڑھی جاتی تھی۔

اس کو بھی فراموش کرنا چاہیے کہ حیدر آباد میں چڈھی کا استعمال نہیں تھا۔ اب اس کو "نیکر" کا نام دے کر بچوں کے لیے بہت زیادہ استعمال کرنے لگے ہیں نیکر کا آغاز" بوائے اسکاوٹ" کے آغاز سے ہوا ہے ، چونکہ ان کے ڈریس میں پینٹ کے بجائے نیکر شامل تھی اس لیے اس کا طریقہ جاری ہو گیا۔ اسکول کے طلباء اس کا استعمال کرنے لگے تھے۔

مغربی تہذیب کے اثر سے مغربی لباس یعنی کوٹ ، پتلون ، قمیص ، کالر اور ٹائی وغیرہ وغیرہ مقبول ہوگئیں تھیں۔

دولھوں اور دلھنوں کا لباس

دکھنی کلچر میں دولھوں اور دلھنوں کے لباس کی صراحت بھی ضروری ہے۔ اس میں بھی زمانے کے لحاظ سے تغیرات ہوگئے ہیں ۔ سلاطین دکن اور پھر آصف جاہی دور کے آغاز سے لے کر عصر حاضر تک پانچ سو سال کا طویل زمانہ گزرا ہے۔ اس پانچ سو سالہ دور میں دولھوں اور دلھنوں کے لباس میں تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ مگر اس تبدیلی میں زیادہ تغیرات نہیں ہوئے۔ دولھوں اور دلھنوں کے لباس میں اولاً سر کا لباس لیا جائے تو واضح ہوتا

ہے کہ جو دستار یا پگڑی سلاطین دکن اور آصف جاہی سرکاروں کے درباری لباس میں شامل تھی وہی دولھوں کے لیے رائج تھی۔ اسی قسم کی دستار یا پگڑی دولھوں کے سر کا لباس ہوا کرتا رہا۔ البتہ عام دستار یا پگڑی جو ململ کی ہوتی تھی اس کے بجائے زرین کپڑا استعمال ہوتا تھا۔ دستار پگڑی اور عمامے کے ساتھ زرین ریشمی شملے بھی سر کے لباس میں شامل رہے ہیں۔ اس کے بعد رومی ٹوپی یا ایرانی ٹوپی آ گئی۔ دستار زرین کے علاوہ ململ کی رنگین دستار بھی حیدر آباد میں رائج رہی ہے۔ کرتا یا قمیص رنگین اور ریشمی لباس کے اجزا میں شامل رہے۔ اس کے بعد "جامہ" رنگین گھیر دار، جسے زمانۂ ما بعد میں خلعت کا نام دیا گیا، یہ زرین کپڑے کا بنایا جاتا اور عام طور سے دلھوں کے لیے ضروری تھا جو اکثر کرائے پر بھی مل جاتا تھا۔

یہ خلعت ایک خاص وضع کی ہوتی تھی جس کو شیروانی اور انگرکھے کا درمیانی درجہ قرار دیا جانا چاہیے۔ اب گذشتہ نصف صدی سے خلعت کے بجائے زرین یا کمخواب یا مشجر کی شیروانی دولھے استعمال کرتے ہیں۔ جو بدن کے موافق سلوائی جاتی ہے۔ بعض علماء اور بعض مشائخین کے نزدیک زرین لباس مردوں کے لیے ناجائز تصور کیا جاتا ہے۔ اس لیے ہمرود اور جامہ وار وغیرہ کے شیروانیاں استعمال کی جاتیں ہیں۔ غرض کہ دکنی کلچر میں شیروانی خاص اور اہم جزو ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ مرد بھی زرین اور ریشمی پاجامہ پہنا کرتے تھے اور اس کو "تمان" کہا جاتا تھا۔ امراء، جاگیر دار، راجا اور مہاراجا اس کو استعمال کرتے تھے۔ یہی تمام لباس کا جزو دولھوں کے لیے قرار دیا گیا۔ کمخواب کا بڑے بڑے پائنچوں کا پاجامہ بنایا جاتا اس کو "تمان" کہا کرتے تھے۔ علماء اور مشائخین ہمرود کے "تمان" استعمال کرتے تھے۔ گذشتہ نصف صدی سے مردوں میں

زرین ریشمی پاجامے کا استعمال موقوف ہوگیا ۔ اس کے بجائے سفید پاجامہ کبھی تنگ ، کبھی ڈھیلے اور کبھی چوڑی دار پسند کیے جاتے ہیں ۔ ابا شاہی جوتے اور پھر زری کے چڑاوا عام طور سے دولھوں کے لیے استعمال ہوتا تھا ۔

دلھنوں کے لباس میں اولاً پشواز اور بکلائی لازمی طور سے لباس کے جزو لاینفک تھے ۔ ان کو زرین کپڑوں سے بنایا جاتا اور پھر قیمتی مصالہ ٹاکا جاتا ۔ پشواز اور بکلائی کے ساتھ کرتی چولی اور پاجامہ دوسرے جزو ہوتے تھے ۔ بتدریج پشواز کا رواج ختم ہوگیا لیکن "بکلائی" پاجامہ ، چولی اور کرتا عرصے تک دلھنوں کے لباس میں شامل رہے ۔ بعض جگہ "بکلائی" کے بجائے اوڑھنی یا دوپٹا استعمال کیا جاتا ۔ دلھنوں کے لیے خاص زرین جوتے بنائے جاتے تھے ۔ مگر اس کے ساتھ زرین چپل ، زرین شوز اور زرین جڑاوا بھی استعمال ہوتے تھے ۔ دلھنوں کا پاجامہ کسی قدر تنگ ہوا کرتا ۔ دلھن کے لیے زیور مختلف قسم کے ہوتے ہیں ان میں کوئی تخصیص نہیں ہوتی البتہ "نتھ" ضرور ہوا کرتی ہے ۔

مہندی کا رواج اب تک باقی ہے مگر اس کے ساتھ اب ناخن کو رنگنے کا رواج بھی ہو گیا ہے ۔ پان اور مسی اب تک باقی ہیں ۔ مگر مسی اب متروک ہوگئی ہے ۔

پھولوں کا استعمال دولھے اور دلھن کے لیے ضروری ہے ۔ پھولوں کے گجرے ، ہار ، بدھی اور دست بند وغیرہ کے ساتھ سہرا خاص جزو تصور ہوتا ہے جو دولھے ادر دلھن کے باندھا جاتا ہے ۔ بعض علماء اور مشائخین کے خاندان میں "سہرا" استعمال نہیں ہوتا مگر ایسے مخصوص چند خاندان ہیں ورنہ عام طور سے دولھا اور دلھن کے لیے سہرا ضروری تصور کیا جاتا ہے اور اکثر بزرگ خاندان اس کو دولھا کے سر سے باندھتا ہے یہ سہرا اس وقت چہرے سے لگایا جاتا ہے جب کہ عقد خوانی شروع ہوتی ہے ۔

دلھن کے چھرے سے اس وقت سرکایا جاتا ہے جب جلوے کی رسم ہوتی ہے ۔

حکومت آصفیہ کا درباری لباس

اگرچہ حیدرآبادی لباس کی صراحت ہو چکی ہے مگر پھر بھی درباری لباس کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے ۔

حکومت آصفیہ مغلیہ دور کی یادگار تھی ۔ اس لیے اکثر امور مغلیہ دربار کے مطابق انجام پاتے تھے ۔ چونکہ دربار کا قدیم لباس دستار ، جامہ اور بکلوس مع تلوار لازمی ملبوسات تھے ۔ اس لیے اس کی پابندی یہاں ہوتی ہے ۔ مگر کچھ تغیرات تھے ۔ مثلاً دستار میں فرق تھا ؛ جو دستار فرماں روایان آصفیہ زیب سر کرتے تھے اس کی بناوٹ کچھ اور ہوتی تھی اور پائگاھی امراء کی دستار کی تراش کچھ اور ۔ سالار جنگ والوں کی دستار ، مہاراجا والوں کی دستار ، راجا رائے رایان اور شیو راج جیسے خاندانوں کی دستاروں میں ضرور کچھ نہ کچھ فرق ہوا کرتا تھا ۔

دربار آصفیہ کے دیگر امراء اور عہدے داروں کے لیے شاہان آصفیہ کی دستار کا نمونہ استعمال ہوتا تھا ۔ دستار بنانے والے حیدرآباد میں کئی ایک تھے ۔ فی دستار ایک روپیہ سے لے کر تین چار روپیے تک معاوضہ لیا کرتے تھے ۔ سر کا ناپ لے کر دستار عموماً سفید یا پھر خاص رنگوں کی بنائی جاتی تھی ۔

اولاً سفید جامہ گھیردار استعمال ہوتا تھا ، جو عموماً باریک ململ کا ہوتا تھا ۔ کرتے کی آستین تنگ اور کمر کے نیچے کا گھیر زیادہ ہوتا تھا ۔ کمر کے اوپر کا حصہ بدن کے مطابق ہوتا تھا جامے عموماً بند ہوتے تھے کنڈیوں کا رواج نہیں تھا ۔

جامے کے اندر سفید ململ کا کرتا اور شلوار اولاً رنگین ہمرود ، مشروع اور کمخواب وغیرہ کی بنائی جاتی تھی ۔ مگر بتدریج انگریزی

اثر کے بعد سفید پاجامہ استعمال ہونے لگا۔

پاؤں میں اولاً ابا شاہی جوتا پہنا جاتا تھا۔ پھر سلیم شاہی جوڑا استعمال ہونے لگا۔ درباری لباس میں بکلوس اور اس کے ساتھ تلوار بھی لازمی تھی۔

نواب مختارالملک کے زمانے میں جامے کے بدلے شیروانی پہنی جانے لگی۔ گھیر میں کلیاں لگائی جاتیں۔ اس کو مغلئی شیروانی کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد کی شیروانی کی وضع میں فرق آ گیا۔ آستین کی وضع بڑی کلیاں نکال کر صرف آگے اور پشت کے دو حصے میں اس کو تقسیم کر دیا گیا۔ جس کا رواج اور وضع آج تک بدستور باقی ہے۔ اس خصوص میں ''گذشتہ لکھنؤ'' کی صراحت قابل ملاحظہ ہے دیکھیے صفحہ (۲۷۱)۔

درباری لباس میں آصف جاہ سابع کے دور میں کچھ اور فرق ہو گیا۔ یعنی شیروانی کے بجائے فرا کوٹ اور پاجامے کے بجائے پتلون کا پہننا قرار پایا۔ یعنی ایک خاص طرز کا یونیفارم مقرر ہوگیا۔ موسم گرما میں سفید ڈریل کا اور بارش اور سرما میں سیاہ ٹوئیڈ کا لباس ہوتا تھا۔ عہدے کے لحاظ سے زرین لیس بھی استعمال کی جاتی تھی۔

سیاہ بوٹ اور سیاہ پتابے اس کے ساتھ پہنے جاتے تھے۔ غرض یہ دربار آصفیہ کے ملبوسات تھے۔ علماء اور مشائخین دستار استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ وہ عمامہ باندھا کرتے۔ یعنی یہ خاندان عربی وضع کا عمامہ دستار کے بجائے پہنا کرتے اور میمن اور بھنورے خاندان ایک خاص وضع کی پگڑی استعمال کرتے جس کا عام طور سے میمن بھنوروں میں رواج تھا اور اب بھی ہے۔

پارسی اصحاب دستار کے بجائے ایک خاص وضع کی بانات کی ٹوپی استعمال کرتے جس کے نیچے کے حصے میں کپڑے کی ایک پٹی ہوتی ہے۔

آصفیہ عدالتی لباس میں وکلاء اور جج کے لیے بھی دستار اور سیاہ شیروانی ہوتی تھی ۔ جامعۂ عثمانیہ کے طلبا کے لیے سر کے لباس میں دستار ہی مقرر ہوئی تھی ۔

جو انگریز اعلیٰ عہدوں پر مامور تھے وہ دستار سے مستثنیٰ تھے اور اپنے درباری لباس کے مطابق برہنہ سر ہوتے تھے ۔ عہدے دار اور جاگیر دار منصب دار اور دیگر اصحاب جو مدارالمہام یا وزراء کے پاس جاتے تو ان کو بھی دستار اور بکلوس کا استعمال کرنا ضروری تھا ۔ بڑے بڑے جاگیرداروں کے پاس مثلاً امرائے پائیگاہی ، خاندان سالار جنگ ، ستانوں کے راجوں کے پاس بھی دستار اور بکلوس رائج تھے ۔

پولیس ایکشن کے بعد دستار اور بکلوس گویا معدوم ہوگئے جس طرح ترکی ٹوپی کا رواج کم سے کمتر ہوگیا ہے اسی طرح دستار کی بھی یہی حالت ہے ۔ اس نوبت پر مردوں کے لباس کی تفصیل ختم ہوتی ہے ۔

عورتوں کا لباس

مردوں کے لباس کے بعد اب عورتوں کے لباس کی صراحت کی جاتی ہے ۔ اس عنوان پر بھی کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے تو نا مناسب تصور نہ کیا جائے گا ۔

قرآن مجید یا حدیث نبوی میں کسی خاص لباس کے زیب تن کرنے کے متعلق کوئی احکام نہیں ہیں ۔ البتہ ساتر لباس یعنی جس سے بدن کی ستر پوشی ہوتی ہے پہننے کا حکم ہے ۔ جب ہم آنحضرت صلعم اور خلفائے راشدین کے زمانے پر نظر ڈالتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ عورت کے لباس میں اکثر و بیشتر تین چیزیں شامل تھیں ۔ شلوار یا پاجامہ جس کو حجرہ کہتے تھے ۔ دوسرے قمیص جس کو جلباب کہا جاتا تھا ۔ کبھی اس کو خلیع کہتے تھے ۔ جو بے آستین

ہوتی تھی - تیسرے اوڑھنی جس اوسرع کہتے تھے -

مختلف احادیث میں ان کپڑوں کا تذکرہ ہے - مثلاً جب رسالت مآب صلعم ہجرت کے لیے روانہ ہونے لگے تو توشہ باندھنے کے لیے بی بی اسماء بنت ابوبکر رض نے اپنی اوڑھنی پھاڑ کر دی تھی - ایک اور روایت ہے کہ بی بی عائشہ کے پاس ایک پھول دار قمیص تھی اس کو اکثر دلھنوں کے پہنانے کو مستعار لے جاتے تھے - اس کی قیمت ۵ درہم تھی - چنانچہ جو روایت ہے وہ یہ ہے کہ ام ایمن کہتی ہیں کہ بی بی عائشہ کے پاس ایک قمیص پانچ درہم کی تھی - آپ نے فرمایا ''ذرا اس لونڈی کو دیکھو یہ گھر میں اس قمیص کو پہننے سے انکار کرتی ہے حالانکہ رسول اللہ کے زمانے میں میرے پاس اس قسم کا کرتا تھا - جس سے عورت کو شادی کے موقع پر آراستہ کرنے کے لیے مجھ سے مستعار لے جاتے تھے''-[۱]

ان تین کپڑوں کے علاوہ ایک چادر کا بھی استعمال ہوتا تھا - جو گھر سے باہر جاتے وقت استعمال کی جاتی تھی - اس پورے جسم کی ساخت چھپ جاتی تھی - البتہ چہرہ کھلا ہوتا تھا - ایک مرتبہ حضرت عمر رض نے بی بی عائشہ رض کو جاتے ہوئے پہچان لیا تھا -

عرب کی غریب عورتیں لمبی قمیص اور اوپر سے ایک اوڑھنی اوڑھتی تھیں - چڈھی کا استعمال بھی عورتیں کرتیں تھیں جو لباس کے اندر پوشیدہ ہوتی - جنتہ کے نام سے ایک چھوٹا رومال مستعمل تھا جس سے عرب عورتیں اپنے سر کے اگلے اور پچھلے حصے کو چھپاتی تھیں - خلفائے راشدین کے زمانے میں عرب عورتوں کا جو لباس تھا اس کے متعلق مرحوم سید امیر علی نے اپنی کتاب ''تاریخ اسلام'' میں جو صراحت فرمائی ہے وہ حسب ذیل ہے :

''عورتیں ڈھیلی شلوار اور گردن پر سے کھلی قمیص استعمال

۱- سیرۃ عائشہ -

کرتیں تھیں اور سردیوں میں قمیص پر چست کرتی پہنتیں تھیں مگر ان کا خاص لباس ایک لمبا لبادہ ہوتا تھا ۔ باہر جاتی دفعہ برقع اوڑھ لیتی تھیں قبل از اسلام عورتوں کے کرتے اور کرتی عین سینے پر سے کھلے ہوتے تھے ۔ اس واسطے رسول اللہ صلعم نے حکم دیا کہ باہر جاتی دفعہ برقع کا استعمال کریں ۔

خاندان عباسیہ کے آخر زمانے میں جسم کو ڈھانکنے کا رواج ہوگیا ۔ جو اب تک مصر اور دیگر اسلامی ممالک میں پایا جاتا ہے ۔ عربوں میں عورتیں بالکل آزاد رہتی تھیں ۔

بہت سے ممالک میں پردے کی رسم بہت بعد میں جاری ہوئی ۔ جمہور اسلام کے وقت عورتیں آزادی سے ادھر ادھر آتی جاتی تھیں ۔ خلیفوں کے وعظ ، حضرت علی رض ، ابن عباس اور دیگر بزرگان دین کے لیکچر سنتی تھیں''[1]

خلفائے راشدین کے بعد جب بنی امیہ کا زمانہ آیا تو اس زمانے میں ایرانیوں اور رومیوں کی بہت ساری باتیں اور اصول اختیار کر لیے گئے ۔ اسلام کی سادہ زندگی کی جگہ تکلف اور تصنع آنے لگا ۔ بادشاہ اور امراء زرق برق لباس استعمال کرنے لگے ۔ چنانچہ ولید ناسی (بنی امیہ کا ایک خلیفہ) زربفت کے چغے اور کمخواب کے پاجامے پہنا کرتا تھا جن پر سنہری' لیس لگی ہوتی تھی اور اس طرح سلیمان سوائے کمخواب کے اور کسی کپڑے کا نام نہ لیتا تھا[2]

اس سے واضح ہو سکتا ہے کہ جب سلاطین کا لباس اس قسم کا زرین ہوتا تھا تو عورتیں اور شاہی حرم کس طرح زرق برق ملبوسات کی شوقین ہوں گی ۔ اس زمانے میں لباس کے اجزاء کیا کیا تھے اس کی تفصیل نہیں ملتی مگر یہ پایا جاتا ہے کہ

۱- ''تاریخ اسلام'' ۔ ۲- ''تاریخ الخلفاء'' سیوطی ۔

شلوار ۔ قمیص اور اوڑھنی عورتوں کے لباس کے اہم اجزاء تھے ۔ بنی امیہ کے زمانے میں شہزادیاں گھوڑے کی سواری کرتی تھیں ۔ کہا جاتا ہے کہ خلیفہ ھشام کے خاص شاہی اسطبل میں (۴) ہزار گھوڑے تھے ۔ شہزادیاں گھوڑوں کو سدھاتیں اور گھوڑ دوڑ میں گھوڑے دوڑاتی تھیں[1]۔

بنی امیہ کے بعد بنی عباس کے زمانے میں عورتوں کے لباس میں بہت کچھ فرق ہوگیا اور وہ اب سر پر ٹوپی کا استعمال کرنے لگیں ۔ کہا جا سکتا ہے کہ یورپین عورتوں نے ٹوپی کا استعمال عربوں سے ہی اخذ کیا ہے ۔ لباس کے ساتھ اسباب زیب و زینت میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا ۔ دولت کی فراوانی کے باعث تکلف آ گیا ۔ مرحوم سید امیر علی کی صراحت قابل ملاحظہ ہے :

''عہد بنی امیہ'' کے بعد مستورات کے لباس میں تغیر عظیم پیدا ہو گیا ۔ متمول یا اعلیٰ طبقے کی مستورات قبہ نما ٹوپیاں جن پر ہیرے لگے ہوتے پہنتی تھیں ۔ ٹوپی کے زیریں حصے پر مرصع سنہری لیس لگی ہوتی تھی ۔ متوسط طبقے کی مستورات ایک چپٹی سنہری لیس لگی گول ٹوپی جو موتی اور زمردوں سے مزین ہوتی پہنتی تھیں ۔ یہ بڑی خوشنما اور خوب صورت ہوتی تھی ۔ پازیبوں اور پہنچوں کا عام رواج ہوگیا تھا ۔ زینت و بانکپن کے لوازمات نا معلوم نہ تھے ۔ خاوند کی طرح زبیدہ نے اپنے گھر کے فیشن میں کئی نئی چیزیں اور زیورات وغیرہ رائج کیے ۔''

چہرے پر پوڈر اور ہونٹوں پر سرخی ملنے یعنی چہرہ بر افروختن کا فیشن ایرانیوں سے لیا گیا تھا ۔ ایرانی ابتداء ہی سے ان باتوں کے دلدادہ تھے ۔ خلیفہ منصور کی دو چچا زاد

۱۔ ''تاریخ الخلفاء'' سیوطی ۔

بہنیں زرہ بکتر لگا کر روسی جنگوں میں شریک ہوئی تھیں۔ رشید کے زمانے میں بھی اکثر عورتیں جنگوں میں شریک ہوتیں اور فوجوں کی کمان کرتی تھیں۔ [1]

اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ بنی امیہ کے بعد بنی عباس کے زمانے میں عورتوں کے لباس میں شلوار، قمیص اور اوڑھنی کے ساتھ ٹوپی بھی شامل ہوگئی تھی۔ مگر گھوڑے کی سواری یا جنگی زمانے میں اوڑھنی کا استعمال نہیں ہوتا تھا۔

عربوں میں شہر کی عورتوں اور دیہات کی عورتوں کے لباس میں فرق ہوا کرتا تھا۔ دیہات کی عورتیں غربت کے مد نظر صرف ایک لمبا کرتا پہنا کرتی تھیں۔ شہر کی عورتیں اس کے بر خلاف زیادہ کپڑوں کا استعمال کرتیں تھی۔ موسیو لیبان مصنف ''تمدن عرب'' نے اس خصوص میں جو صراحت کی ہے وہ موجب دل چسپی ہوگی:

''اگر ہم کسی باتصویر اخبار میں یورپ کے ایک صدی کے لباسوں کا تغیر دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس قدر زمانے میں یورپ کے خیالات لباس کے متعلق کس درجہ بدلتے رہے ہیں۔

اس کے بر خلاف اگر ہم عربوں کے لباس کو بارہ سو برس کے زمانے سے دیکھیں تو اس میں ہمیں اس قسم کا اتحاد معلوم ہوگا جو اور اسباب موجود نہ ہونے کی صورت میں ثابت کرتا ہے کہ اس قوم میں قدیم رسوم و رواج کس درجہ مستحکم ہیں۔

عورتوں کے لباس میں زیادہ اقسام دولت مندوں میں ہی ہیں۔ غربا کا لباس ایک لمبا کرتا ہے کہ کمر کے پاس تنگ اور ایک برقع جس سے چہرہ چھپا ہوتا ہے اور فقط آنکھیں

۱۔ ''تاریخ اسلام'' سید امیر علی۔

نظر آتی ہیں ۔ مصر میں بالکل ڈھیلا ڈھالا سادہ سوتی نیلا کرتا ہے ۔ جب ہم شہر کے عربوں کا ذکر کریں تو لباس کی بابت کچھ کہنے کی ضرورت نہ ہو ۔ ہم اتنا ضرور کہنا چاہتے ہیں کہ اعلیٰ طبقات میں عورتوں کا لباس اس قدر سادہ نہیں لیکن ہمیشہ سوزوں رہا ہے ۔ ریشمی جالی کا کرتا اس پر کلابتون کے کام کی صدری بڑے پہنچوں کے پاجامے وغیرہ ۔

جب عورتیں باہر جاتی ہیں تو ہمیشہ ان کپڑوں پر ایک کپڑا (چادر) ہوتا ہے اور چہرے پر برقع[۱] ''

ایرانیوں ، ترکوں اور مغلوں میں بھی پاجامہ قمیص یا کرتا اور اوڑھنی لباس کے اہم اجزاء ہوتے تھے ۔ صدری بھی لباس کا جزو ہوا کرتا تھا ۔ اب ہم ہندوستان میں اسلامی لباس کی وضاحت کرتے ہیں ۔

پہلے غیر منقسم ہندوستان کی صراحت کی جاتی ہے کیونکہ تاریخ کی کڑی ملانے کے لیے اس کی ضرورت ہے ۔ زمانۂ قدیم سے نہ صرف شمالی ہند اور جنوبی ہند کے لباس میں فرق رہا ہے بلکہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مختلف لباس رائج ہیں ۔ اس کی پوری تفصیل بیان کرنا دشوار ہے اس لیے مکمل طور پر صراحت کردی جاتی ہے ۔ جو مسلمان حجاز ، عراق اور ایران وغیرہ سے ہندوستان آئے ان کا لباس اولاً وہی رہا جس کی صراحت صفحات بالا میں ہو چکی ہے ۔

ہندوستان میں ترکوں ، پٹھانوں وغیرہ کے بعد مغلوں کی سلطنت قائم ہوئی اور اکبر بادشاہ نے مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک ہی کلچر میں منسلک کرنے کے لیے اپنے مغل لباس کو ترک

۱۔ ''تمدن عرب'' سید علی بلگرامی ۔

کر کے ہندوؤں کا لباس اختیار کر لیا تھا ۔ لیکن اس کے باوجود مغل شہزادیوں کے لباس کو دیکھا جائے تو واضح ہوگا کہ وہ پوری طرح راجپوت شہزادیوں کے لباس سے نہیں ملتا بلکہ اس میں کسی قدر اختلاف نظر آتا ہے۔

اگر شمالی ہند کے مسلمانوں کے لباس پر غور کریں تو واضح ہوتا ہے کہ پاجامہ ، قمیص اور دوپٹہ ان کے لباس کے اہم اجزاء رہے ہیں ۔ البتہ پاجامے میں کبھی تنگ پاجامہ ، کبھی شلوار اور کبھی غرارہ مقبول رہا ۔ قمیص کبھی زیادہ طویل رہی اور کبھی اس کا طول کم ہوتا رہا ۔

اس کے بر خلاف جنوب میں لہنگے کا استعمال مسلمان عورتوں میں رائج رہا ۔ یہاں غرارہ یا شلوار کے بجائے لہنگا استعمال ہوتا رہا اس کی مزید صراحت آگے کی جائے گی ۔

مغل شہزادیوں کی متعدد تصاویر سالار جنگ میوزیم میں اور بعض قلمی کتابوں میں موجود ہیں ۔ ان کو دیکھ کر مغل شہزادیوں کے لباس کی صراحت کی جا سکتی ہے ۔ ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر مغل شہزادیاں "کلاہ یا تاج" کا استعمال کرتی تھیں ۔ اس کی وضع مختلف رہی ہے ۔ کلاہ کے علاوہ جامہ یا قبا اور پاجامہ لباس کے ضروری اجزاء تھے۔

جو قبا یا پاجامہ استعمال کیا جاتا تھا اس کا طول کبھی زیادہ ہوتا تھا کبھی کم ۔ یہ کبھی ساق تک طویل تھا اور کبھی ٹخنے تک ۔ پاجامہ کبھی تنگ ہوتا تھا اور کبھی ڈھیلا ۔ جامہ یا قبا پر ایک کوٹ کا بھی استعمال ہوتا تھا ۔ جو اکثر نیم آستین کی شکل رکھتا تھا ۔

جو قبا استعمال ہوتی وہ عموماً باریک ریشمی ہوتی اس سے بدن کا رنگ نظر آتا تھا ۔ جوتا عموماً اس رنگ کا ہوتا تھا جس رنگ کا پاجامہ ہوتا تھا ۔ اس کی کبھی اونچی ایڑی ہوتی اور کبھی

نہیں ہوتی ۔

زیور میں کئی چیزیں ہوتی تھیں جو سر ، کان ، گلے اور ہاتھ میں پہنے جاتے تھے ۔ شہزادیوں کی تصاویر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پاؤں میں زیور نہیں ہوتا تھا اور نہ ناک میں کوئی زیور پہنا جاتا تھا ۔ عموماً مانگ سیدھی ہوتی تھی ۔ مہندی کا رواج تھا جو ہاتوں اور پاؤں میں لگائی جاتی تھی[1]

مغلیہ دور کے بعد شمالی ہند میں جب انگریزوں کا دور دورہ ہوا تو شمالی ہند میں غرارہ ، شلوار ، پاجامہ اور اس کے ساتھ قمیص اور اوڑھنی کا رواج رہا تو مگر اس کے ساتھ ساتھ ساڑی اور بلوز یا جمپر کا بھی رواج ہوتا گیا ۔ کہا جا سکتا ہے کہ انگریزی عہد میں شمال ، جنوب ، مشرق اور مغرب غرض ہندوستان کے ہر ایک حصے میں ساڑی اور قمیص مقبول ہوتی گئی مگر پوری طرح رائج نہیں ہوئی ۔ ایک بڑا حصہ شلوار ، غرارہ ، قمیص اور اوڑھنی کا استعمال کرتا تھا ۔

اس کے بعد جنوبی ہند کی جانب توجہ کی جاتی ہے ۔ جس زمانے میں مغلیہ تاج دار اکبر اعظم اپنی مغل رعایا کے ساتھ ضم کرنے کے لیے دونوں کلچروں کو ایک بنانے کی کوشش کر رہا تھا ۔ اس کے پہلے ہی فیروز شاہ بہمنی نے دکن کے تینوں علاقوں یعنی مہاراشٹر ، کرناٹک اور تلنگانہ کے کلچر کو اسلامی کلچر میں سمونے کی کوشش شروع کر دی تھی ۔ اس کے محل میں صرف ہندوستان کے مختلف حصوں کی بلکہ دنیا کے بعض اور ممالک کی عورتیں بھی آگئی تھیں ۔ اس لیے عورتوں کے لباس میں بہت کچھ فرق ہوگیا ۔ تاہم پاجامہ ، قبا اور اوڑھنی ان کے لباس کے اہم اجزا رہے ۔ اس کے بعد جب قطب شاہی حکومت قائم ہوئی تو سلطان محمد

---

۱ مرقع محفوظ سالار جنگ میوزیم ۔

قلی قطب شاہ نے بھی جس کو دکنی کلچر کا بانی قرار دیا جاتا ہے اپنے بدن سے تاتاری لباس بالکل اتار کر پھینک دیا تھا ۔ سر پر سمور کی کلاہ کے بجائے دکنی وضع کی پیچدار پگڑی ، پوستین اور باناتی قبا کے عوض ململ کا جامہ اور شبنم کا نیمہ پہنتا تھا ۔ ہاتھوں میں جڑاؤ کڑے ہوتے تھے ۔ ۱ اسی طرح بیجاپور میں ابراہیم عادل شاہ کے دور میں دکنی کلچر کے لحاظ سے لباس میں تغیر ہوا ۔

سلطان محمد قلی نے لباس میں تبدیلی کی تھی ۔ اس کا اثر نہ صرف اہل دربار پر ہوا بلکہ عوام میں بھی مقبول ہوگیا ۔

مردوں کے لباس سے قطع نظر عورتوں کے لباس کے متعلق بھی یہ بتانا ضروری ہے کہ اس زمانے میں دکنی شہزادیوں کا کیا لباس تھا ۔ سلطان محمد قلی کی ملکہ بھاگ متی یا حیدر محل کی جو تصویر (اگرچہ بھاگ متی تلنگانہ کی ایک رقاصہ تھی مگر چونکہ شاہی دربار سے متعلق تھی) اس کے مد نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہی لباس دکن کی شہزادیوں کا تھا ۔

تصویر سے واضح ہوتا ہے کہ تنگ پاجامہ اور اس پر گھیردار جامہ یا قبا جس کو پشواز کہا جاتا تھا اور اس پر ایک اوڑھنی لباس کے اجزا تھے ۔ اس لباس کو مغل شہزادیوں کے لباس سے ملایا جائے تو زیادہ فرق نہیں معلوم ہوتا البتہ مغل شہزادیوں نے کلاہ کا استعمال کیا ہے مگر دکن میں اس کا رواج نہیں ہوا ۔

جو قبا استعمال کی جاتی تھی وہ اگرچہ گھیردار تھی مگر اس کی لمبائی کم و زیادہ نظر آتی ہے ۔ دکن میں ٹخنوں تک قبا کا استعمال ہوتا تھا ۔

---

۱ ۔ مضمون غلام یزدانی صاحب مطبوعہ "اردو" بابت سنہ ۱۹۳۱ ع ۔

دکن میں عادل شاہی اور قطب شاہی دور کے ختم ہونے پر اول تو عالم گیر کا فرزند اور اس کے بعد دوسرے صوبےداروں نے حکومت کی اور بالآخر آصف جاہ نے جو مغلیہ حکومت کے ایک امیر و کبیر شخص تھے اپنی حکومت قائم کی جو گویا مغلیہ حکومت کی عمارت پر بنی تھی اس لیے یہاں کا پورا کلچر مغلیہ کلچر کی یاد دلاتا رہا ہے ۔ سلطنت آصفیہ کے آغاز میں خواتین کا لباس وہی رہا جو مغلیہ شہزادیوں یا شمال کے شرفاء کا تھا ، مگر اس کے بعد لباس میں فرق ہو گیا ۔ اس زمانے میں عوام یعنی متوسط اور اعلیٰ طبقے کے لباس میں پاجامہ ، لہنگا ، کرتا اور اوڑھنی اہم اجزا تھے ۔ ہندو عورتوں کے لباس میں صرف ساڑی اور چولی تھی ۔ لہنگا بھی بعض ہندو عورتوں میں استعمال ہوتا رہا ۔ حیدرآباد کی عورتیں چونکہ شمالی ہند سے زیادہ متاثر تھیں اس لیے پاجامے کا استعمال ہوتا رہا ، اس کے برخلاف مدراس یعنی کرناٹک اور تامل کے علاقے میں پاجامے کے بجائے لہنگا عام طور سے استعمال ہوتا رہا ہے ۔ ایک عرصے کے بعد دکن کی عورتوں کے لباس سے جامہ یا پشواز متروک ہوگئی ۔ اس کے بجائے پاجامہ کسی قدر تنگ اس کے ساتھ کرتی ، چولی اور اوڑھنی یا دوپٹہ عورتوں کا لباس ہو گیا ۔ چولی ، کرتی اور دوپٹے کو بیش قیمت مصالحہ لگایا جاتا تھا ، جو اوڑھنی یا دوپٹے کے نام سے استعمال کی جاتی تھی ۔ قد کے لحاظ سے وہ چار چھ گز کی طویل ہوتی اور پشت کی جانب سے دونوں پلو سامنے لا کر کندھوں پر ڈال لیے جاتے تھے ۔ جس پر گوٹا کناری اور مصالحہ لگایا جاتا تھا ۔ بیسویں صدی کے آغاز میں حیدر آباد کے بڑے حصے کا یہی لباس تھا ۔ البتہ اس کے ساتھ ساتھ ایک جدید لباس بھی شروع ہو گیا تھا یعنی ساڑی اور قمیص اور اس کے ساتھ جاکٹ استعمال ہوتا تھا ۔ یہ کوٹ یا جاکٹ پوری آستین کی ہوتی تھی اور زرین یا ریشمی پارچے کی بنائی جاتی تھی اور اس پر جھالر بھی ہوتی تھی ۔ چونکہ اس زمانے میں انگریز

خواتین اس قسم کا کوٹ استعمال کرتی تھیں اس لیے ساڑی کے ساتھ اس کا استعمال ہونے لگا تھا ۔ یہ لباس جس میں ہاتھ برہنہ ہوتے تھے نیشنل لباس تصور ہوتا تھا ۔ چولی اور کرتی جس میں زیادہ ہاتھ اور سینہ برہنہ ہوتا قدیم لباس تصور ہوتا تھا ۔ اس کے بعد بتدریج پاجامہ ، دوپٹہ ، چولی اور کرتی کا رواج کم ہوتا چلا گیا اور اس کی جگہ ساڑی اور قمیص نے لے لی ۔ لیکن اب تک حیدرآباد کے شرفاء میں کنواری لڑکیوں کے لیے پاجامہ قمیص یا کرتا اور دوپٹے کا رواج موجود ہے ۔ مگر اب کم سے کمتر ہوتا جاتا ہے ۔ دکن کے دوسرے علاقوں میں عرصے تک لہنگا اور دامنی استعمال ہوتی رہی ، مگر اس کے بعد ساڑی مقبول عام ہوگئی ۔

بیسویں صدی کے بعد عورتوں کے لباس میں ساڑی قمیص اور کوٹ (جس کو جاکٹ کہتے تھے) کے بجائے صرف مختلف قسم کے جمپر یا بلوز استعمال ہونے لگے - ہمارے بچپن میں صرف پست اقوام ساڑی اور چولی کا استعمال کرتی تھیں ۔ جس کے باعث ان کی پیٹھ اور پیٹ کا بڑا حصہ عریاں ہوتا تھا ۔ اب گویا یہی شرفا کا لباس متصور ہونے لگا ہے ۔ کیوں کہ ساڑی کے ساتھ جو بلوز یا چولی استعمال ہوتی ہے اس میں پیٹ اور سینے کا حصہ عریاں رکھا جاتا ہے ۔ اس طرح اب لباس کے جو اجزاء ہیں ان میں بیٹی کوٹ ، ساڑی ، بے آستین کی چولی اور بلوز یا جمپر جو زیادہ تر نیم آستین ہوتی ہیں ، شامل ہیں ۔

لباس کے بعد زیور کی صراحت بھی ضروری ہے ۔ دکن میں جو زیور زمانۂ قدیم میں استعمال کیے جاتے تھے ان کی فہرست پیش کی جاتی ہے جس سے زیورات کے نام کی صراحت ہوتی ہے ۔

(۱) سر کے زیور : جھومر ، چاند جس پھول ، لاکڑی ، مرزا بے پروا ۔

(۲) چوٹی کے زیور : چوٹی کے تعویذ ، چوٹی کے قبے ،

چوٹی کی لا کڑی ۔

(۳) ماتھے کے زیور : ٹیکا ۔

(۴) کان کے زیور : انتان ، ارواج ، بھٹے ، بگرے ، پنکھ ، پھول ، بالیاں ، جھلملی ، جھمکا ، چاند ، چکریاں ، چولا پھول ، کرن پھول ، لونگ کے پھول ۔

(۵) ناک کے زیور : بلاق ، سیمر ، رال ، نتھه ۔

(۶) گلے کے زیور : تلسی ، جگنی ، چمپا کلی ، چناک ، چندن ہار ، ستلڑا ، کٹلا ، کلسر ، لچھا ، مالا ، ھنس ، ہار ،

(۷) بازو کے زیور ، بازو بند ، تعویز بار ، بازو کے کڑے ، کنگن ، پڑی ، نورتن ۔

(۸) کلائی کے زیور : بجر بٹو ، پہنچی ، سمرن ، کنگن ، کوٹ ، کڑے ، چوڑی ،

(۹) انگلیوں کے زیور ، آرسی انگوٹھی ، چھلہ ،

(۱۰) کمر کے زیور : بکلوس ،

(۱۱) پاؤں کے زیور : پیری ، پازیب ، پایل ، توڑا ، رام جھول[1] کجرے ، لول ، منکے ۔

جن زیورات کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ صرف حیدرآباد ، مدراس اور میسور وغیرہ میں استعمال ہوتے تھے ۔ مگر اب صرف ان کا نام ہی نام باقی رہ گیا ہے ۔ آج کل تو صرف چند زیور استعمال ہوتے ھیں ۔ نکلس ، لچھا ، ہار ، کڑے ، چوڑی اور انگوٹھیاں وغیرہ باقی دوسرے زیور استعمال نہیں ہوتے ۔ اب تو بہت سی عورتوں کو ان کے نام بھی معلوم نہیں ہوں گے ۔

۱۔ ”تاریخ التوایط“

اسباب سنگار

لباس کے بعد اسباب سنگار کا بیان بھی کیا جا سکتا ہے ۔ دکن میں پہلے چوٹی کا رواج اور سیدھی مانگ کا طریقہ تھا مگر اب مختلف وضع کے جوڑے باندھے جاتے ہیں ۔ پہلے مسلمان عورتوں میں اس کا رواج نہیں تھا بلکہ صرف ہندو خواتین جوڑا باندھتی تھیں ۔ بہ ہر حال بالوں کو مختلف وضع سے آراستہ کیا جاتا ہے ۔ سر کے بالوں کی آراستگی ہندو اورمسلمانوں میں بالکل یکساں ہے۔ بعض بالوں کو گوند کر دو دو چوٹی ڈالتی ہیں ، بعض مختلف نہج اور مختلف وضع سے جوڑا باندھتی ہیں ۔ باندھنے کی بیسیوں وضع ہیں جن کی صراحت دشوار ہے ۔

چہرے پر پہلے غازہ ملا جاتا تھا اور مہندی ، پان اور مسی کا رواج تھا ۔ عطر کا استعمال کثرت سے ہوتا تھا ۔ اس کے بیسیوں اقسام ہوتے تھے ۔ گال سرخ کیے جاتے تھے ۔ جب سے مغربی تہذیب آئی پوڈر کا استعمال ہونے لگا ۔ مسی متروک ہو گئی ۔ گالوں پر یورپین طرز کی سرخی کا استعمال ہونے لگا ۔ پان کا استعمال تو متروک نہیں ہؤا البتہ اس کے ساتھ لپ اسٹک کا رواج بھی ہو گیا ہے ۔ مہندی پوری طرح متروک نہیں ہوئی مگر ناخن کو سرخ کرنے کا طریقہ بھی ہوگیا ہے ۔

جب پان کا تذکرہ آ جائے تو پاندان اور اگالدان کا تذکرہ بھی ضروری ہے ۔ پاندان کے مختلف وضع ہوتے ہیں ؛ چھوٹے ، بڑے ، سونا چاندی ، جرمن سلور ، پیتل ، تانبے کے پاندان استعمال کیے جاتے ہیں ، بیدری پاندان بھی ہوتے ہیں ۔ پاندان کے ساتھ اگالدان ضروری تھے ۔ یہ بھی چاندی ، جرمن سلور اور پیتل وغیرہ کے ہوتے ہیں ۔

اسباب سنگار میں اب پوڈر ، لپ اسٹک ، ناخن کی سرخی اور کئی قسم کی کریم استعمال ہوتی ہے ۔ یہ کہنا درست ہوسکتا

ہے کہ چہرے کے سنوارنے ، جوان اور خوب صورت نظر آنے کے لیے جو اشیاء استعمال کی جاتی ہیں وہ سب سے بڑھ کر عورتوں میں استعمال ہوتی ہیں ۔

اشیائے سنگار میں چوڑی کی جوڑیوں کا ذکر بھی نہایت ضروری ہے پہلے زمانے میں چوڑیاں دکن کی خاص صنعت تھی اس کے بعد یورپ سے مختلف رنگوں کی جال دار بلوری چوڑیاں آنے لگیں ۔

حیدرآباد کے چوڑیوں کی مانگ کم ہوگئی تھی ۔ مگر اب کئی سال سے حیدرآباد کے جوڑے مشہور ہونے لگے ہیں اور ان کے مختلف وضع ہو گئے ہیں ۔ چوڑیوں کے متعلق میں اپنی صراحت کے بجائے محترمہ عظمت النساء بیگم عبدالقیوم خاں کا ایک مضمون یہاں درج کرتا ہوں جو چوڑیوں کے عنوان سے حیدر آباد کے نشر گاہ سے نشر ہوا تھا اور پھر اخبار ”سیاست“ میں شائع ہوگیا ۔

چوڑیاں

”چوڑیوں کی تاریخی اہمیت کیا ہے ۔ میں نہیں جانتی مگر بعضوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ چوڑیاں محکومیٔ نسواں کی نشانی ہیں اور اس تصور کا نتیجہ ہے کہ آزاد خیال عورتیں چوڑیاں پہننا ترک کرتی جا رہی ہیں ۔ سچ پوچھیے تو چوڑیوں کا تعلق آزادی اورغلامی سے نہیں ہے۔ یہ ایک مشرقی رواج ہے جس کے ساتھ کئی عقاید اور روایت وابستہ ہیں ۔ ان کی قدامت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ۔

پرانی تصویریں اور مجسمے اور قبائیلی عررتوں کو دیکھیے آپ کوکسی کے ھاتھ چوڑیوں سے خالی نظر نہیں آئیں گے۔ قبائلی عورتوں کا نام میں نے یہاں اس وجہ سے لیا ہے کہ ان کی تہذیب صدیوں سے ایک ھی مقام پر قایم ہے اور اس کو نئے دور کے شوق و ذوق نے متاثر نہیں کیا ہے ۔ میں یہ واضح

کرنا چاہتی تھی کہ مشرقی معاشرت میں ہر دور کی عورت نے چوڑیوں کو مساوی اہمیت دی ہے۔

یہ تو مشہور ہے کہ عورت کو زیور کا جنون ہوتا ہے لیکن سینکڑوں ، عورتیں ایسی بھی ہیں جن کی معاشی حالت زیورات بنانے کی اجازت نہیں دیتی ، مگر جب تک ان کے ہاتھ میں چوڑیاں ہوتی ہیں انھیں کسی اور چیز کی خواہش یا پرواہ نہیں ہوتی ۔ کیوں کہ یہی زیور ان کی نظر میں سب سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔

ہندوستان میں سیاہ پوت کا لچھا اور چوڑیاں سہاگ کی علامتیں ہیں ۔ ہو سکتا ہے کہ مغرب زدہ خواتین کو یہ سن کر ہنسی آئے ، ہو سکتا ہے کہ وہ اس کو توہم پرستی سمجھیں لیکن چند رسوم و رواج ایسے بھی ہیں جن کی مقبولیت کی کوئی دلیل نہیں ہوتی مگر جنھیں ترک کر دینا بھی ممکن نہیں ہوتا ۔ جو ہماری زندگی کا لازمی جزو بن جاتے ہیں اور کبھی کبھی مذہبی احکام کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔

ہندوستان میں بجز چند مستثنات کے سبھی عورتیں چوڑیوں سے والہانہ عقیدت رکھتی ہیں ۔ عام بول چال میں چوڑی اگر ٹوٹ جائے تو ”چوڑی بدگئی“ یا ”ہاکی ہوگئی“ کہتے ہیں اور یہ بات بچپن ہی سے ذہن نشین کو لی جاتی ہے ۔ ہمارے گلی کوچے میں کپڑے بیچنے والے ، مٹھائیاں اور چنے جبینے بیچنے والے ، آئیس کریم اور آئیس فروٹ بیچنے والے اور منیاری کا سامان بیچنے والے کی آوازیں بہت مانوس ہیں ۔ مگر ”چوڑی بنکڑی کوٹ“ کی صدا محلے کی فضا میں ایک خوشگوار تہلکہ مچا دیتی ہے ۔ چوڑی والا ٹین کا میلا پرانا ڈبہ کھول کر بیٹھ جاتا ہے اور قبل اس کے کہ وہ ڈھکنا کھول سکے کئی ہاتھ اس کے ڈبے کی طرف بے صبری سے بڑھتے ہیں اور پھر

تعریفوں کا شور بلند ہوتا ہے ۔ ''اللہ کتنے نازک ہیں'' ''اس کا رنگ کتنا پیارا ہے'' ''اس کے بیل بوٹے کتنے خوبصورت ہیں'' اور ''یہ دیکھو یہ کانچ کی بنی ہوئی معلوم نہیں ہوتیں''۔ ''کیوں جی ! یہ پلاسٹک کی چوڑیاں ہیں نا''۔ ''کیا دام ہیں ان کے'' ۔ چوڑی والا عورتوں کی ذہنیت سے خوب واقف ہوتا ہے وہ دام بتانے سے پہلے چوڑیوں کے پیارے نام گنوانے لگتا ہے ۔ یہ ''سونا باٹی'' ہے یہ ''انارکلی'' یہ ''درشہوار'' یہ ''نیلوفر'' اور یہ ''چھنک چھنک پایل باجے'' ہے ۔ یہ وہ ''دھنک'' ہے یہ ''عید کا چاند'' اور یہ ''چاندنی رات'' ہے دام کی فکر نہ کیجئے ۔ پہن لیجیئے پھر جو مناسب قیمت معلوم ہو وہی دے دینا ۔ آپ تو جانتی ہیں میں تکرار نہیں کرتا ۔ یہ گھر میرے لیے نیا نہیں ہے ۔ میں آپ سے منافع کماؤں گا توبہ توبہ'' اور وہ باتوں ہی باتوں میں دو چار چوڑیاں چڑھا دیتا ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ کوئی عورت چوڑیاں پہن کر قیمت کے بارے میں تکرار نہیں کرتی ۔

تقسیم سے پہلے ہندوستان میں لاہور کی چوڑیاں بہت مشہور تھیں ۔ جیسے ڈھاکے کی ململ ، بنارس کی ساڑیاں ، متھرا کے پیڑے اور کشمیر کی شالیں ۔ اب دھلی اور علی گڈھ میں بھی ایسی ہی باریک چوڑیاں بننے لگی ہیں لیکن کاریگری میں وہ نفاست پیدا نہیں ہوئی ۔

حیدرآباد کے جوڑے بھی سارے ممالک میں مشہور ہیں ۔ چوڑیوں میں فرق ہوتا ہے ۔ جوڑے لاکھ پر مصالے اور رنگوں سے بنائے جاتے ہیں ۔ دو چوڑیوں کو جوڑ کر گوٹ تیار کی جاتی ہے ایک چوڑی پر بھی بالکل وہی نمونہ بنایا جاتا ہے جو دوسری چوڑی پر بناتے ہیں ۔ درمیان میں نو سے لے کر پندرہ تک بند ڈالے جاتے ہیں ۔ جوڑا مصالے کا ہو تو بند بھی مصالے

کے ہوتے ہیں اور رنگوں والا ہو تو اس میں سونا پانی ڈالتے ہیں ۔ جس طرح بلور کے نام رکھے گئے ہیں اسی طرح پرانی قسم کے جوڑوں کے بھی مختلف نام ہیں ۔ کار چوب کی گوٹ ، برج کی گوٹ ، لوز کی گوٹ ، خنجر کی گوٹ مرغ سینہ ، ناخن کی گوٹ ، لہیرے کی گوٹ ، کنگن کی گوٹ ، کٹواری کی گوٹ ، چمکی کی گوٹ ، اور موتی کی گوٹ ۔ وغیرہ وغیرہ موتی کا جوڑا خاص طور پر دلھنوں کے لیے بنوایا جاتا تھا یا جس میں معمولی طور پر زیادہ چوڑیاں ہوتی تھیں ۔ مثلاً گوٹ اور اس کے جواب کے بعد کٹوری کا بچہ ، چمکی کا بچہ گردے کا بچہ ، چشم بلبل اور پھر بندوں کے درمیان منڈھوا ۔ یہ منڈھوا بڑی خوبصورت چیز ہوتی ہے ۔ نہایت ہی باریک چوڑی پر سبز مینے کا کام کرتے ہیں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بہت ہی باریک قسم کی کٹوری سے چار چار کٹوری کا پھول بنایا جاتا ہے ۔ پہلے جوڑے والوں کو یہ کہنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی کہ یہ چیزیں ڈالی جائیں صرف یہ کہہ دینا کافی تھا کہ دلھن کا جوڑا ہے ۔

اب مصالے کے جوڑوں کی جگہ نگ ، آئینے ، سیپی ، بندیا اور فینسی قسم کے رنگ اور پھول پتوں نے لے لی ہے ۔

شادیوں میں عزیز و اقارب کو جوڑے پہنائے جاتے تھے ۔ جہاں رسماً چوڑیاں پہنائی جاتی ہیں وہاں چند اور لوازمات بھی ہیں جوڑے والی کو چاول، پان، سپاری اور پیسے رکھ کر نیگ دیا جاتا ہے ۔ جوڑہ پہن کر بزرگوں کو جھک جھک کر سلام کرنا پرانی ریت ہے بڑی بوڑھیاں کنواری کو دعائیں دیتی ہیں ۔ ''خدا تمھاری شادی جلد دکھائے ۔ اب شادی کا جوڑا پہنو''۔ شادی شدہ عورتوں کو دعائیں دی جاتی ہیں ''پروردگار تمھارا

سہاگ ہمیشہ قائم رکھے۔ تمہارے ہاتھ ہمیشہ بھرے رہیں۔"
جب بہنیں بھائیوں کے گھر جاتی ہیں تو انھیں ساڑی اور چولی کے ساتھ چوڑیاں بھی تحفتاً دی جاتی ہیں۔ جسے نیوتا کہتے ہیں۔

جب نئی چوڑیاں پہنی جاتی ہیں تو جس ہاتھ سے چوڑیاں خالی کی جاتی ہیں، اسے آنچل سے ڈھانک لیا جاتا ہے چونکہ خالی ہاتھ دیکھنا یا دکھانا برا شگون سمجھا جاتا ہے۔ بعض ہندوستانی عورتوں نے فرنگیوں کی تقلید مین چوڑیاں پہننا چھوڑ دیا ہے۔ ایک ہاتھ کو خالی رکھنا اور دوسرے ہوگھڑی باندھنا فیشن ہوگیا ہے، مگر یہ فیشن زوال پذیر ہے اور چوڑیوں کا شوق پھر بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ ہماری چوڑی والی خوش ہے کہ اس کی بکری میں اضافہ ہوگیا۔ لاڈ بازار کی سڑک پر جو کبھی سنسان ہو گئی تھی پھر رونق آگئی ہے۔

چوڑی سازی گھریلو صنعت ہے، جس کی زندگی کو مشین کی دست درازیوں سے کافی خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ پلاسٹک کے کارخانے اب چوڑیاں بنانے لگے ہیں لیکن پلاسٹک کی چوڑیاں اب تک تو زیادہ مقبول نہ ہوسکیں۔ اس کی بڑی وجہ ایک غلط فہمی ہے کہ پلاسٹک کی چیزوں کے استعمال سے جلد کی بیماریاں پھیلتی ہیں۔ اگریہ غلط فہمی کسی چوڑی والے نے پیدا کی ہے تو اس کی ذہالت کی داد دینا ہی پڑے گی۔ پلاسٹک کی چوڑیاں کیوں مقبول نہیں ہوئیں اس کی وجہ میرے نزدیک تو یہ ہے کہ ان میں جھنکار نہیں ہوتی۔ ایسی بے آواز چوڑیاں نہ کسی مرد کو پسند آ سکتی ہیں اور نہ عورت کو۔

قدیم دلچسپی کے مشاغل

انسان تنوع پسند ہے اس کے دل بہلانے کے لیے مختلف دلچسپی کے سامان کی ضرورت ہوتی ہے ۔ دلچسپی کے قدیم مشاغل شطرنج بازی ، چوسربازی ، پھیسی ، پتنگ بازی ، مرغ بازی اورکبوتر بازی وغیرہ تھے۔

ان باتوں کے متعلق کتابیں بھی لکھی گئی ہیں ۔ چنانچہ ایک کتاب شطرنج کے قواعد و ضوابط میں سید مصطفیٰ المتخلص به شاطر حیدرآبادی نے سنہ ۱۲۶۶ ھجری میں لکھی ہے ، جس میں نہ صرف شطرنج کے قواعد اور ضوابط ہیں بلکہ ان کے علاوہ چالوں کے طریقے بھی واضح کیے ہیں اور مثالیں دے کر سمجھایا گیا ہے شطرنج کے کھیل کے نقشے بھی کتاب میں شامل ہیں ۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ کتب خانۂ سالار جنگ میں ہے [1] ۔ اسی طرح پتنگ بازی کے متعلق ایک اور قلمی کتاب سالار جنگ کے کتب خانے میں موجود ہے[2] اس کے مصنف معین الدین حسن دھلوی ہیں ۔ انھوں نے دکن ، بمبئی ، پونہ ، حیدرآباد وغیرہ کی سیاحت کر کے اپنی کتاب کا مصالہ فراھم کیا ہے ۔ اس کتاب میں پتنگ بازی کے اصول اور طریقے بیان کیے گئے ہیں ۔ پتنگ بنانے کے طریقے اور پتنگ بازی کے گر بتائے گئے ہیں ۔

پتنگ بازی کے لیے موسم سرما پسند کیا جاتا تھا ۔ تلسکرات کے دن گویا پتنگ بازی کا اختتام ہوتا تھا ۔ موسم سرما میں تین چار ماہ تک حیدرآباد کے شہر سے باھر میدانوں میں پتنگ بازی کے جلسے ہوتے تھے ۔

---

۱ ۔ فہرست کتب خانۂ سالار جنگ مرتبہ ھاشمی صفحہ (۳۲۸)
۲ ۔ ایضاً

گذشتہ چند سال تک سے نمایش کے ساتھ تل سکرات کے دن کلب کے زیر اہتمام پتنگ بازی کا جلسہ ہوا ہے ۔ جن اصحاب نے پتنگ بازی کے یہ جلسے دیکھے ہیں اور ان میں شریک ہوئے ہیں وہ بھی دنیا سے گذرتے جا رہے ہیں ۔

اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں کو بھی پتنگ کا شوق تھا کبھی کبھی اپنے مصاحبوں کے ساتھ پتنگ اڑایا کرتے تھے ۔

کبوتر بازی ، مرغ بازی اور بٹیر بازی

حیدرآباد میں کبوتروں کو پالنے اور ان کے جھنڈ کو اڑانے کا خاص رواج ہے ۔ کبوتروں کے بیسیوں اقسام تھے ، شیرازی کے لخے وغیرہ ان کے نام تھے ۔ صبح ان کے جھنڈ اڑائے جاتے تھے ۔ سیٹیاں بجا کر ان کو متوجہ کیا جاتا تھا ۔ کبوتروں کو پالنے اور ان کی نگہداشت کرنے کا بڑا شوق تھا ۔ راقم کو حضرت داغ کی کبوتر بازی یاد آتی ہے ۔ روزانہ صبح کے وقت ان کو اڑایا جاتا تھا ۔

اصل مرغ پالنے اور ان کو لڑانے ، بٹیروں کو لڑانے اور بکروں کو لڑانے کا شوق بھی پایا جاتا تھا ۔ ہر ایک کی تفصیل کرنا طوالت کا موجب ہے اس لیے اختصار کے لیے صرف نام لے لیا گیا ہے ۔

دکن کی سواریاں

آج دنیا میں تیز سے تیز رفتار سواریوں کا رواج ہوتا جا رہا ہے ۔ موٹر ، ریل اور سمندری جہاز سے زیادہ ہوائی جہاز استعمال ہونے لگے ہیں ۔ وہ دن دور نہیں ہے جب کہ کسی شہر میں بھی گشت کرنے کے لیے موٹر اور بس کے بجائے ہیلی کا پٹر استعمال

ہوں گے ۔

اس موقع پر دکن کی قدیم سواریوں کی مختصر تاریخ لکھی جاتی ہے کیونکہ کلچر میں سواریاں بھی ہیں ۔ جس طرح آج کل سواریوں کی دو اقسام ہیں یعنی خاص اور عام ۔ اسی طرح پرانے زمانے میں بھی دو قسم کی سواریاں ؛ تھیں خاص اور عام ۔ سواریوں کا رواج کم تھا اکثر لوگ بجائے سواری کے پیدل ہی اپنی ضروریات کو پورا کرتے تھے کیونکہ شہروں کی آبادی آج کی طرح پھیلی ہوئی نہیں ہوتی تھی ۔

خاص سواریوں میں جس طرح آج موٹروں کا استعمال ہوتا ہے ، پہلے ہاتھیوں کا استعمال ہوتا تھا ۔ امراء جاگیردار ، راجے ، بڑے بڑے تجار اور مہاجنوں کے ذاتی ہاتھی ہوتے تھے ۔ سب امیروں کے پاس بھی کئی کئی ہاتھی ہوتے تھے ۔ غرض ہاتھی ہی دولت اور امارت کی نشانی ہوتا تھا ۔ ہاتھی کے اوپر جھول ڈالتے تھے سواری کے مختلف طریقے تھے یعنی ہاتھی پر بیٹھنے کے لیے مختلف قسم کی نشست گاہ بنائے جاتے تھے ۔ یہ اکثر لکڑی کے ہوتے اور ان پر بانات ، مخمل ، یا اطلس کے غلاف چڑھائے جاتے سب سے اعلیٰ شاندار ''عماری'' کہلاتی تھی جو بطور اعزاز بادشاہ کی جانب سے امراء اور جاگیرداروں کو عطا ہوتی تھی ۔ کوئی امیر اس وقت تک عماری نشین نہیں ہو سکتا تھا جب تک اس کو ''عماری'' کا اعزاز نہ ہوتا تھا ۔ عماری یاد میں حیدرآباد میں پچیس تیس عماری نشین امرا اور جاگیردار تھے ۔ جن میں سے اٹھارہ انیس ماہ محرم میں لنگر کے جلوس میں نظر آتے تھے ۔

ہاتھی پر باندھنے کی دوسری شے ہودہ تھا ۔ تیسری ٹاپ اور چوتھی ''صوفہ'' تھا ۔ یہ ایک کرسی ہوتی تھی جس پر چمڑے کا ٹاپ ہوتا تھا تا کہ دھوپ سے محفوظ رہیں ۔ اور صوفہ ایک ایسی کرسی ہوتی ہے جس کے دونوں طرف تین تین اصحاب بیٹھتے تھے ہاتھی پر والگ سے بھی ملتے تھے یعنی جن امیروں اور جاگیرداروں کے پاس

زیادہ ہاتھی ہوتے ان کے پاس سے مستعاری اجازت سے ہاتھی لے لیے جاتے۔ شادیوں کی تقریب میں اور ماہ محرم میں اس قسم سے ہاتھی ساچق ، مہندی ، شب گشت ، بازگشت کے جلوس کے لیے حاصل کیے جاتے ۔ ان پر نوبت والے سمدیانے والے ، اور طوائفیں بھی سوار ہوتی تھیں ۔ یہ سواریاں گھوڑوں کی سواری کی طرح ہاتھی کی پیٹھ پر ہوتھیں مگر ہاتھی پر چار سوار ہوتے تھے ۔ نوبت والوں کے لیے ایک خاص قسم کی لکڑی کی نشست ہوتی تھی جس میں نقاروں کے ساتھ چارآدمی سوار ہوتے تھے ۔ اس لکڑی کی نشست‌گاہ کو عموماً سرخ بانات سے منڈھا جاتا تھا ۔ اس سے لکڑی نظر نہیں آتی بلکہ سرخ بانات نظر آتی تھی ۔ اس نشست‌گاہ کو ’’حودہ‘‘ کہتے تھے ۔ ہاتھیوں کے سونڈ کو خوبصورتی سے رنگا جاتا اور چاندی کے زیور پہنائے جاتے تھے ۔

ہاتھی کے علاوہ اونٹ بھی سواری کے لیے استعمال ہوتے تھے ۔ اونٹ پر دو آدمی سوار ہوتے تھے ۔ اونٹ میں سانڈنی بہت تیز رفتار تصور کی جاتی تھی ۔ ماہ رمضان ، شوال اور محرم کے چاندد یکھنے کی اطلاع بیدر سے جو حیدرآباد سے اونچا مقام تھا ، سانڈنی سوار کے ذریعے ہی آتی تھی ۔ یعنی یہ (۷۰) میل کا فاصلہ آٹھ نو گھنٹے میں طے کرتی تھی ۔ اونٹ کے بعد گھوڑے کی سواری تھی گھوڑے کی پیٹھ پر خوگر باندھی جاتی جو روئی دار کپڑے اور بانات سے بنائی جاتی تھی ۔ انگریزوں کے عہد میں زین کا استعمال ہونے لگا ۔

ہاتھی و اونٹ گھوڑے کے ساتھ میانے ، بوچہ ، پالکی ، نالکھی کی سواریاں بھی تھیں ، جن کو تین تین چار چار بلکہ پانچ پانچ چھ چھ آدمی اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے چلتے تھے ۔ یہ سواریاں بادشاہ کی جانب سے بطور اعزاز بھی ملتی تھیں ۔ اور بغیر سرفرازی خوش باش اور صاحب ثروت اصحاب ذاتی طور پر بھی ان کو رکھتے تھے ۔ زیادہ تر ’’میانہ‘‘ کا رواج تھا جس میں ایک سے زیادہ آدمی بھی سوار ہوتے تھے ۔

سواری کی تیسری قسم ''رتھ'' تھی ۔ رتھ ایک گاڑی کا نام ہے جو لکڑی سے بنائی جاتی تھی اور دھوپ سے بچنے اور پردے کے لیے اوپر اور اطراف میں کپڑا استعمال ہوتا تھا پہلے زمانے میں عورتوں کے لیے عام طور سے یہی سواری مخصوص تھی ۔ عورتیں میانے میں سوار ہوتی تھیں ۔ حیدرآباد میں ہند کی ''ڈولی'' کا استعمال نہیں ہوتا تھا ۔ بیلوں کی ایک معمولی سواری بنڈی اور کھاچر بھی تھی ۔

انگریزوں کے دور سے گاڑیوں کا رواج ہونے لگا حیدرآباد میں سب سے پہلی گاڑی سنہ ۱۱۹۶ ھجری (سنہ ۱۷۸۲ع) میں آئی ۔ یعنی پہلے انگریز سفیر نے آصف جاہ ثانی کو بطور نذر پیش کی تھی ۔ سنہ ۱۸۰۰ع کے بعد سے گاڑیوں کے مختلف اقسام اور نام ہونے لگے یعنی لینڈ و ھاف لینڈ ، پالکن ، بروھام ، فٹن ، ڈاک کارٹ وغیرہ ان کو چار گھوڑے دوگھوڑے اور ایک گھوڑا باندھا جاتا تھا امیروں اور صاحب ثروت کے پاس کئی کئی گاڑیاں ہوتی تھیں امیروں کے اصطبل اور گاڑی خانے مشہور تھے ۔ جہاں بیسیوں سواریاں رہا کرتی تھیں ۔ عرب جمعدار غالب جنگ کے پاس چاندی منڈی ہوئی گاڑی تھی جو لنگر کے موقع پر نکلا کرتی تھی ۔

لینڈو گاڑی کو چمڑے کا ٹاپ ہوتا ، جو دونوں طرف کھل جاتا تھا ۔ پالکن اور بروھام گاڑی کا ٹاپ بھی چٹ لکڑی کا ہوتا تھا جو کھل نہیں سکتا ۔ فٹن کو چمڑے کا ٹاپ ہوتا جو صرف ایک طرف اترتا تھا ۔ ڈاک کارٹ کی مختلف صورتیں ہوتی تھیں ۔ ٹانگہ بھی ایک سواری کا نام تھا ۔ اس میں اکثر دو گھوڑے باندھے جاتے تھے اور اس کا استعمال اکثر عہدہ داران اضلاع کرتے یا شکار کے موقع پر استعمال ہوتا تھا ۔ جب گاڑیوں کا رواج ہوا تو شکرام کا بھی رواج ہوگیا اور بنڈی ، کھاچر اور رتھ کے بجائے شکرام استعمال ہونے لگے جن کو دو بیل باندھے جاتے تھے ۔

گاڑیاں اور شکرام ذاتی بھی ہوتے اور کرایہ سے بھی ملتے تھے

گاڑیوں کے ساتھ ایک عام سواری ''جھٹکہ'' کہلاتی تھی ، جس میں چلانے والے کے علاوہ چار آدمی سوار ہوتے تھے ۔ ''جھٹکہ'' کو ایک گھوڑا باندھا جاتا تھا ۔ شمالی ہند میں ''یکہ'' استعمال ہوتا تھا اورحیدرآباد میں ''جھٹکہ'' کا رواج تھا۔ شہر حیدرآباد میں سینکڑوں جھٹکے تھے ۔ عام طور سے اس میں مرد یا بچے تو چار یا پانچ سوار ہوتے مگر زنانہ سواری کے لیے پردہ ہوتا تھا ۔ عورتیں چھ چھ سات سات سوار ہوجاتی تھیں حیدرآباد کا جھٹکہ اور جھٹکہ والا اپنی خاص خصوصیات اور اطوار کے لحاظ سے مشہور ہوتا تھا ۔ جس طرح آج کل ''رکشا والا'' مشہور ہے ۔

حیدرآباد میں شمالی ہند کی ڈولی ''یکہ'' کا رواج نہیں ہوا ۔ جھٹکہ کے بعد ٹانگہ استعمال ہونے لگا تھا اگرچہ اب بھی ٹانگے ملتے ہیں مگر رکشا کے مقابل ان کی تعداد کم سے کم ہے ۔ دکن کے دوسرے شہروں میں فٹن اور یکے وغیرہ استعمال ہوتے تھے۔ ٹانگوں کے کئی اقسام تھے۔ جو مدراس اور میسور وغیرہ میں استعمال ہوتے ہیں ۔

حیدرآباد میں موٹرکار پہلے پہل سنہ ۱۹۰۵ع میں آئی یعنی کنگ جارج پنجم جب ولی عہد کی حیثیت سے ہندوستان کے سفر کے وقت حیدرآباد آئے تو ان کی سواری کے لیے موٹر آئی تھی ۔ سب سے پہلے راجہ صاحب رنپرتی نے ذاتی موٹر خریدی ۔ غالباً سنہ ۱۹۰۶ع میں خریدی تھی ۔ اس کے بعد موٹروں کا رواج ہونے لگا امراء ، جاگیردار ، اصحاب ثروت اور عہدہ دار موٹر خریدنے لگے حیدرآباد میں سنہ ۱۹۱۱ع تک بھی موٹروں کی تعداد زیادہ نہیں تھی ۔ جب کوئی موٹر راستے سے گذرتی تو پولیس والا سیٹی بجاتا تھا ۔ بعض موٹروں کے گذرنے کی یہ اطلاع ہوتی تھی ؛ کوتوال صاحب کی موٹر کو دوسیٹیاں ، وزراء یعنی منسٹروں کے لیے تین اور اعلیٰ حضرت کی موٹر کے لیے چار سیٹی بجاتے تھے ۔

حیدرآباد میں سنہ ۱۹۱۳ع تک بھی زیادہ موٹروں کا رواج نہیں

تھا ۔ یورپ کی پہلی جنگ کے بعد یہاں موٹروں میں زیادتی ہوتی گئی ٹیکی بھی چلنے لگی ۔ دکن میں ریل کی اجرائی ۱۸۵۷ء کے بعد ہوئی مدراس اور بمبئی میں اس کی اجرائی پہلے ہوئی ۔ اس کے بعد حیدرآباد میں ریل کی اجرائی سنہ ۱۸۷۰ء میں ہوئی ۔ پہلی لائن واڑی سے حیدآباد تک بنائی گئی ۔ مگر اس سے کچھ پہلے گلبرگہ سے رائچور تک جی ۔ آئی ۔ پی ۔ ریل تعمیر ہوئی تھی ۔

دکن میں سائیکلوں کا رواج بھی ہے اور موٹر سائیکل بھی ۔ حیدرآباد میں سائیکلوں کا رواج کیسے ہوا ہے اس کی تحقیق افسوس ہے کہ صحیح طور پر نہیں بتائی جا سکتی ۔ البتہ جہاں تک پتہ چلا ہے سائیکلوں کی ابتداء سنہ ۱۸۹۵ء کے بعد ہوئی ۔ یہ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ شہروں میں ہوائی جہاز اور موٹر استعمال ہوتے ہیں مگر دیہات میں ہنوز بنڈی کا رواج ہے ۔

انگلستان میں سنہ ۱۹۲۹ء تک دیہات میں گھوڑے کا رواج تھا ۔ خود شہر میں بھی گھوڑے گاڑیاں نظر آتی تھیں ۔ ہاتھی ، بوچہ ، میانہ ، کی سواریوں کے ساتھ جو اعزاز کے لیے ملتی تھیں ؛ سلا زسین ، سپاھی عرب ۔ عروسی سواری کے آگے اور پیچھے چلتے تھے یعنی یہ سواریاں ایک جلوس سے نکلتی تھیں ۔ ہماری یاد میں زیادہ تر گاڑیاں استعمال ہوتی تھیں اور ہر امیر جاگیردار صاحب اعزاز کی گاڑی کے آگے اور پیچھے سوار اپنے مقررہ ڈریس میں ہوتے تھے ۔ اعلیٰ حضرت حضور نظام کی سواری کے آگے اور پیچھے سدی رسالہ اپنے سیاہ کوٹ جس پر لیس ہوتی اور باڈی گارڈ سرخ شتلون زعفرانی کوٹ جس پر سفید اور سرخ لیس ہوتی تھی ۔ سفید برجیس پر بڑے شاندار اجاذب نظر ہوتے تھے ۔

حیدرآباد کے جاگیرداروں میں نواب معین الدولہ کا باڈی گارڈ جو روھیلوں کا تھا ، سیاہ شملوں ، گہرے سبز کوٹ اس پر زرد لیس اور برجیس میں ہوتے تھے ۔ بہر حال ہر امیر کی سواری کے آگے اور سفید

پیچھے ایک دو گاڑیوں میں مصاحبین بھی ہوتے تھے۔ گویا ایک مختصر جلوس ہوتا تھا۔ جب موٹروں کا رواج ہو گیا تو سواریوں کا قاعدہ موقوف ہو گیا۔ حیدرآباد کے ایک امیر نواب شہاب جنگ اپنی موٹر کے آگے بھی سوار رکھتے تھے۔ اگرچہ ہم کو اس پر تعجب ہوتا تھا۔ مگر جب سنہ ۱۹۵۳ع میں عراق کا سفر کیا تو بغداد میں شاہی سواری کے آگے بھی باڈی گارڈ گھوڑوں پر اور بادشاہ کو موٹر میں دیکھا۔ بہرحال سواری کی شان و شوکت دکن کے مسلمانوں کے کلچر کی یادگار نشانی تھی۔

چھٹا باب

رسم و رواج ، مہینوں کے نام ، مہینوں کے تقریبات ، شادی بیاہ کے تقریبات اور عیدیں وغیرہ

اب ہم دکنی تمدن کے دوسرے امور کی صراحت کرتے ہیں۔ رسم و رواج ، تقریبات اور مہینوں کے لوازم وغیرہ پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ ان امور میں بھی دو قوموں کو ملانے کا نظریہ کار فرما رہا ۔ اس میں نہ صرف بادشاہوں نےحصہ لیا بلکہ مذہبی رہنما ، صوفیا ، علما اور اصحاب علم نے بھی دست اندازی نہیں کی خود انھوں نے حصہ لے کر بعض اسلامی طور و طرز کے بدل جانے کو معیوب نہیں سمجھا ۔

ابن بطوطہ کے سفرنامہ کو دیکھا جائےتو واضح ہوتا ہے کہ بچے کی پیدائش سے لے کر شادی بیاہ حتیٰ کہ مرنے کے بعد بھی جو رسومات تھے تمام ہندوستان میں بدل گئے تھے ۔ حجاز ، عراق ، ایران ، شام اور مصر میں جو رسومات بچے کے پیدا ہونے سے مرنے تک انجام پاتے تھے ، ان میں ہندوستان دوسرے ملکوں سے بدلا ہوا تھا ۔ یہاں کے رسومات میں مقامی رنگ غالب آ گیا تھا ۔ اگرچہ شمالی ہند میں سلاطین تغلق کے دور سے تبدیلی شروع ہوگئی تھی ۔ مگر اس کا زیادہ رواج مغلیہ خصوصاً اکبر اور جہانگیر کے عہد میں ہوا اور دکن میں فیروز شاہ بہمنی ، سلطان محمد قلی قطب شاہ اور اس کے پیش رو علم بردار اور معمار ہیں ، جن کی سعی سے دکنی کلچر

کو فروغ ہوا۔

اس کے بعد آصفیہ دور حکومت میں دکنی کلچر کو اور استحکام حاصل ہوا ، مگر حکومت آصفیہ کے زوال کے اختتام کے بعد چونکہ ایک عظیم الشان انقلاب ہو گیا ۔ جاگیر داریاں ختم ہوگئیں ، ایک بڑے طبقے سے دولت و ثروت جاتی رہی، افلاس آگیا اور گرانی روز بروز زیادہ ہوتی گئی ۔ اس لیے جو تقریبات رسومات بچے کی پیدائش سے مرنے تک ہوا کرتے تھے وہ کم ہوگئے ۔ حتیٰ کہ اب ان رسومات کے نام بھی معدوم ہوتے جا رہے ہیں ۔ اس لیے ان کی مختصر صراحت بیان کی جاتی ہے ۔ تاکہ تاریخ میں ان کا نام باقی رہے ۔

ہندو رسومات مسلمانوں میں

تمدن و تہذیب معاشرت اور ثقافت میں جب ترقی ہوتی ہے تو دولت و ثروت کی فراوانی ہونے لگتی ہے ۔ بچے کے پیدا ہونے سے لے کر مرنے تک نئے نئے رسوم اور طریقے ایجاد ہوتے ہیں ۔ یا یوں سمجھو کہ مہد سے لحد تک بیسیوں رسومات ہونے لگتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی اس کا سلسلہ باقی رہتا ہے ۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم کے مختلف رسومات ہوتے ہیں ۔ دنیا کے دوسرے حصوں کو چھوڑ کر صرف ہندوستان و پاکستان پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوگا کہ جنوبی ہند اور شمالی ہند کے رسومات میں فرق ہے ۔ اس طرح بنگال اور گجرات میں فرق نظر آئے گا ۔ تاہم بعض رسومات ایسے ملیں گے جو مشترک طور پر ہر جگہ ملیں گے ۔

تاریخ کے اوراق سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ عربوں نے اولاً سندھ میں اپنی حکومت قائم کی ۔ اس کے بعد جنوبی ہند میں تاجر اور مبلغ بن کر وارد ہوئے اور بالآخر شمال کی طرف سے پنجاب ہوتے ہوئے تمام ہندوستان میں اپنی حکومت قایم کر لی ۔ کئی صدیوں تک انہوں نے شان و شوکت کر و فر سے نہ صرف حکومت کی بلکہ

ہندوستان کو علم و ہنر اور تمدن و تہذیب سے مالا مال کر دیا ۔ اپنی رعایا کے ساتھ روا داری کا سلوک کیا ۔ ان کو مذہبی آزادی دی ان کے مندروں کی حفاظت کی ان کے دیولوں اور مندروں اور مٹوں کو جاگیرین دیں ۔ ان کو مالی اور فوجی خدمات دے کر ان کو اپناتے کے لیے ان میں گھل مل گئے ۔ ان کے شادی و غم کے رسومات کو اپنے خوشی و غم کے رسومات میں شامل کر لیا ۔

اسلام کا دعویٰ ھے کہ وہ فطری مذہب ھے اور اس کے اصول اور قوانین انسانی فطرت سے انحراف نہیں کرتے ۔ اس کی عبادت اور اس کے فرائض ایسے نہیں ھیں جو انسان پر بار گذریں اور انسانی فطرت اس کو قبول نہ کرے ۔ اس لحاظ سے پغمبر اسلام صلعم نے بچے کے پیدا ھونے سے اس کے مرنے تک جو مراسم انجام دے کر رھبری فرمائی وہ معدودے چند ھیں اور انگلیوں پر گنے جاسکتے ھیں ۔ بچہ پیدا ھونے پر اس کے کان میں اذان دینا ، کوئی نام رکھنا ، پھر اس کا عقیقہ کرنا اور اگر صاحب ثروت والدین ھوں تو لڑکے کے لیے دو بکرے اور لڑکی کی صورت میں ایک بکرا ذبح کرنا ، اس کا گوشت خود کھانا ، ھمسایہ ، عزیز و اقارب ، مساکین اور محتاجوں میں تقسیم کرنا اس کے بعد کوئی رسم نہیں ۔ البتہ پیدایش کے چند سال بعد تعلیم کا آغاز کرانا کیونکہ ھر مسلم عورت اور مرد پر تعلیم کا حاصل کرنا ضروری قرار دیا گیا ھے ۔ اذان ، نام اور عقیقے کے بعد صرف نکاح اور ولیمے کا حکم ملتا ھے ۔ نکاح کے لیے چند شرایط ھیں مثلاً ؛ مہر کی ادائی ، نکاح کرنے والی عورت کو ایک مرتبہ دیکھ لینا ، عقد پر کھجور تقسیم کرنا ، نکاح کے بعد دعوت ولیمہ، مرنے پر میت کا غسل ، کفن ، دفن ، میت کا منہ قبلہ کی طرف کرنا اور تدفین کے بعد فاتحہ پڑھنا ۔

بس یہ تھے اسلام یا مسلمانوں کے سیدھے سادھے سماجی مراسم، لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا دولت و ثروت میں اضافہ ھونے لگا۔

مذہب اسلام کا دائرہ دور دور تک پھیل گیا تو سماجی مراسم میں بھی بیشی ہوتی گئی - نئے نئے رسم و رواج خوشی اور غم کے لیے ایجاد ہونے لگے -

یہ ہم بتا چکے ہیں کہ پہلی صدی ہجری ہی میں سندھ عربوں یا مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا تھا - اس کے بعد شمال کی طرف سے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ بعض اصحاب کا خیال ہے کہ ہندوستان میں شہنشاہ اکبر اور دکن میں سلطان محمد قلی قطب شاہ نے مسلمانوں اور ہندوؤں کو ملانے ، آپس میں اتحاد اور اتفاق پیدا کرنے اور یگانگت کی بنیاد قائم کرنے کے لیے ہندی رسومات کو اپنا لیا تھا - یک جہتی پیدا کرانے کے لیے ایسے رسومات اختیار کرنے لگے جو ہندو سماج میں رایج تھے - لیکن تحقیقات سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ اکبر اور سلطان محمد قلی کے بہت پہلے سے بھی ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے خوشی اور غم کے موقعوں کے لیے کئی ہندی رسومات انجام دینے لگے تھے - چنانچہ مشہور اسلامی سیاح ابن بطوطہ نے جس نے سلطان محمد تغلق کے زمانے میں ہندوستان کی سیاحت کی تھی اور اپنا سفر نامہ قلم بند کیا تھا - اس میں اس نے خود سلطان محمد تغلق کی بہن کی شادی میں شرکت کی تھی اور جو حالات بہ چشم خود دیکھے تھے ان کو قلم بند کیا ہے - اس کا مختصر اقتباس قابل ملاحظہ ہے'' - ملک فتح اللہ بڑے بڑے سائبان لایا اور اس نے دونوں صحنوں پر سائبان لگائے اور ایک صحن میں ایک بڑا خیمہ لگایا اور اس میں طرح طرح کے عمدہ فرش بچھائے اور شمس الدین تبریزی مطربوں اور طوایف کو لے کر آیا - یہ سب بادشاہ کے غلام اور لونڈیاں تھیں اور باورچی اور نان بائی اور حلوائی اور سقے حاضر ہوگئے - جانور اور پرندے ذبح کیے گئے - اور پندرہ دن تک سب لوگوں کو کھانا کھلایا گیا اور بڑے بڑے امیر اور پردیسی دو وقت کھانے میں شامل ہوتے تھے - نکاح کی

رات سے دو دن پہلے بادشاہ کے محل سے بیگمیں آئیں اور انھوں نے مکان آراستہ کیا اچھے اچھے فرش بچھائے اور امیر یوسف الدین کو بلایا یہ پردیسی تھا اور اس کا کوئی نزدیکی رشتہ دار وہاں نہیں تھا - ان عورتوں نے اس کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور اس کو مسند پر بٹھایا - بادشاہ نے حکم دیا تھا کہ بادشاہ کی سوتیلی ماں جو مبارک خاں کی ماں تھی امیر سیف الدین کی ماں بنی اور بیگموں میں سے دوسری عورت اس کی بہن بنی اور تیسری عورت پھوپھی اور چوتھی اسکی خالہ بنی تا کہ وہ سمجھے کہ اس کا تمام خاندان یہاں موجود ہے - انھوں نے اس کو چوکی پر بٹھایا اور اس کے ہاتھ پاؤں میں مہندی لگائی اور باقی عورتیں کھڑی ہو کر ناچتی رہیں - اس ملک میں یہ دستور ہے کہ جس مکان سے دولھا دلھن کو اپنے گھر لاتا ہے تو اس مکان کے دروازے پر دلھن کی جماعت کھڑی ہو جاتی ہے اور جب دولھا کی جماعت آتی ہے تو ان کو داخل ہونے سے روکتے ہیں - اگر وہ غالب ہو جاتے ہیں تو چلے جاتے ہیں اور اگر مغلوب ہو جاتے ہیں تو ان کو ہزاروں روپیہ انعام دینے ہوتے ہیں[1] -

بادشاہ کی جانب سے خلعت لائے جو زبفت کی بنی ہوئی تھی اور اس‌قدر جواہرات اس پر جڑے ہوئے تھے کہ ان کی وجہ سے کپڑے کا رنگ نظر نہیں آتا تھا - پھر ایک چیز لائے جو تاج کے مشابہ تھی[2] اور چمبیلی اور نسرین اور رائے بیل کے پھولوں کی بنی ہوئی

۱- دکن میں اب بھی کس قدر ترمیم سے یہ رسم جاری ہے - اس کو" دھنکانہ" کہتے ہیں - جب دولھا کا جلوس عقد نکاح کے لیے دلھن کے مکان کو آتا ہے تو سالا مکان کا دروازہ بند کر دیتا ہے - جب تک ایک رقم دولھا والوں سے حاصل نہیں کی جاتی دروازہ نہیں کھولا جاتا -

۲- یہ سہرا کہلاتا ہے اور اب تک دکن میں اس کا رواج ہے -

تھی اور جس کی جھالر منہ اور سینے پر لٹکتی تھی ۔ امیر کو کہا اس کو سر پر رکھیے ۔ اس نے انکار کیا کیونکہ وہ عرب کا صحرائی تھا ۔ میں نے کہا (ابن بطوطہ) میرا کہنا مان اور اس کو قسم دلائی تو اس نے سر پر رکھا پھر سب جماعت حرم کے سرے دروازے پر پہنچی تو وہاں دلھن کی جماعت کھڑی تھی امیر نے اپنے سپاھیوں کے ساتھ ان پر حملہ کیا اور سب کو بھگا دیا ۔ صحن میں جب داخل ہوئے تو وہاں ایک منبر جو دیبا سے منڈھا ہوا تھا اور اس پر جواھرات جڑے ہوئے تھے دلھن کو لا کر بٹھا دیا گیا اور عورتیں گاتی رھیں ۔ امیر کا گھوڑا منبر تک آیا وہاں امیر گھوڑے سے اترا اور منبر کی پہلی سیڑھی کے پاس کھڑے ہو کر زمین بوس ہوا ۔ اس وقت دلھن کھڑی ہو گئی ۔ پھر دلھن نے اپنے ھاتھ سے امیر کو پان دیا اور پھر امیر دلھن سے ایک سیڑھی نیچے بیٹھ گیا اور اس کے ساتھیوں پر درھم اور دینا نثار کیے گئے۔ عورتیں گاتی جاتی تھیں ۔ باھر نوبت نقارے بج رہے تھے ۔ پھر امیر کھڑا ھوگیا اور اپنی دلھن کا ھاتھ پکڑ کر منبر سے نیچے اترا اور وہ اس کے پیچھے پیچھے ہولی ۔ امیر گھوڑے پر سوار ھوگیا اور دلھن میانے میں بیٹھ گئی'' [1] ۔ اسی طرح میت کے متعلق جو رسومات انجام دیے جاتے تھے ان کا حال بھی ابن بطوطہ نے اپنی دختر کے انتقال کے ضمن میں بیان کیا ھے ۔ اس کا اقتباس بھی قابل ملاحظہ ھے ۔

''اس ملک میں یہ دستور ھے کہ تیسرے دن صبح میت کی قبر پر جاتے ھیں اور قبر کے ارد گرد ریشمی کپڑے اور گدیلے بچھاتے ھیں اور قبر پر پھول رکھتے ھیں یہ پھول ہر موسم میں دستیاب ہو جاتے ھیں ۔ مثلاً چمپہ ، گل یاسمین ، گل شبو ، رائے بیل ، چنبیلی ، نارنج اور لیموں کی ٹہنیاں بھی

۱۔ ''سفر نامہ ابن بطوطہ'' جلد دوم صفحہ ۱۲۵ و ۱۲۶

مع پھلوں کے قبر پر رکھتے ھیں اور اگر اس میں پھل موجود نہ ھوں تو دھاگے کے ذریعے سے سیووں کے دانے ان میں لگا دیتے ھیں اور اپنے اپنے کلام اللہ لاتے ھیں اور وھاں پڑھتے ھیں ۔ جب ختم کر چکتے ھیں تو لوگوں کو گلاب پلایا جاتا ھے اور گلاب چھڑکا جاتا ھے ۔ پان کے بیڑے دیے جاتے ھیں ۔ اس کے بعد لوگ چلے جاتے ھیں ۔[1] جب تیسرے دن کی صبح ھوئی تو میں حسب دستور باھر نکلا اور جو کچھ مجھے میسر تھا تیار کیا مگر معلوم ھوا کہ وزیر نے سب کچھ تیار کر رکھا ھے اور قبر کے اوپر ڈیرہ لگا ھوا ھے ۔ لوگ قرآن پڑھ رھے تھے ۔ میں اپنے ھمراھیوں کے ساتھ قبر پر بیٹھ گیا جب وہ قرآن پڑھ چکے تو قاریوں نے بہت اچھی آواز سے کلام اللہ پڑھنا شروع کیا اس کے بعد قاضی کھڑا ھوا اور اس نے مرثیہ پڑھا ۔ پھر دعا مانگی ۔ حاجب اور اس کے ھمراھیوں نے گلاب کے شیشے لے کر لوگوں پر گلاب چھڑکا اور پھر مصری کا شربت سب کو پلایا اور پان تقسیم کیے[2] '' ۔

اس تفصیل سے واضح ھوسکتا ھے کہ اکبر سے صدیوں پہلے مسلمانوں نے کئی رسومات اختیار کر لیے تھے جو حجاز اور ایران وغیرہ میں رایج نہیں تھے ۔ اس امر کی صراحت کرنی دشوار ھے کہ وہ کیا کیا رسومات اور مراسم ھیں جن کو ھندوستان کے مسلمانوں نے ھندوؤں سے لیے ھیں البتہ ھم ان بڑے بڑے رسومات کی صراحت کریں گے جو بچے کی پیدایش سے شادی بیاہ تک مسلمانوں میں رائج

---

۱ ، ۲ ۔ یہ حال ابن بطوطہ نے اپنی ایک سات سالہ دختر کے مرنے کے متعلق قلم بند کیا ھے جو دھلی میں فوت ھوئی تھی ۔ دیکھو ''سفر نامہ ابن بطوطہ'' جلد دوم صفحہ (۲۰۲)

ہوگئے ۔ اس امر کا خیال رہے کہ بعض مراسم صرف دکن سے متعلق تھے اور بعض ہندوستان کے دوسرے حصوں سے بھی تعلق رکھتے ہیں ۔ اولاً ہم مجمل طور پر صرف ناموں کی صراحت کریں گے اور پھر بعض کے متعلق کس قدر وضاحت کی جائے گی ۔

بچے کی پیدایش کے رسومات

بچہ کے تولد پر کان میں اذان اور اقامت دینا ، چھٹی ۔ عقیقہ ، نام رکھائی ، چھلہ ۔

سن شعور کے رسومات

جھولے کی رسم ۔ چٹانا ۔ دودہ بڑھائی ۔ مکتب یا تسمیہ خوانی ۔ کان ناک چھدائی ۔ ختنہ ۔ روزہ رکھائی ۔ نہارا یا الائچی کی رسم ۔ رسم بلوغت ۔ ختم قرآن شریف ۔

شادی بیاہ

منگنی ۔ بیوی کی سینک ۔ رات جگا ۔ ساچق ۔ مہندی ۔ شب گشت ۔ دھنکانہ ۔ مجلس عقد ۔ جلوہ رونمائی ۔ باز گشت ۔ چوتھی ۔ جمعہ گی ۔

زچہ کی رسومات

چوماسا ۔ ستران ۔ نوماسا ۔

میت کے مراسم

سوم ۔ دھم ۔ بیسراں چھلم ۔ برسی ۔

یہ تو بڑے بڑے رسوسات کے نام ہیں ضمنی طور پر جو رسومات ہر ایک رسم میں انجام دیے جاتے ہیں ان کی صراحت دشوار ہے

جس کا یہاں موقع نہیں ہے جن رسومات کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں کئی ہندوؤں سے اخذ کیے گئے ہیں - خود ناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ''ہندی'' ہیں جن مراسم کے نام ہندی ہیں - ہم یہاں ان کی مختصر صراحت کرتے ہیں ۔

(۱) کان میں اذان دی جاتی ہے اور بائیں کان میں اقامت کہی جاتی ہے یہ اسلامی رسم ہے جو بدستور باقی ہے ۔

(۲) چھٹی یہ ہندی لفظ ہے بچے کی ولادت کے چھ دن کے بعد اس کو انجام دیتے ہیں - چھ دن کی نسبت سے اس کو چھٹی سے موسوم کیا گیا ہے ۔ بعض خاندانوں میں اس دن بچے کا نام بھی رکھا جاتا ہے - زچے کے میکے کی جانب سے کھانوں کی ضیافت ہوتی اور بتاسے تقسیم کئے جاتے ہیں اس کے ساتھ پان اور سپاری بھی تقسیم ہوتی ہے ۔

(۳) چھلہ یہ بھی ہندی لفظ ہے اس کے معنی زچہ کے چالیس دن کے غسل کے ہیں یہ تقریب بھی زچہ کے میکے کے جانب سے بڑی دھوم دھام سے ہوا کرتی تھی ۔ زچہ نو مولود اور بچے کے باپ کے لیے کپڑے بنائے جاتے ۔ پھول پہنائے جاتے ہیں رشتہ داروں اور دوستوں کی دعوت ہوتی ہے ۔

(۴) تسمیہ خوانی یا مکتب اگرچہ تقریب نام کے لحاظ سے عربی ہے کیونکہ مکتب کے معنی پڑھنے کے ہیں مگر اس تقریب کی ابتدا ہندوستان سے ہوئی ہے کیونکہ ہندوستان میں جب بچے کی تعلیم کا آغاز ہوتا ہے تو خاص رسومات انجام دیے جاتے ہیں اور زنار بندی کی جاتی ہے ۔ چونکہ مسلمانوں میں آنحضرت نے تعلیم کا خاص حکم دیا ہے اس لیے بچے کے چار سال چار ماہ کے سن پر یہ تقریب انجام دی جانے لگی - بچے کو پڑھنے کی رغبت دلانے کے لیے سامنے لڈو (ایک قسم کی مٹھائی جو ہندی لفظ ہے) رکھتے ہیں بعد میں اس کی تقسیم کا رواج ہو گیا ۔

(۵) بلوغ - کان - ناک چھدائی - یہ رسومات بھی ھندوستان میں آغاز کیے گئے - خصوصاً ناک چھیدنا اور نتھ پہنانے کا استعمال اور اس کو سہاگ کی علامت قرار دینا تمام تر ھندوستان سے لیا گیا ھے -

(۶) منگنی یہ ھندی کا لفظ ھے - یہ وہ رسم ھے جو شادی کے پہلے نسبت کی قرار داد ھوتی ھے - طرفین والے جب آپس میں شادی کا تصفیہ کر لیتے ھیں تو ایک خاص تاریخ مقرر کی جاتی ھے اور لڑکے والے لڑکی والوں کے یہاں آتے ھیں - ان کی یہاں ضیافت ھوتی ھے - ھونے والی دلھن کو لڑکے والے کوئی زیور بطور تحفہ پہناتے ھیں جس کو چڑھاوا کہا جاتا ھے - چڑھاوا ھندی کا لفظ ھے پھر اس کے بعد لڑکی والے لڑکے والوں کے یہاں جاتے ھیں اور وھاں ان کی ضیافت ھوتی ھے اور ھونے والے دولھا کو کوئی تحفہ پیش کیا جاتا ھے - مثلاً انگشتری پہنائی جاتی ھے -

جنوبی ھند کے مسلمانوں میں منگنی کے بعد ایک خاص رسم اور ھوتی تھی یعنی دلھن والے ایک بڑی رقم دولھا والوں کو روانہ کرتے تھے - اس رسم کو ''پنڈی'' کہا جاتا تھا - تلنگی میں شادی کو ''پنڈلی'' کہتے ھیں - یہ لفظ غالباً اسی سے لیا گیا ھے -

(۷) رتجگا شادی شروع ھونے کے پہلے عورتیں تمام رات جاگ کر گلگلے اور پوریاں بناتی ھیں اس کو رتجگا سے موسوم کیا جاتا تھا - بعض گھرانوں میں گلگلے پوریاں بنانے کے بجائے مولود شریف پڑھایا جاتا ھے - گویا اس سے تقریب کا آغاز ھوتا ھے -

(۸) منجھ یہ بھی ھندی لفظ ھے جس کے معنی پلنگ کے ھیں - شادی کے پہلے ھندوؤں میں یہ رسم ھے - دلھن کو مہندی لگا کر زرد کپڑے پہنا کر پلنگ پر بٹھا دیا جاتا ھے - گویا وہ گھر کے کام سے بالکل الگ کر دی جاتی ھے -

یہی رسم مسلمانوں نے بھی اختیار کر لی - شادی سے دو چار

دن پیشتر دلہن کو غسل دے کر زرد کپڑے پہنا کر ایک علیحدہ کمرے میں بٹھا دیا جاتا ہے ۔ اس کمرہ اور پلنگ کا فرش بھی سب زرد رنگ کا ہوتا ہے ۔ مانجے کے بعد سے دلہن گھر کے ہر کاج سے بالکل علیحدہ کر دی جاتی ہے ۔ البتہ ہلدی دولھن کو ہندوؤں کی طرح نہیں لگائی جاتی ۔

(۹) سانچق یہ بھی ہندی رسم ہے دولھا والے دولھن کو کپڑوں کے جوڑے روانہ کرتے ہیں ۔

(۱۰) مہندی : یہ رسم بھی ہندوستان سے ہی لی گئی ہے ۔ دلہن کا لباس اور مہندی وغیرہ دولھا کی جانب سے کی جاتی ہے ۔ دلہن کے یہاں مہانوں کی پھول پان سے تواضع کی جاتی ہے ۔ دلہن کو مہندی لگائی جاتی ہے ۔

(۱۱) جلوہ : یہ رسم بھی ہندوستان سے لی گئی ہے ۔ سنسکرت میں اس کو ”درھو پرنس“ کہتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ دلہن کا اس منڈوے میں داخل ہونا جو دلہن کے گھر میں بہ غرض شادی بنایا جاتا ہے ۔ مسلمانوں میں چونکہ عقد کے بعد دلہن کو دولھا کے ساتھ نہیں بٹھایا جاتا ۔ اس لیے عقد کے بعد جلوہ کی رسم ادا کی جاتی ہے ۔ اس موقع پر جو ضمنی رسومات اگرچہ بہ‌لحاظ زمانہ کم کر دیے گئے ہیں مگر اس کے باوجود مختلف رسومات اس وقت بھی انجام دیے جاتے ہیں ۔

(۱۲) چوتھی : یہ لفظ بھی ہندی ہے ۔ یہ اس رسم کو کہتے ہیں جو نکاح کے دوسرے دن انجام دی جاتی ہے ۔ دلہن دولھا کے گھر جانے کے بعد دوسرے دن اس کو میکے میں طلب کیا جاتا ہے اور رات میں دولھا اور اس کے دوست احباب دلہن کے یہاں مدعو ہوتے ہیں ۔ اس موقع پر بھی بیسویوں رسومات انجام پاتے تھے مگر اس میں بہت کچھ اصلاح ہوگئی ہے ۔ پہلے زمانے میں چوتھی کے روز میووں اور ترکاری وغیرہ سے دولھا کو دلہن والے مارا کرتے تھے

اور دولھا کے دوست اس طرح اس کا بدلا دلھن والوں سے لیا کرتے تھے۔ مگر یہ رسم اب بالکل موقوف ہو چکی ہے۔ صرف ضیافت اور گلپوشی کی رسم باقی رہ گئی ہے۔

(۱۳) حاملہ عورتوں کے رسومات یعنی چوماسا چوتھے مہینے کا۔ ستواں سا ساتویں ماہ کا اور نوماسا نو ماہ شروع ہونے پر، یہ سب ہندی رسومات ہیں۔

(۱۴) میت کی فاتحہ جو تیسرے دن، دسویں روز، بیسویں روز اور چالیسویں دن کے بعد کی جاتی ہے ہیں یہ بھی ہندوستان میں اختیار کی گئی ہے جیسا کہ ابن بطوطہ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا رواج ابن بطوطہ نے کسی اور شہر میں نہیں دیکھا اور پھر جس طرح چالیسویں دن چالیس قسم کے کھانے پکوا کر فاتحہ دی جاتی ہے یہ سب ہندی مراسم ہیں۔

مسرت کی تقریبات یعنی بچے کے چھٹی چھلہ سے لے کر شادی بیاہ تک ہندوؤں میں باجے اور گانے کا ہونا لازمی ہے یعنی ان تقریبات میں جب تک باجا نہ ہو رسم کی تکمیل نہیں ہو سکتی اور پھر ان مراسم کی موزونیت کے لحاظ سے باجوں میں مختلف گیت گائے جاتے ہیں۔

یہی طریقہ دکن کے مسلمانوں میں رائج رہا۔ عورتوں کے مجمع میں جو گانے ہوتے وہ علیحدہ ہیں اور مردوں کے سامنے جو گانے ہوتے وہ علیحدہ ہیں اور کئی رسومات عموماً گھر کے اور ہوتے ہیں جہاں مردوں کا رہنا ضروری نہیں ہے۔

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہندو تقریبات اکثر مخلوط مجمع یعنی مردوں اور عورتوں کے سامنے ہوتے ہیں۔ مگر مسلمانوں میں چونکہ پردہ لازمی تھا اس لیے عقد خوانی تو مردوں کے مجمع میں ہوتی لیکن جلوہ وغیرہ کی رسمیں زنانہ حصے میں ہوتی رہی ہے۔ جس میں عام مرد نہیں جا سکتے۔ دلھن کے رشتے دار بھی جلوہ کی پوری

تقریبات میں شریک نہیں ہوتے بلکہ مخصوص رشتہ دار جاتے ہیں ۔

شادی بیاہ کے موقع پر جو رسومات انجام دیے جاتے ہیں ان میں خصوصیت سے سانچق ، مہندی، شب گشت اور باز گشت ایسے رسومات تھے جن کا جلوس کے ساتھ جانا ضروری تھا ۔ سانچق کا جلوس دولھے والوں کی طرف سے دولھن کے یہاں جاتا اور مہندی کا جلوس دلھن والوں کی جانب سے دولھا کے یہاں جاتا دونوں رسومات میں مردتو باھر رہتے اور عورتیں زنانے حصے میں جا کر رسومات انجام دیتیں ۔ اس موقع پر جو رسومات انجام دیے جاتے ان کی صراحت طوالت کی موجب ہے اس لیے مختصر صراحت کی جاتی ہے -

سانچق

دولھا والوں کے طرف سے بری جاتی ہے کشتیوں میں یا مٹی کے کھڑوں میں جن پر رنگیں نقش ونگار کیا جاتا ہے بری میں حسب ذیل چیزیں ہوتی ہیں ۔ سوکھی کھجوریں ، کھوپرے کی بٹیاں ، ثابت بادام ، مصری کی ھانڈیاں (یعنی مصری کی ھانڈیوں کی وضع میں) دلھن کے چار پانچ یا سات جوڑے چڑھاوے ، چوڑی کا جوڑا جسے حیدرآباد میں ’’کھویڑا‘‘ کہتے تھے اور یہ خاص قسم کا جوڑا ہوتا تھا ۔ جوتی بھی حیدرآبادی دلھن کے لیے خاص لی جاتی تھی جسے ’’آپا شاھی‘‘ کہتے ہیں یہ جوڑے سونے کی سلیپر ہوتی ہے جس کے سامنے کا حصہ مڑا ہوا ہوتا ہے اس پر کاغذ کی رنگین نپتنی اور چھوٹے سلمے ستارے کا کام ہوتا ہے تیل ، کنگھی ، مسی ، آئینہ ، تیل گری ، سرمہ ، کاجل ، اور ایک رنگین کاغذ میں بغیر کٹا چھٹا اپٹن کا مصالۂ بندھا ہوا ’’سہاگ پڑا‘‘ کہتے ہیں ۔ عطر ، چوٹی میں لپیٹنے کے لیے سنہرے تار اور ریشم و مقیش کے بنے ہوئے یہ بڑے بڑے پھندنوں کا ایک گچھا ہوتا ہے جس سے چوٹی میں موباف کی جگہ گوندھا جاتا ہے ۔ چھوٹی چھوٹی چاندی کی تھالیوں میں چکسا ، ہلدی ، مہندی

کندھی ہوئی ۔ مصری کے چھوٹے ٹکڑے ، مالیدے کے چند چھوٹے اور لامبے بیڑے ، پان کے بیڑے ، رنگین کھوپرا اور ''کوڑ'' یعنی وھی چند پانوں پر بلڑی سپاری مصری اور حسب حیثیت پانچ یا سات گیارہ روپے رکھ کر ان سب چیزوں پر روپہلی ورق لگایا ۔ مٹی کی رنگین ٹھلیاں جن میں رنگ بھرا ہوا رنگین کاغذ کے چند ''جہاز'' یہ کاغذ کے پھول پتے بانس پر لگا کر بنائے جاتے ھیں ۔ اور بہت خوبصورت ابرک و کاغذ کے خوان مع خوان پوش کے (جنھیں چھبا کہا جاتا ھے) ان خوانوں میں مٹھائی کی ٹوکریاں رکھی ہوتی ھیں ۔ نیشکر کی چند چھڑیاں ، چند رنگین مٹی کے گملے جن میں بانس کی رنگین پچکاریاں پڑی ہوتیں ۔ یہ سب سامان سجا کر کسی معتمد ماما نوکر کے ھمراہ باجے گاجے سے سر شام دلھن کے گھر بھجوایا گیا ۔ ان ماما صاحبہ نے خود پھولوں کے گہنے کی چنگیر (یہ چاندی کی ہوتی ھے جس پر کا رچوبی تورہ پوش ہوتا ھے) اٹھائی باقی سامان اور خوان وکشتیاں جو رنگین بستوں میں بندھے ہوئے سب پر بھاری خوان و کشتی پوش ڈھکے ہوئے مزدوروں کے سروں پر اٹھوائے دلھن کے گھر پہنچیں ۔ وھاں کی ماما بہت پہلے سے ان کے استقبال کے لیے قسم قسم کے رنگ گھولے تیار تھیں ۔ جیسے ھی کشتیاں وغیرہ کے بوجھ سے سب ھلکے ہوئے رنگوں میں شرابور کر دیے گئے ۔ اب دلھن والے ایک پر ایک ٹوٹے پڑ رھے ھیں اور خوان اورکشتیاں کھول کر جوڑے و چڑھاوے دیکھے جا رھے ھیں ۔ بری کے اندازے ہو رھے ھیں کوئی تعریف کر رھا ھے کوئی ناک بھوں چڑھا رھا ھے کوئی جل رھی ھے کوئی اترا رھی ھے ۔ اب رات بڑی دیر گئے دولھا والوں کی آمد دلھن کے یہاں شروع ہوئی ۔ آج سمدھنوں کے خوب بن ٹھن کر بھاری بھاری لباس میں لدے پھندے آنے کا دن ھے ۔ ایک سواری آئی ۔ غل ہوا سمدھن آ رھی ھیں ۔ لڑکیاں ''صندل ھاتھ'' دینے کے لیے صندل کی کٹوری اور پان لیے دوڑیں اور پاؤں گھڑی (یہ

ایک سرخ کپڑا سمدھنوں کے راستے میں بچھایا جاتا ہے جس پر سے چل کر وہ فرش پر آ بیٹھتی ہیں) کے قریب منڈپ (یہ دوسرا سرخ کپڑا پاون گھڑی کے اوپر ڈوریوں سے تان دیا جاتا ہے ۔) کے نیچے آ کھڑی ہوتی ہے ۔ جیسے ہی سمدھن کچھ لباس و زیور کے بوجھ سے اور کچھ نخرے شان کے انداز میں بہت ہی سنبھلتی سدھرتی دوپٹہ یا ساڑی کے آنچل کو بار بار درست کرتی پاون گھڑی پر آئیں کہ لڑکی نے پان پر تھوڑا صندل لگا کر آگے بڑھا دیا ۔ سمدھن نے انگلیوں سے چھوا اور آگے بڑھ گئیں ۔ (سلام و آداب مزاج پرسی سے جانبین بے نیاز رہتے ہیں) میراثنوں نے ''آیولے ساجن آیو'' (آئی رے سمدھن) کی دو چار بار تکرار کی دو تین آڑے ترچھے بے تکے ہاتھ ڈھولک یا طبلے پہ مارے اور بیزارگی سے گانا ختم کر دیا ۔ سمدھن صاحبہ چاندنی کے فرش سے گذر کر حسب مراتب سوزنیوں ؛ مسند پر جا بیٹھیں مسند خاص دولھا کی ماں ۔ بہنوں بھاوجوں کے لیے ہوتی ہے ۔ اس طرح ٹھہر ٹھہر کر سمدھیانے کی سواریاں آتی رہیں ۔

جب معلوم ہوا کہ اب کوئی آنے والے باقی نہیں تو ایک دوسرا سرخ کپڑا دو عورتوں نے منڈپ کی طرح ہاتھوں میں پکڑا اس کے نیچے ایک لڑکی تھالی میں مصری کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رکھے اور چھوٹا سا حصہ تورہ پوش کا اٹھا کر وہ تھالی بڑھانے لگی ۔ سمدھن صاحبہ نے عجیب شان سے مصری کا ایک ٹکڑا اٹھا لیا (سنتے ہیں دلی میں سمدھنوں کو شربت پلایا جاتا ہے ۔ اور شربت خوری میں حسب حیثیت رقم تھالی میں سمدھنیں ڈالتی ہیں مگر دکن میں کوئی کچھ دیتا لیتا نہیں) یہ مصری ''چنوائی'' ہوئی اس دوران میں میراسن کا گانا بھی کچھ عجیب ہوتا ہے یعنی ''تو کزاری سمدھن مصری تیرے پیٹ کو ٹزنڈی مصری'' ۔ اس کے بعد پہلے زمانے میں سمدھنوں کو کھانا کھلایا جاتا تھا ۔ لیکن اب یہ رسم نہیں ۔ دولھا والے ہزار جلدی کریں لیکن دلھن بارہ یا ایک بجے سے پہلے

باہر نہیں لائی جاتی ۔ اس سے پہلے بیچ دالان میں مسند بچھائی جاتی ہے اس پر چوکی رکھی جاتی ہے ۔ آفتابہ اور چلمچی مسند کے ایک طرف لا کر رکھا جاتا ہے ۔ دلہن اس مایوں کے زرد لباس پر چڑھاوے کے جوڑوں میں سے زرد رنگ کے ڈوپٹے کو اڑھا کر گود میں لائی جاتی ہے اور چوکی پر بٹھانے کے بعد دلہن کے سامنے ہو بیٹھتی ہیں پھر وہی رسوم شروع ہوتے ہیں جو مایوں کے وقت ہوتے ہیں ۔ پھول پہنانے کے بعد جڑھاوے کا زیور پہنایا جاتا ہے ۔ سب کے آخر میں ساس صاحبہ (سر اور پیٹھ پر خوب آنچل درست کر کے گویا بڑی مذہبی رسم انجام دے رہی ہیں) مسی کو تیسری انگلی پر خوب لگا لیتی ہیں اور دلہن کے ہونٹوں پر پانچ یا سات بار انگلی پھیر دیتی ہیں ۔ یہ گویا نکاح سے پہلے سہاگن بنادی گئیں ۔ اس کے بعد کلی کرائی جاتی ہے ۔ بعض گھرانوں میں کنگنا بھی باندھا جاتا ہے ۔ یہ ایک کلا بتونی ڈوری پر کا رچویں کپڑے میں روپیہ سلا ہوتا ہے ۔ جسے دلہن کے حنائی ہاتھ کو تھام کر کلائی پر بڑی احتیاط سے باندھا جاتا ہے ۔ اور بعض لوگ سانچق کے دن سہرا بھی باندھتے ہیں ۔ یہ سب ہونے کے بعد گھونگھٹ اٹھا کر ساس دلہن کا چہرا سب کو دکھلاتی ہے ۔ پھر دلہن گود میں اندر کمرے میں جاتی ہے ۔ ساتھ ہی سمدھنوں کی واپسی شروع ہوجاتی ہے ۔ یہ ہوئی سانچق ۔

جس طرح رسم سانچق کی تفصیل ہوئی ہے اس طرح مہندی وغیرہ رسومات کی تفصیل کی جائے تو اس کتاب کے صفحات بہت زیادہ ہو جائیں گے - اس لیے ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے ۔

جب سلطان عبداللہ کی تیسری دختر کی شادی کسی اور سے ہونے والی تھی تو حضرت شاہ راجو قتال نے ابوالحسن تانا شاہ کو شادی کی نوید سنائی تھی ۔ جب طرفین کے رسومات ہونے لگے تو شاہ صاحب نے اپنے مریدوں کو کہا تھا کہ ابوالحسن کو مہندی

لگائی جائے غرض شادی بیاہ کے رسومات ھندی کلچر سے لیے گئے ھیں ۔

شادی کا آغاز مانجھے کی رسم سے ھوتا ہے اس کے بعد سانچق ۔ پھر مہندی اس کے بعد شب گشت اور باز گشت اور چوتھی کے رسومات ھوتے ھیں۔ ان تمام رسومات کے جلوس نکلا کرتے تھے ۔ سانچق کا جلوس دولھے والوں کی طرف سے دلھن کے یہاں جاتا اور مہندی کا جلوس دلھن کے یہاں سے دولھا کے لیے آتا ۔ آج سے پچاس سال پہلے یہ جلوس دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے ۔ ایک درمیانی درجے والوں کی شادی کا جلوس جس سلسلے سے ھوتا تھا وہ یہ ہے ۔

اولاً نشان کا ھاتھی ھوتا ۔ اس کے سامنے ھوائی بردار ھوائیاں چھوڑتے ھوئے چلتے دو دو تین تین منٹ کے وقفے سے ھوائی چھوڑی جاتی ۔ نشان کے ھاتھی کے پیچھے نظم (نظام کی بے قاعدہ فوج) کے سوار پھر پیدل جمعیت ھوتی ۔ اس کے بعد عروب ھوتے جو اپنا قومی ناچ کرتے ھوئے اور برھنہ تلوار کے کرتب بتاتے ھوئے گزرتے اس کے بعد دو ھاتھیوں پر نوبت والے حودہ (ایک قسم کا چوکھٹ جو ھاتھی کے اوپر باندھا جاتا اور اس میں چار آدمی مع نقاروں کے بیٹھے ھوتے ھیں) میں ھوتے ۔ اس کے بعد دو یا چار ھاتھیوں پر طوایفیں سوار ھوتیں جو رنگ برنگ کی بشواز پہنے ھوتیں جس پر بہت زیادہ مصالحہ لگا ھوتا ۔ طوائفوں کے ھاتھیوں کے بعد سمدیان (دولھے والے) ھاتھیوں پر سوار جلوس کے ساتھ ھوتا ۔ ایسے چار چھ بلکہ آٹھ دس ھاتھی ھوتے اس کے بعد دو مینار نما کاغذ اور ابرک کے لمبے لمبے درخت ھوتے اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے ابرک اور رنگین کاغذ کے خوش نما درخت بھی ساتھ ھوتے ان کے پیچھے دلھن کے لباس کی کشتیاں ۔ بری کی ٹھلیاں جن پر خوش نما رنگ و روغن ھوتا اور چار چار ایک خوش نما چوکھٹے میں ھوتے ۔ یہ چوکھٹے کاغذ اور بانس سے بنائے جاتے اور بڑے خوبصورت نظر آتے ۔ ان کے بعد

گاڑیوں میں ، شکراموں میں ، رتھ میں ۔ دولہا والے مرد اور عورتیں جن کو سمدیانے والے کہا جاتا ساتھ ہوتے تھے ۔ یہ تھا وہ جلوس جو سانچق کے موقع پر نکلا کرتا تھا ۔

دوسرے دن مہندی کا جلوس اسی طور سے دلھن والوں کی جانب سے دولہا کے لیے آتا تھا ۔ جس میں دولہا کے لباس کے ساتھ پھول ، مہندی ، وغیرہ ہوتی ۔ مہندی کی تقریب میں ایک خاص وضع کا بلند مینار نما درخت بنایا جاتا تھا جو دولہا کے پھاٹک پر باندھا جاتا اور عرصے تک باقی رہتا ۔

شب گشت

دولہا کا نکاح کے لیے دلھن کے مکان پر جانے کا جلوس ہوتا ۔ اس میں فوج ، نوبت ، طوایفین سمدھی والے وغیرہ سب ہوتے اور عربوں کے غول کے بعد دولہا کی سواری گھوڑے پر ہوتی ۔ دولہا کے دوست احباب عزیز اقارب پیدل چلتے تھے ۔ کسی مسجد میں صبح کی نماز کا ادا کرنا دولہا کے لیے ضروری تھا ۔ نماز کی ادائی کے بعد دولہا دلھن کے گھر پہنچتا اور بہت جلد نکاح ہو جاتا ۔

سانچق اور مہندی کے جلوس میں جو طوایفین ساتھ ہوتیں ان کا مجرا اور ناچ محفل میں ہوتا یہ محفل بہت جلد برخاست ہو جاتی ۔ پھول ، پان بلکہ پان دان ۔ عطر دان وغیرہ ہر ایک مہمان کو دیے جاتے ۔ مہمانوں کے رنگ برنگ کے ریشم اطلس وغیرہ کی شیروانیاں شادی کی محفل کو گل و گلزار کا سماں پیش کرتی تھیں ۔ اس کے ساتھ طوایفین کا گانا اور ناچ محفل نشاط کو لطف انگیز بناتا تھا ۔ ان محفلوں میں بچوں کا شریک ہونا معیوب نہیں ہوتا کیونکہ تہذیب کی محفل ہوتی بزرگوں کے ساتھ بچے بھی محفل میں گھنٹہ آدھا گھنٹہ بیٹھ کر گانا سنا کرتے تھے ۔

نکاح کی محفل صبح سویرے سہ پہر تک رہا کرتی ۔ رقص و سرور

کے بعد بھانڈ وغیرہ محفل کو دلچسپ بناتے - جلوہ کی رسم کے بعد جب دولھا اور دلھن جہیز کے ساتھ واپس ہوتا تو اس جلوس کو بازگشت کہا جاتا - یہ جلوس دوسرے تمام جلوسوں سے زیادہ شاندار اور زیادہ طویل ہوتا تھا کیونکہ دولھا کے ساتھ دلھن کے پورے جہیز کا سامان مزدوروں کے سروں پر ہوتا - جب تک برق روشنی کے گولے نہیں ایجاد ہوئے تھے تو روشنی مشعلوں کی ہوتی تھی - جب گولے ایجاد ہوگئے تو باز گشت وغیرہ کے جلوس میں اس روشنی کے گولے ہوتے تھے -

ایک عرصے تک جمعیت کے سوار، پیدل، عروب وغیرہ شادی کے جلوس میں لایا کرتے تھے اور جب یہ سلسلہ موقوف ہوگیا تو پائے گاہ پیش کاری کی جمعیت وغیرہ آسانی سے آ جاتی تھی - اس لیے جلوس خاصے طویل ہوتے تھے -

شادی بیاہ کے جلوس کے سلسلے میں چھٹی چھلے کا جلوس بھی شامل ہو جاتا ہے - تو مولدوں اور زچہ کے لیے لباس جھولا - وغیرہ سامان جلوس کے ساتھ روانہ کیا جاتا تھا -

متمول خاندان میں عید کی تقریب میں جو تحفے اور حصے دولھن اور دولھا کے لیے آیا کرتے ان کا بھی ایک جلوس ہوا کرتا جلوس کی اہمیت فوج سے ہوتی تھی - جو باجوں کے ساتھ جلوس کے ہمراہ ہوتی -

آج سے پچاس سال پہلے جن اصحاب نے جلوسوں کو دیکھا ہے وہ بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں کہ شادی بیاہ کے جلوس کس قدر شاندار ہوتے اور شان و شوکت رکھتے تھے اور ان جلوسوں سے کس طرح شادی کے رسموں کی اہمیت دوگنی ہو جاتی تھی -

قدیم حیدر آباد کے بارہ مہینے اور ان کے لوازم

قدیم حیدرآباد کے هلالی بارہ مہینے اور ان کے لوازم اورتقریبات سے اب بہت سے آصحاب واقف ہیں ۔ اگرچہ یہ مہینے مسلمانوں سے متعلق تھے مگر بعض تقاریب اور لوازم نے قومی حیثیت اختیار کرلی تھی ۔

(۱) محرم (۲)صفریاتیزہ تیزی (۳)ربیع الاول ، مولود یا بارہ وفات (۴) ربیع الثانی یا دستگیر یا گیارھویں ۔ (۵) جمادی الاول یا مدار (۶)جمادی الاخر یا حسین شاہ ولی (۷) رجب (۸) شعبان یا شب برأت (۹) رمضان (۱۰) شوال یا خالی (۱۱) ذیقعدہ یا بندہ نواز (۱۲) ذیحجہ یا بقرعید ۔

محرم کا مہینہ غم کا ھوتا ہے ۔ اور اس مہینے کی تقریبات جو نہ صرف سالم مہینے تک بلکہ ۲۰ ۔ صفر تک ھوتی ھیں ۔ اس مہینے میں دیہات ، تعلقہ جات اور اضلاع سے بلا تفریق مذھب و ملت عورت - مرد ۔ جوان ۔ بوڑھے ۔ بچے حیدرآباد آتے تھے ۔ چونکہ سفر کی آسانیاں جو اب موٹر، بس اور ریل وغیرہ کی وجہ سے ھیں وہ نہیں تھیں اس لیے حیدرآباد کو آنے والے دیہاتی جاگیردار ۔ معمول‌دار ۔ انعام‌دار وغیرہ اکثر اس مہینے میں حیدرآباد آتے تھے ۔ محرم کے چاند ھی سے عاشور خانے آباد ھو جاتے اور زیارت کرنے والے بلا تفریق مذھب و ملت روزآنہ صبح سے شام بلکہ رات تک عاشور خانوں میں آتے اور نزر و نیاز چڑھاتے تھے ۔

۴ ۔ محرم کو شمس الامراء کا پائیگاہ کی لنگر ، ۵ ۔ محرم کو شاھی لنگر ، ۷ ۔ محرم کو امام قاسم کے علم کی سواری ، ۹ ۔ محرم کی شام کو تابوت علم نعل صاحب اور دیگر علموں کے جلوس ، ۱۰ ۔ محرم کو بی بی کا علم چادر گھاٹ کے پل کی طرف اور تمام تابوت پرانے پل کی طرف جلوس میں جانے

اور ٹھنڈے کیے جاتے۔ ۱۰۔ محرم کے بعد ۲۰۔ محرم کو تاڑ بن کا میلہ ، ۲۹۔ محرم کو سنکیسر کا میلہ اور ۲۰۔ صفر کو عنبرپیٹھ کا میلہ ہوتا۔ یعنی ان مقامات کے علموں کا جلوس نکلتا علم ان کے عاشور خانوں سے ایک خاص مقام پر لے جا کر ٹھنڈا کرتے۔ ان مقامات پر لوگوں کا جو مجمع ہوتا اس کو میلے سے موسوم کیا جاتا تھا۔ لوگوں کا ھجوم ہوتا تھا بلا تفریق مذھب و ملت مرد، عورت اور بچے شریک ہوتے تھے۔ ھاتھیوں، گاڑیوں، شکرام، رتھ اور جھٹکوں میں سوار اور پیدل آدمیوں کا مجمع ہوتا تھا۔ کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ کھلونے وغیرہ کی خاص فروخت ہوتی تھی۔ محرم کے مہینے میں سبز اور سیاہ کپڑے جو مختلف وضع کے ہوتے پارچہ فروش کے ھال آویزاں کیے جاتے۔ غرض محرم کا ماتمی مہینہ خرید اور فروخت معاشی اعتبار سے بھی مخصوص حیثیت رکھتا تھا۔ شربت۔ کھجوڑی۔ عود۔ عنبر وغیرہ نیاز کے لیے خریدے جاتے ھیں۔ شاید ھی کوئی گھر ہوگا جہاں شہدائے کربلا اور اھل بیت اکرام کی نیاز نہ ہوتی ہو۔ اس ماہ کے متعلق مزید تفصیل آگے آئے گی۔

ماہ صفر کو تیرہ تیزی کا مہینہ کہا جاتا ہے کیونکہ ۳۔ صفر اور ۱۳۔ صفر کو بڑا منحوس تصور کرتے تھے۔ صدقہ دیا جاتا اگرچہ اب بھی ۳، صفر کی صبح صادق سے تیرہ تیزی کی خیرات لینے والے ''تیزہ تیزی'' کی صدا لگاتے ہوئے ھر ھر محلے میں نکلتے ھیں اور صدقہ حاصل کرتے ھیں مگر اب انھیں صدقہ کافی نہیں ملتا ہے۔ صدقے میں نہ صرف پیسے بلکہ تیل۔ انڈے۔ ماش کی دال وغیرہ بھی دی جاتی تھی اور تو اور علماء اصحاب علم کے گھرانوں ھی میں بھی کم از کم پیسے ضرور خیرات کیے جاتے تھے۔

ماہ صفر کا آخری چہار شنبمہ بھی مشہور تھا۔ جنگلوں اور اور باغوں میں لوگ جاتے اور تلن ہوتا صبح یا دوپہر سے سر مغرب تک ان مقامات پر مجمع ہوتا۔ مرد، عورت اور بچے سب ھی جمع

ہوتے اور پکنک مناتے تھے ۔ باغ عامہ میں ہر طرف پردے آویزاں ہوتے ۔ پارٹیوں کا جمگھٹا ہوتا اور سہ پہرکو تماشابین رنگین مزاج صحاب ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوتے ارر رخصتی مجمع کے گزرنے کا نظارہ خصوصیت سے دیکھا جاتا ۔ اکثر طوایف بھی گاڑیوں اور دیگر سواریوں پر نظارہ بازی کے لیے آتی تھیں ۔

ماہ ربیع الاول کو سولود یا بارہ وفات بھی کہتے ھیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی و لادت کے علاوہ وفات بھی اس مہینے میں ہوئی تھی ۔ مگر اس کو زیادہ مبارک تصور کرتے ہیں ۔ مولود کی مجلسیں ہوتیں ، وعظ کی محفلیں ہوتیں اور بارہ ربیع الاول کو نیازیں ہوتیں ۔ مولود نبی کے لحاظ سے اس مہینے میں مبارک اور مسعود ہونے کی بناء پر شادیوں کی کثرت ہوتی ۔ اچھی تاریخ اور اچھے دن خصوصاً جمعہ ۔ پنجشنبہ ۔ اور دوشنبہ کو بعض مرتبہ کئی کئی سو شادیاں ہوتی تھیں ۔ اس طرح ہر قسم کی تجارت کی گرم بازاری ہوتی ۔ شادی بیاہ کے لیے جوکر و فر ہوتا جو جہیز دیا جاتا جو تقریبات اور رسومات ہوتے اور ان میں جو خرید و فروخت ہوتی اس سے بڑی مسرت اور شادمانی ہوتی تھی ۔ مگر معاشی پستی کے باعث اس میں زوال آ گیا ھے ۔

ماہ ربیع الثانی کو ''دستگیر'' کہا جاتا ھے ۔ شمالی ہند میں حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کے معتقد زیادہ ھیں تو جنوب میں سیدنا عبدالقادر جیلانی کے معتقد اور قادریہ طریقت کے نام لیوا زیادہ ھیں ۔ بہر حال پیران پیر حضرت دستگیر کے لقب سے سید نا جیلانی ملقب کیے گئیے ھیں اور گیارہ ربیع الثانی کو آپ کی فاتحہ اور نیاز ہوتی ۔ دعوتیں دی جاتیں ۔ دوستوں رشتہ داروں اور فقیروں کی ضیافت ہوتی ۔ کم از کم گیارہ فقیروں کو کھچڑی تقسیم ہوتی ۔ بڑے بڑے جاگیر داروں کے یہاں سے ان کے متوسلین کو ربیع الاول میں بارہ دن تک اور دستگیر میں گیارہ دن تک بریانی وغیرہ کے

حصے تقسیم ہوتے تھے۔

ماہ ربیع‌الاول (مولود) کی طرح ربیع‌الاخر (دستگیر) کے مہینے میں بھی شادیاں ہوتیں اور رسومات انجام پاتے۔ جمادی‌الاول کو مدار کا مہینہ کہا جاتا ہے۔ حضرت زندہ شاہ مدار کی نیاز ہوتی۔

ماہ مدار کے بعد جمادی‌الثانی کو ''آخر'' کہا جاتا تھا یہ لفظ ''جمادی‌الاخر'' سے مشتق ہے۔ صرف آخر باقی رہ گیا۔ ان دو مہینوں میں شادیاں بہت کم ہوتی تھیں۔ اس مہینے کو حسین شاہ ولی بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ حضرت حسین شاہ ولی جو خواجہ بندہ نواز کی اولاد سے تھے اور حیدر آباد میں ٹولی چوکی کی طرف جن کا مزار ہے ان کا عرس اس مہینے میں ہوتا ہے۔ اس لیے یہ نام دیا تھا۔

''رجب'' کے مہینے میں ۶ رجب خواجہ اجمیری کی فاتحہ اور قوالی ہوتی ۱۲۔ رجب کو عرس کوہ مولا ہوتا اور اس کے بعد لنگم پلی کا میلہ ہوتا جو تین دن تک رہتا۔ مقام عرس کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔ ہزاروں زیارت کرنے والے مولا کے پہاڑ کو جاتے اور حضرت علی مرتضیٰ رضی‌اللہ‌عنہ کی نیاز اور فاتحہ کرتے۔ یہ پہاڑ قطب شاہی دور سے زیارت گاہ بنا ہوا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ قطب شاہی خواجہ سرا نے خواب میں حضرت علی کو اس جگہ قیام کرتے دیکھا تھا اور صبح قدم کا نشان پایا گیا۔ اس لیے ۱۳۔ رجب کو نہایت اعتقاد سے یہاں زیارت ہونے لگی اور عرس کے دوسرے تیسرے دن لنگم پلی کا میلہ ہونے لگا۔ میلے میں دیسی صنعت کو بڑا فروغ ہوتا تھا۔ گویا یہ میلہ نمائش مصنوعات ملکی کا تھا۔

ماہ رجب کی ۲۷۔ کو شب معراج کی خوشی منائی جاتی تھی۔ شب معراج حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کے باعث خاص مبارک و مسعود دن قرار دیا گیا ہے۔ ماہ رجب میں شادیوں کی کثرت ہوتی ہے۔

شعبان کو شب برات ھی کہتے تھے۔ اس ماہ میں عام طور سے اپنے مرحوم بزرگوں اور رشتہ داروں کی فاتحہ ہوتی۔ ایک زمانۂ دراز تک اس رات آتش بازی ہوتی تھی ۔ قطب شاھی دور میں اس عید کو بڑی اھمیت حاصل تھی - سلطان نے کئی نظمیں اس عید کے متعلق لکھیں ھیں ۔ قطب شاہ کو روشنی ، پانی اور چمن سے بڑی دلچسپی تھی ۔ شب برات میں خوب روشنی کی جاتی اور آتش بازی ہوتی تھی اور فاتحہ دلائی جاتی تھی شادیوں کا سلسلہ شعبان میں بند ھو جاتا تھا ۔

رمضان کا مہینہ بڑا مبارک خیال کیا جاتا ۔ اگرچہ عام طور سے شادیاں روزوں کی وجہ سے نہیں ھوتی تھیں مگر ماہ رمضان کے آغاز سے ھی عید کی تیاریاں شروع ھو جاتیں ۔

شوال کی پہلی تاریخ کو عیدالفطر ھوتی جس کو عام طور سے عید رمضان کہا جاتا ۔ شوال کو خالی کا مہینہ بھی کہتے تھے ۔

ماہ ذیقعدہ کو بندہ نواز کا مہینہ کہا جاتا کیونکہ دکن کے مشہور بزرگ حضرت خواجہ محمد حسین گیسو دراز (بندہ نواز) کا عرس اس ماہ میں ھوتا ھے ۔ اس ماہ کو اس مناسبت سے بندہ نواز کہتے تھے ۔ اس مہینے کو بھی مبارک خیال کیا جاتا ھے ۔

بندہ نواز کے بعد ذالحجہ کو ''بکر عید'' کہتے کیونکہ بکروں کی قربانی ھوتی تھی ۔

ھم اب ماہ محرم اور ربیع الاول کے متعلق کسی قدر تفصیل سے صراحت کرتے ھیں ۔

ماہ محرم

سلاطین گولکنڈہ ، اور بیجاپور بلکہ احمدنگر میں بھی محرم میں ماتم ھوتا تھا ۔ دکن کے مختلف حصوں میں چھ سو سال تک مسلمانوں

نے حکومت کی اس لیے چھ سوسال کے محرم کا تذکرہ کرنا ہوگا ۔ اس طویل عرصے کو ہم پانچ ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں یہ دور قطب شاہی ، عادل شاہی حکومت کا زمانہ ہے ۔ دوسرا دور مغلیہ دور اور سلطنت آصفیہ کا قیام کا زمانہ ۔ تیسرا دور آصفی عہد کا دور جو دوسرے آصف جاہ سے چھٹے آصف جاہ (میر محبوب علی خان) تک قرار پاتا ہے ۔ چوتھا دور چھٹے آصف جاہ یعنی میر محبوب علی خان کا زمانہ جو سن ۱۳۰۰ ہجری سے سن ۱۳۳۰ ہجری تک اور پانچواں دور آصف جاہ سابع نواب میر عثمان علی خان کا زمانۂ حکومت ہے ۔

پہلا دور

قطب شاہی اور عادل شاہی بادشاہ شعیہ مذہب کے پیرو تھے ۔ اہل بیت رسالت سے دلی محبت رکھتے تھے ۔ ماہ محرم کو نہایت تقدس کی نظر سے دیکھا کرتے تھے ۔ مجالس عزا منعقد کرتے اور مرثیہ خوانی کو مذہبی فرض تصور کرکے نہایت اعتقاد سے انجام دیتے تھے ۔ تاریخوں سے جو واقعات معلوم ہوتے ہیں وہ یہ ہیں :

ماہ محرم کا چاند نظر آتے ہی شاہی نقار خانوں اور دوسرے جاگیرداروں کے ڈیوڑھیوں کی نوبت نوازی بند ہو جاتی ۔ گانا بجانا عیش و عشرت یک لخت موقوف کر دیے جاتے ۔ تمام شہر میں نشہ آور اشیاء ۔ شراب ، سیندھی ، پھنگل وغیرہ کی خرید و فروخت بند کر دی جاتی ۔ شاہی باورچی خانے میں گوشت کا استعمال موقوف کر دیا جاتا حتیٰ کہ عام طور سے بھی رعایا گوشت ترک کر دیتی۔ قصاب دکان بند کر دیتے تھے ۔ پان کھانا حقہ پینا موقوف ہو جاتا تھا ۔ شہر کے تمام لوگ سیاہ پوش ہو جاتے ۔ شاہی جام دار خانے سے تمام مقربین شاہی اور ملازمین شاہی کو کالے رنگ کے کپڑے تقسیم ہوتے تھے ۔ جاگیرداروں اور امراء کو ماتمی خلعت مرجمت

ہوتا تھا ۔

محرم کے چاند کے نظر آتے ہی مراسم عزا داری شروع ہوجاتے اور ماتم حضرت امام حسین علیہ السلام کی مجالس کا آغاز ہوتا ۔ شاہی عاشور خانوں میں جو بیجاپور اور حیدرآباد میں ایک سے زیادہ تھے ، ان کی بڑے اہتمام سے آراستگی ہوتی ۔ بیش قیمت قالین کا فرش ہوتا ۔ بہت زیادہ روشنی کے دس قطار ہوتے تھے ۔ پہلی محرم کو ایک قطار کی روشنی ہوتی ۔ دوسری کو دو قطار کی روشنی ہوتی ۔ تیسری کو تین قطار کی ۔ اسی طرح دسویں محرم کو پوری دس قطاریں روشن ہوتیں ۔ بڑے بڑے چراغ دان تھے ۔ جس میں سو سو بتی کے چراغ روشن ہوتے ۔ والا نول میں قد آدم بڑی بڑی شمعیں جلائی جاتی تھیں ۔ حوضوں کے اطراف بھی روشنی ہوتی ۔ اس طرح عاشور خانے روشنی سے منور ہوجاتے ۔ نذرانہ دیتے اور مراد کے لیے منتیں مانگتے بلا تفریق مذہب جمع ہوتے ۔ تلنگی زبان میں محرم کو 'پیرا پنڈو'' ۔ پیروں کی عید کہا جاتا تھا ۔ اور امام حسن امام حسین کو ''آشنا اوشنا'' کہا جاتا تھا ۔ اس طرح تمام اہل تلنگانہ محرم کی تقاریب میں شریک ہوتے ۔ گویا ایک قوسی تقریب ہوتی ۔

قطب شاہی دور میں حیدرآباد میں دو عاشور خانوں کے علاوہ حباب آباد ، کلثوم پورہ ، خریت آباد ۔ لنگر فیض اثر کے علم اور مجالس مشہور تھے ۔ بی بی کا علم اور حسینی علم بھی قطب شاہی دور کی یادگار ہیں ۔ اس زمانے میں بادشاہ کے مختلف کارخانے مثلاً فیل خانہ ، رتھ خانہ ، اصطبل شاہی ، فراش خانہ وغیرہ کے ملازم محرم میں قسم قسم کے تازئیے اور تابوت بناتے جو دس محرم کو ٹھنڈے کیے جاتے تھے عاشورہ خانوں میں صبح اور شام مجالس عزا منعقد ہوتیں دونوں عاشور خانوں میں چودہ معصومین علیہم السلام کے نام سے سونے اور چاندی کے خوبصورت علم استادہ کیے جاتے ۔ خوش آواز دوز دل سو انداز میں واقعات شہادت بیان کرتے اور

سوز خوان پر الم آواز میں مرثیہ اور نوحے سناتے تھے ۔ روزانہ عصر کے وقت خود بادشاہ وقت (محمد قلی قطب شاہ عبداللہ) سیاہ ماتمی لباس میں گھوڑے پر سوار ہو کر یاسنگھاسن میں بیٹھ کر محل سے برآمد ہوتے ۔ تمام امراء اور وزراء ۔ معززین شاہی ہمراہ رکاب ہوتے ۔ آہستہ آہستہ عاشور خانے میں سواری پہنچتی ۔ یہاں پہنچتی کر اپنے ہاتھ سے علموں پر پھول باندھتے ۔ مغرب تک یہاں قیام ہوتا ۔ واقعات شہادت اور مرثیے سنتے ۔ سر مغرب خاص طاقچوں کے چراغ خود بادشاہ روشن کرتا اور اس کے بعد پھر شاہی ذاکر ارر مرثیہ خوان واقعات شہادت بیان کرتے اور مرثیے سنائے جاتے ۔ پھر فاتحہ پڑھی جاتی اور شاہی سواری واپس ہوتی مگر امراء اور دوسرے اصحاب واعظ ۔ ذاکر اور مرثیہ خواں عاشور خانے میں ھی شاہی پرتکلف ضیافت کھاتے ۔ جس میں بغیر گوشت کی غذا ہوتی تھی ۔ مصری اور گلاب کا شربت پلایا جاتا کھانے کے بعد پھر عزا داری شروع ہوجاتی جس کا سلسلہ آدھی رات تک جاری رہتا تھا ۔ چھٹی محرم کی رات سے روزانہ عاشور خانہ کے علم اور تازئیے دار محل (جو ایک شاہی محل تھا اور موجودہ ھائی کورٹ کے پاس تھا ۔) کے وسیع میدان میں لائے جاتے ۔ روشنی ہوتی اور مرثیہ خوان نوحے پڑھتے ہوئے ساتھ ساتھ ہوتے اور محل کے نیچے جمع ہو کر ماتم کرتے ۔ بادشاہ کی جانب سے سکھ مکھ تقسیم ہوتا ۔

ساتویں محرم کی صبح کو بادشاہ ندی محل (جو میر عالم کی بارہ دری کا امام باڑہ تھا) تشریف لاتے اور حیدرآباد کے تمام علم ایک خاص راستے سے جو دروازہ بارہ امام سے موسوم تھا محل کے اندر لائے جاتے ۔ ان کے ساتھ انبوہ کثیر ہوتا جس میں بلا تفریق مذھب سب لوگ ہوتے تھے ۔ ماتم ہوتا اور بادشاہ کی طرف سے اشرفیوں کی تھیلیاں علموں کے مجاوروں کو دی جاتیں ۔ بادشاہ خود بھی تقریباً پانچ سو قدم علموں کے ساتھ جاتے تھے ۔

دس محرم کی صبح کو سب لوگ (بلا تفریق مذہب) سیاہ پوش برھنہ یا دولت خانہ (شاھی محل) کے عاشور خانے میں جمع ھوتے۔ بادشاہ بھی سیاہ لباس اور برھنہ پا ھوکر عاشورخانہ کی متصل مسجد میں قیام کرتا ۔ یہاں مجلس عزا ھوتی ۔ مصائب اھل بیت بیان کیے جاتے ۔ فاتحہ خوانی کے بعد مجلس برخاست ھوتی اور بادشاہ مسجد سے نکل کر دولت خانۂ عالی میں داخل ھوتے اور تمام حاضرین کر کھانا کھلایا جاتا تھا ۔ سادات کے دو سو یتیم لڑکے بادشاہ کے حضور میں پیش کیے جاتے ان کو لباس اور روپیوں کی تھیلیاں دی جاتیں ۔

قطب شاھی دور میں مجلس عزا اور علموں کی استادگی صرف شہر حیدرآباد تک محدود نہیں تھی بلکہ قلم رو قطب شاھی کے تمام شہروں ، قصبات اور دیہات میں بھی علم استادہ ھوتے اور مجالس عزا منعقدد ھوتی تھیں ۔ تمام مصارف حکومت کی جانب سے ادا ھوتے تھے اور علموں کی زیارت مجالس عزا کی شرکت صرف شعیہ اصحاب یا تمام مسلمان نہیں کرتے بلکہ ھندو بھی پوری سرگرمی اور اعتقاد سے شریک ھوتے تھے ۔

ھندو مرد ، عورتیں اور بچے کیا امیر کیا غریب ایام عاشورہ خصوصاً دس محرم کو غسل کرکے پاک کپڑے پہن کر علموں کی زیارت کرتے مکانات کی صفائی کرتے اور نہایت خلوص اور اعتقاد سے نیاز کرتے ۔

اس زمانے کے بیسیوں مرثیے بیاضوں میں لکھے ھوئے کتب خانۂ سالار جنگ میں محفوظ ھیں ۔ بیجاپور میں علی عادل شاہ ثانی خاص اھتمام سے عاشورہ مناتا اور یہاں بھی دس روز تک وہ سب کچھ ھوتا جو حیدرآباد میں ھوتا تھا ۔ اس کی تفصیل علی عادل شاہ ثانی نے ایک قصیدے میں کی ھے ، جو ان کے کلیات میں شامل ھے ۔ اس کی وضاحت طوالت کا موجب ھوگی ۔

دوسرا دور

حیدرآباد کے محرم کا دور قطب شاهی سلطنت کے خاتمہ سن ۱۰۹۸ هجری سے شروع هوتا ہے اور سن ۱۱۷۵ هجری پر ختم هوتا ہے ۔ اس پچهتر سال کے عرصے میں قطب شاهی محرم کی جو باتیں گذریں وہ اگرچہ پوری طور پر ختم نہیں هوئیں ۔ یعنی علموں کی استادگی اور ان کی زیارت موقوف نہیں هوئی مگر بادشاہ کی شرکت شاهی ذاکر اور مرثیہ خوان وغیرہ بند هوگئے ، صرف عوام علم استادہ کرتے اور خانگی طور پر مجالس عزا بھی هوتی رهتیں ۔ حکومت کی جانب سے جو امداد علموں کے مجاوروں کو ملتی تھی وہ بند هوگئی ۔ مغلیہ دور کے صوبے دار ذاتی طور پر کوئی حصہ نہیں لیتے تھے ۔ اس لیے شہر حیدرآباد کے عوام جو عام طور سے سیاہ پوش هو جاتے تھے وہ طریقہ بھی باقی نہیں رها ۔ گوشت کے فروختگی کی مخالفت نہیں رهی ۔ محرم میں پان کھانے کا رواج هو گیا ۔ محرم کی کوئی خاص تخصیص نہیں رهی تھی ۔ اس دور کی پوری تفصیل نہیں ملتی اس لیے مختصر طور پر صراحت کی گئی ہے جہاں تک معلومات هیں اس زمانے میں محرم کوئی خصوصیت نہیں رکھتا تھا ۔

تیسرا دور

حیدآباد کے محرم کا تیسرا دور سن ۱۱۷۵ هجری سے شروع هوتا ہے جب کہ حیدرآباد کو میر نظام علی خان آصف جاہ ثانی نے اپنا دارلحکومت بنا لیا ۔ اور قطب شاهی دور کی کئی باتیں پھر زندہ کر دی گئیں ۔ چنانچہ لنگر کی رسم جاری کی گئی ۔ جس کا تذکرہ تفصیل سے آگے درج هوگا ۔

شاهی عاشور خانوں کے انتظام کو درست کیا گیا ایک قابل اور صاحب علم شخص یعنی میر نوازش شیدا کو اس کا مہتمم بنایا

گیا ۔ علموں کے مجاورں کے نام پھر سے انعام اور معمول جاری کیے گئے ۔ مجالس عزا منعقد ہونے لگے ۔ مگر بادشاہ کی شرکت روز نہیں ہوتی تھی کبھی کبھی شرکت کرتے تھے ۔ حیدرآباد کی ایک مشہور تاریخ ''گلزار آصفیہ'' میں حیدرآباد کے محرم کا تذکرہ ایک خاص باب میں کیا گیا ہے ۔ یہ تاریخ اگرچہ سن ۱۲۵۸ ھجری میں مرتب ہوئی ہے ۔ مگر اس میں جو حالات لکھے گئے ہیں وہ سن ۱۲۰۰ ھجری کے اوائل سے لے کر سن ۵۸ تک تعلق رکھتے ہیں ۔ تاریخ مذکور کا اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے ۔

''آسمان پر محرم کا چاند نظر آتے ہی تمام شہر میں علم استادہ ہوجاتے ۔ حسینی علم ۔ علم نعل صاحب ۔ علم بی بی بھی استادہ ہوتے ۔ سلامتی حضور کا سہرا علموں پر روانہ کیا جاتا اور حضور پر نور غسل کرکے معطر معمبر لباس میں جلوس کے ساتھ سہرے کی کشتی اپنے سر پر لے کر پیدل ھجوم خلایق کے ساتھ حسینی علم جاتے اور شربت کھچڑی نیاز کی تقسیم ہوتی اور اس کے بعد حضور کی سواری واپس ہوتی ۔ مرثیہ خانوں کی جماعتیں حسینی علم میں آکر پانچ پانچ بند مرثیوں کے سناتے امراء اور جاگیرداروں کی روزانہ نوبت بند ہوتی البتہ عاشور خانوں کی نوبت ۔ ماتمی نوبت بجاتے تھے ۔ اور اکثر امیروں کے مکانوں میں علم استادہ ہوتے ۔ تمام عاشور خانوں میں عود اور بھور جلتا خوشبو پھیلتی ۔ بلا تفریق مذہب اکثر اصحاب جلوس اور عقیدت سے شربت کی ٹھلیاں اپنے سروں پر لے کر عاشور خانے جاتے ۔ نیاز ادا کرتے علموں پر پھول چڑھاتے ۔ عاشور خانے روشنی سے منور کیے جاتے اور مکانوں کے صحن میں ٹٹیاں لگا کر روشنی کی جاتی ۔ پہلی محرم سے دسویں تک لوگوں کا ایک خاص مشغلہ علموں کی زیارت کا ہوتا تھا ۔ اکثر اشخاص سیاہ یا سبز لباس میں ملبوس ہوتے ۔

بچوں کو بھی سبز لباس پہنایا جاتا ۔ عاشور خانوں میں واقعات
شہادت امام حسین پڑھے جاتے ۔ مرثیے سنائے جاتے ۔ ایسے
لوگ بھی تھے ۔ جو بے نمک اور بے گھی کی غذا کھاتے تھے
اور روزے بھی رکھا کرتے ۔ فقیر بنتے اور برهنه پاؤں رہتے ۔

غره محرم هی سے پست اقوام مختلف سوانگ مثلاً شیر ۔ مجنوں
بندر وغیرہ بنتے جو شیر بنتے وہ اپنے جسم پر شیر کی طرح
رنگ کر ایک دم لگا کر باجوں کے ساتھ بازاروں میں گھوما
کرتے ۔ دوکان داروں اور صاحب ثروت اصحاب سے رقم وصول
کرتے اس طرح دوسرے سونگ ہوتے تھے ۔

۴ محرم کو شمس الامراء کا لنگر نکلتا ۔ اور ۵ محرم کو
حضور پر نور کی سلامتی کا لنگر نکلتا ۔ یہاں لنگر کی صراحت
تفصیل سے کی جاتی هے ۔ واضح هوکه جس طرح جہازوں کے لیے
ساحل پر ٹھہرنے کے لیے لنگر کا استعمال ہوتا هے اسی طرح
هاتھیوں کو باندھنے کے لیے جو لوهے کی زنجیر استعمال کی
جاتی هے اس کو ''لنگر'' کہا کرتے تھے ۔ قطب شاهی دور
میں شاهی هاتھی اس مقام پر رها کرتے تھے جس کو آج
''لنگر حوض'' سے موسوم کرتے هیں ۔

حیدرآباد میں آج سے پنتالیس سال پہلے تک ۵ محرم کو لنگر
کا جلوس نکلا کرتا تھا ۔ آج نه کوئی اس جلوس سے واقف
هے اور نه اس کی ابتداء اور اختتام سے ۔ اس لیے یہاں اس کی
مختصر وضاحت کی جاتی هے ۔

آج سے تین سو ستر سال پیشتر ۲۷ ۔ ذیحجه کو سلطان
عبدالله قطب شاہ اپنے شاهی هاتھی ''مورت'' پر سوار هو کر
حیدرآباد سےگولکنڈہ جا رها تھا ۔ موسیٰ ندی چڑھی ہوئی تھی
اور پانی ایک مہیب شور کے ساتھ بہہ رها تھا ۔ هاتھی جوش و
تلاطم کو دیکھ کر مست هوگیا ۔ مہاوت کو هلاک کر کے

جنگل کی طرف نکل گیا سلطان نے بہت کوشش کی کہ ھاتھی
سے اتر جائے مگر کامیابی نہیں ھوئی ناچار اس پر سوار رھا اور
جدھر ھاتھی چاھتا جاتا رھا ۔ جب یہ اطلاع سلطان کی والدہ
حیات بخش بیگم کو ھوئی تو اس نے حکم دیا کہ جنگل کے
درختوں پر کھانا اور پانی باندھ دیا جائے تاکہ ھاتھی جس
درخت کے نیچے ٹھہرے سلطان کو غذا میسر آسکے ۔ آخر
ذیحجہ تک یہی حالت رھی ۔ محرم کا چاند دیکھ کر حیات بخش
بیگم نے منت مانگی کہ اگر سلطان صحیح و سلامت واپس
آجائے تو چالیس من سونے کی زنجیر بنا کر حسینی علم پر لے
جائے گی ۔ اور وہ وھاں خیرات کر دی جائے گی ۔ اس منت
کے بعد ھاتھی کی مستی ختم ھوگئی اور وہ سلطان کو لے کر
گولکنڈہ آ گئی ۔ حیات بخش بیگم نے منت کے مطابق سونے کی
زنجیر بنائی اور سلطان کو باندھ کر حسینی علم روانہ کیا اور
یہاں اس کو توڑ کر خیرات کر دیا گیا اس کے بعد ھر سال
یہ تقسیم ھوتی رھی ۔ حتیٰ کہ قطب شاھی سلطنت کا خاتمہ
ھوگیا ۔

جب سلطنت آصفیہ قایم ھوگئی اور اس کے بعد سن ۱۱۷۵
ھجری میں حیدر آباد دارالسطنت بن گیا تو بہت ساری
قطب شاھی رسومات جاری ھوگئیں ۔ چنانچہ عاشور خانوں کو
امداد جاری ھوئی ، محرم میں سوگ منایا جانے لگا، حیسنی علم
کو نذر و نیاز جانے لگی اور لنگر کی رسم قایم ھوگئی ۔ افسوس
ھے کہ سلطنت آصفیہ میں تجدید لنگر کا صحیح سن بتانے سے
اس وقت قاصر ھوں مگر یہ صحیح ھے کہ نواب نظام علی
خان آصف جاہ ثانی کے عہد میں اس کا آغاز ھوگیا تھا اور
فوجی جلوس کے ساتھ حسینی علم کو صرف خاص کی جانب سے
نذر بہ صورت نقد رقم ارسال کی جاتی تھی ۔ اور یہ رسم

۵ محرم کو انجام پاتی تھی - ہم نے اپنے بچپن میں کئی مرتبہ اس کا جلوس دیکھا ہے اس کے دیکھنے کے لیے نہ صرف قلم رو آصفی کے اضلاع ، تعلقات اور دیہات سے لوگ آتے تھے بلکہ ہندوستان کے مختلف شہروں سے سیاح آتے اور لنگر کا جلوس دیکھا کرتے تھے - حتیٰ کہ وائسرائے ہند لارڈ کرزن نے بھی اپنے پروگرام میں لنگر کے جلوس کو دیکھنا شامل رکھا تھا اور جلوس کا معائنہ کیا تھا -

جلوس کی گذرگاہ کے مکانات کو لوگ کرایے پر حاصل کرتے تھے - دو طرفہ راستوں ، مکانوں اور مکان کے چھتوں پر دیکھنے والوں کا ہجوم رہتا تھا - لنگر کا جلوس مدارالمہام وقت (چیف منسٹر) کی قیام گاہ سے گذرتا ہوا اعلیٰ حضرت حضور نظام کے شاہی محل ''پنچ محلہ'' پر سے ہوتا ہوا حسینی علم جاتا تھا - مدارالمہام اپنی ڈیوڑھی کے خاص مقام پر برآمد ہوکر جلوس کی سلامی لیتے تھے - اور بعض مرتبہ حضور نظام بھی برآمد ہوکر سلامی لیا کرتے تھے - جلوس کا سلسلہ اس طرح ہوتا تھا کہ اولاً نشان (علم) ہاتھی پر ہوتا تھا اس کے پیچھے پولیس بلدہ کے سوار جمعیت پولیس - پھر سٹی پولیس اپنے خوش آواز باجے کے ساتھ (سٹی پولیس سرحد کے پٹھان - باشندوں پر مشتمل تھی - اور ان کا ایک خاص قسم کا خوش آواز باجا ہوتا تھا) گذرتے اور اس کے بعد پولیس کے عروب ہوتے اور آخر پر کوتوال شہر ہاتھی پر ''ٹاپ'' کی سواری میں گزرتے - ان کے ہاتھی کے سامنے تین جلاد سرخ لباس میں ہوتے تھے - پولیس کے جلوس کے بعد دوسرا نشان ہوتا اور اس کے ساتھ نظم جمعیت کی فوج یعنی بے قاعدہ فوج جو کئی ہزار افراد پر مشتمل تھی جس میں پیدل سوار اور توپ خانہ شامل تھا اپنے اپنے افسران جو ''جمعدار'' کے لقب سے موسوم

تھے اور اپنے اعزاز کے مطابق ہاتھی کی "عماری" یا ہوچہ یا میانہ میں اپنے علاقے کی فوج کے ساتھ گزرتے تھے اس بے قاعدہ فوج میں عرب پٹھان ، راجپوت ، سندھی ، سکھ بھی شامل تھے بے قاعدہ فوج کا سلسلہ بڑا طویل ہوتا تھا جو کئی نشان کے پیچھے ہوتا ۔

اس فوج میں ہر قسم کی بے قاعدگی ہوتی یعنی کسی جمعدار کے تحت کے سپاہی فوجی لباس میں ہوتے تو کوئی سادہ لباس میں ، کسی کے پاس بندوق ہوتی کسی کے پاس تلوار، کچھ سواروں کے گھوڑوں پر زین ہوتی ، بعض گھوڑوں پر خوگیر ۔ (کپڑے کی زین) عرب اپنے لنگی اور قمیص صدریہ میں ملبوس ہوتے گو یہ بے قاعدگی ہوتی مگر ہمہ گیری کا دلچسپ مظاہرہ نظر آتا تھا ۔ بے قاعدہ فوج میں پندرہ سولہ عماری نشیں جمعدار تھے ۔ بعض جمعدار اپنے علاقے کے خوبصورت گھوڑوں کو جو چاندی کے زیور سے آراستہ ہوتے نمایش کے طور پر ساتھ رکھتے تھے ۔ ایک جمعدار کے علاقے کی چاندی کی گھوڑی بھی ساتھ ہوتی تھی ۔ جلوس میں چالیس پچاس ہاتھی ہوتے جن کی سونڈ وغیرہ کو رنگا جاتا تھا ۔ بے قاعدہ فوج میں باجا بھی ہوتا ۔ دس بارہ ہزار بے قاعدہ فوج کا جلدھی ختم ہونے پر سرکار آصفیہ کی باقاعدہ فوج کا سلسلہ ایک میدان کے ساتھ شروع ہوتا ۔ باقاعدہ فوج کے آغاز کے ساتھ ھی انتظام قائم رکھنے والے سپاھی ہاتھیوں پر چھری لے کر استادہ ھو جاتے تاکہ تماشبین فوج کے گزرنے میں خلل انداز نہ ہوں ۔ باقاعدہ فوج میں اولاً توپ خانہ پھر رسالے ۔ یکے بعد دیگرے اس کے بعد پیدل پلٹن گزرتی تھی ۔ رسالوں اور انفنٹروں کے ڈریس موسم گرما میں سفید اور دوسرا موسم ہو تو خوش نما رنگین بانات فل ڈریس ہوتا ۔

ان کے انگریزی سریلے باجے مست کن ہوتے۔ رسالوں اور پیدل کے بعد سدی رسالہ اپنے جاذب نظر خوش نما ڈریس میں ہوتا پھر کولکنڈہ لانسرز اور انفنٹری اور کولکنڈہ کا بیلوں کا توپ خانہ یکے بعد دیگرے گزرتے اس کے بعد میسرم کی عرب انفنٹری جو جمعیت نظام محبوب کہلاتی اپنے سریلے باجے خوش نما فل ڈریس میں یعنی سر پر کثی رنگین سادہ گہرا سبز کوٹ اور سرخ پتلون۔ سفید کیاٹر سیاہ بوٹ میں ملبوس بڑے جاذب نظر لگتے تھے۔ با قاعدہ فوج کے آغاز ہی میں کمانڈر انچیف جو ایک زمانہ دراز تک سر افسرالملک تھے اپنے اسٹاف کے ساتھ گزرتے تھے۔

باقاعدہ فوج کے خاتمے پر پائیگاہی فوج، آسمانجاہی خورشید جاہی اور جو وقارالامراء کے علاقوں میں منقسم تھی گزرتی۔ پائیگاہی فوج کے ختم ہونے پر صرف خاص کی فوج اور اس پر لنگر کا خاتمہ ہوتا۔ فوج کے پیچھے کشتیوں میں حسینی علم کے لیے نذر اور نیاز کی چیزیں ہوتیں۔ لنگر کا آغاز اولاً گیارہ بارہ بجے شروع ہوتا تھا، مگر اس کے بعد ایک بجے سے آغاز ہونے لگا پہلے رات کے ساتھ آٹھ بجے تک سلسلہ رہا کرتا تھا مگر اس کے بعد چھ سات بجے تک ختم ہو جاتا تھا۔ میرے بچپن میں مہاراجا کشن پرشاد یمین السلطنت مدارالمہام تھے اور لنگر کا جلوس فتح دروازہ اور محمد شکور کی مسجد کی جانب سے شروع ہو کر مہاراجا کی ڈیوڑھی کے اندر سے ہوتے ہوئے پنج محلہ سے گزرتا ہوا چار مینار آتا تھا۔ لارڈ کرزن نے بھی مہاراجا کی ڈیوڑھی سے لنگر کا جلوس معاینہ کیا تھا اور بے قاعدہ فوج کی تخفیف کا سلسلہ اس کے بعد ہی شروع ہوا۔

جب نواب سالار جنگ کو دیوانی ملی تو لنگر کا جلوس

پرانی حویلی کی طرف سے شروع ہو کر نواب صاحب کی ڈیوڑھی کے اندر سے گزرتا ہوا پتھر گٹی ۔ گلزار حویلی ۔ چار مینار سے پنچ محلہ کی طرف جاتا تھا ۔ نواب سالار جنگ کی مدارالمہامی ختم ہونے کے بعد لنگر کا جلوس سوقوف کر دیا گیا اور یہ تاریخی جلوس بند ہو گیا ۔

جب عہدہ مدارالمہامی کے بجائے صدر آعظمی کا عہدہ قائم ہوا اور اس پر دوبارہ مہاراجا سر کشن پرشاد صدر آعظم بنے تو آپ نے عرضداشت پیش کی کہ دوبارہ لنگر کا جلوس آغاز کیا جائے مگر حضور نظام نے محرم کے مہینے کو سوگوار مہینے کے لحاظ سے اس کو منظور نہیں کیا ۔ مہاراجا نے دوبارہ تحریک کی کہ فوجی جلوس کا قائم رکھنا ضروری ہے ۔ اگر محرم کے بجائے اس کو سالگرہ کے موقع پر جاری کیا جائے تو مفید ہوگا ۔ مگر اس کو بھی منظور نہیں کیا گیا ۔ سالگرہ کے موقع پر فوجی پریڈ ہوتی تھی ۔ اس کو کافی قرار دیا گیا ۔ افسوس ہے کہ اس کے اچھے نتائج پر غور نہیں کیا گیا ۔

ساتویں محرم کو فقیروں کی جماعتیں نکلتیں اس کا طریقہ یہ تھا کہ کئی محلوں میں جو فقیر ہوتے وہ اپنی اپنی جماعت میں خاص لباس میں ہوتے ۔ محلہ مغل پورہ میں ایک پہلوان دینا نامی تھا اس کے شاگرد آدھی رات کو جلوس کے ساتھ نکلتے ۔ نشان کا ہاتھی ہوتا اور اس کے پیچھے ہر فقیر کے سر پر آفتابیاں ہوتیں ۔ ہر محلہ کے لباس اور آفتابی میں فرق ہوتا تھا ۔ کوئی دوسرا شخص نقل اتارنے کا مجاز نہ تھا ۔ ایک خاص مقام پر ٹکڑیوں کی شکل میں جمع ہوتے اور وہاں سے راجا چندو لال کے ڈیوڑھی کو جا کر اپنا معمول وصول کرتے ۔ یہاں سے صف بہ صف منقبت پڑھتے اور عنبر پاشی کرتے ہوئے پنچ محلہ پہنچتے اور حضور سے معمول لے کر

گشت کرتے ہوئے دوسرے دن صبح چار مینار پہنچ کر منتشر ہوتے ۔ اگر کبھی منقبت خوانی میں "جوابم جوابی" چلتی تو عجیب ہنگامہ ہو جاتا یعنی جہاں کہیں ایسی صورت پیش آتی ان فقیروں کی جماعتیں گھنٹوں وہیں کھڑے ہو کر منقبتی مناظرہ کرتے جن لوگوں کے پاس کرسیاں ہوتیں وہ وہیں بیٹھ کر اس مناظرہ کو سنتے ۔ جب تک ہار جیت نہ ہوتی آگے نہیں بڑھتے ۔ ایسے موقعہ پر ان کا سر کردہ شخص آ کر تصفیہ کرتا تھا ۔ اس قسم کے مناظروں کی جماعتوں میں میردلاور علی اور برہان صاحب کے منقبت خوان مشہور تھے ۔۔۔۔۔

آٹھویں محرم کو ایک جلوس نکلتا اس جلوس میں خوش رو لڑکے جو چودہ پندرہ سال کے ہوتے سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں سبز رنگ کے زرین مسالہ کے دوپٹے اوڑھ کر زیورات سے آراستہ ہوکر خوش الحانی سے منقبت پڑھتے ہوئے نکلتے۔ آتش بازی بھی ہوتی اور ان کے ساتھ خوب روشنی ہوتی ۔ پچھلی رات کو یہ جلوس شاہی محل پہنچ کر ڈیڑھ ہزار روپیہ کا معمول حاصل کرتا ۔ نویں محرم کی رات کو تمام رات شہر میں دھوم دھام ہوتی ۔ بیسیوں امراء کے مکانوں میں جہاں علم استادہ ہوتے لوگوں کا ہجوم ہوتا ایسے چند امراء کی ڈیوڑھیوں کا یہاں تذکرہ کیا جاتا ہے ۔

مہاراجا چندو لال کے محل کی آرایش و پیرایش ، روشنی، ولایتی قندیل کے درخت شیشہ آلات ، تختہ بندی ، اور مصوری وغیرہ نمایش دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی ۔ آتش بازی ہوتی تھی ۔ عاشور خانہ حسین یار جنگ کے مکان میں قد آدم بلکہ اس سے بڑے آئینے نصب ہوتے اور روشنی کے درخت لٹکائے جاتے ان کے مکان میں داخل ہوتے تو معلوم ہوتا کہ پرستان میں آگئے ہیں ۔ سید صاحب ، بخشو صاحب

جو میر محمد علی عزلت کے نواسے تھے ، ایرانی گلی میں پنج شاہ کے راستے میں رہتے تھے ۔ ان کے مکان کی روشنی اور آتش بازی سے تعلق رکھتے ۔ ان کے مکان اپنی سادہ کاری اور نفاست کے لیے مشہور تھا ۔ رستم زمان خان فرزند منیرالملک کے مکان کی صفائی ، فرش ، روشنی ، شیشہ آلات مینا گاری دل کو موہ لیتی ۔ یہاں کی دل کشی ایسی ہوتی تھی کہ یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا تھا ۔ امین الملک اور ماہ لقابائی چندہ کے مکان میں جو خصوصیت سے علم استادہ کرنے کے لیے تعمیر ہوئے تھے سادہ کاری ، نقاشی اور طرز عمارت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی ۔ جعفر علی جمعدار کا تیار کیا ہوا سرسوں کا سبزتابوت جو اونٹ کی صورت میں ہوتا اس کے ساتھ ہوتا تھا اس کی سبزی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتی ۔ روشنی کا بھی بڑا اہتمام ہوتا تھا ۔ وہ اپنے مکان کے متصل آئینہ بندی کرتا تھا ۔ جو دس دن تک قایم رہتی ۔ راجا اوجاگرچند کے خاندان کے مکانات پر تکلف روشنی سے منور ہوتے ۔ شمس الامراء کے فرزندوں کے آب دار خانے کی آئینہ بندی بھی اسی طرح ہوتی لال کے آب دار خانے کی روشنی ، شیشہ آلات سے آراستگی اور آئینہ بندی ایسی ہوتی تھی کہ قلم میں اس کے بیان کی طاقت نہیں غرض کہ نہ صرف مکانوں کی زیب و زینت بلکہ راستے اور بازاروں اور محلوں کی آراستگی قابل تعریف ہوتی تھی ۔ حکیم صادق حسین خان المشہور بہ منا صاحب اور محمد وجیہہ الدین عرف دادا میاں کے تعزیہ نہایت نازک اور طلائی نقش و نگار سے مزین ہوتے ۔ ان پر درخت اور اس کی شاخوں کے مماثل پھول اور غنچہ اور پتے اور بیل ہوتے ۔ قرآنی آیتیں جو اس پر کندہ ہوتی تھیں وہ بڑی عجیب و غریب ہوتیں ۔ نہ صرف دکن میں بلکہ شمالی ہند میں بھی اس کی

شہرت تھی - راجا راو رنبھا کے مکان میں ہر روز ایک ہزار کی روشنی ہوتی اور دس محرم کی رات کو دس ہزار کی روشنی کی جاتی تھی - غرض محرم کے عشرے میں شہر حیدر آباد میں لاکھوں روپیے خرچ ہوتے - اور روشنی وغیرہ کا جو تکلف ہوتا تھا اس کی پوری صراحت ناممکن ہے -

نعل صاحب کی سواری بڑی شان سے نکلتی اس کے ساتھ آفتابی اور مشعلوں کی کثرت انسانی گنتی سے باہر ہوتی تھی - اور یہ انواع و اقسام کے ہوتے تھے - جن کو دیکھ کو حیرت ہوتی تھی - اس کو دیکھنے کے لیے ہزاروں آدمیوں کا مجمع ہوتا جن میں عورت ، مرد ، بچے سب ہی ہوتے مگر یہ محض تائید غیبی تھی باوجود کثیر مجمع کے جن میں ہاتھی گھوڑے اور میانے بھی ہوتے کوئی حادثہ نہیں ہوتا تھا - محرم کے عشرہ کے لیے نہ صرف حیدرآباد میں لوگ بلکہ اضلاع اور دیہات میں بھی بلا تفریق مذہب ہندو مسلمان مرد ، عورت ، بچے آتے تھے - جو سب دس روز تک سبز لباس میں ہوتے اور بعض سیاہ لباس میں ہوتے اور گلے میں انٹی (جس کو سیلے کہتے جو جو دو پیسے سے لے کر دس دس بیس بیس روپیے تک کی ہرتی تھیں) ڈالے ہوئے اور گلے میں آنٹی سوتی ، ریشمی اور زرین کلابتو کی ہوتی تھیں - حضور پر نور تمام محلات شاہی اور مرشد زادے صاحب زادے سب ہی استعمال کرتے تھے - اگرچہ پہلے فقیر بچوں کو بنایا جاتا تھا مگر اس کے بعد جوان بوڑھے سب ہی اس رسم کو اختیار کرنے لگے - حتیٰ کہ طوایفین بھی آنٹی گلے میں ڈال کر فقیر بنتی تھیں - ہر طرف شکر، گلاب اور گڑ کا شربت مفت تقسیم ہوتا - اس طرح شربت کے ساتھ کھچڑی اور کھانے کی دوسری چیزیں شرینی ہر مکان سے تقسیم ہوتے بہر حال ماہ محرم میں حیدر آباد میں جو

تکلف ہوتا اور جو دولت صرف ہوتی اس کی صراحت قلم سے نہیں ہوسکتی صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی ۔

اس زمانے میں جو مرثیہ خوانی ہوتی وہ بھی قابل تحریر ہے۔ ان میں علی یاور خان جو مرزا مہدی کے لقب سے مشہور تھے روضہ خوانی میں کمال رکھتے تھے ۔ واقعات شہادت بڑے انداز میں بیان کرتے ۔ ان کی فصاحت اور بلاغت خارج از تحریر ہے ۔ ان کا کلام سننے کے لیے ہندو مسلمان امیر و غریب سب شریک ہوتے تھے[1] ۔

تیسرے دور کے محرم کی یہ مختصر صراحت ہے ۔ مزید تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے ۔

چوتھا دور

حیدرآباد کے محرم کا چوتھا دور سن ۱۳۰۰ ہجری یا سن ۱۸۸۳ع سے شمار کرنا چاہیے ۔ اس دور کو سن ۱۳۳۰ ہجری (۱۹۱۲ع) پر ختم کر سکتے ہیں ۔

اس دور میں نواب میر محبوب علی خان چھٹے آصف جاہ کی حکمرانی رہی اور دیوانی پر یکے بعد دیگر کئی اصحاب مامور ہوتے تھے ۔ اس دور کے محرم میں گذشتہ دور کی کئی باتیں باقی رہیں اور کئی امور ترک ہوگئے ۔

محرم کے چاند سے حسب معمول علم استادہ ہوتے تھے ، سوانگ بھرنے والے شیر ، مجنوں وغیرہ بنتے تھے ان ڈرامے کی طرز کی نقالی بھی ہونے لگی تھی ، یہ دس دن کے بعد بھی قایم رہتے تھے ۔ آصف جاہ کی سرپرستی اس قسم کے کھیلوں کو حاصل تھی ۔ ایسے ڈرامے کسی اسٹیج پر نہیں بلکہ راستے پر ہوتے ۔ چومحلہ کے

۱- گلزار آصفیہ

سامنے سواریوں کی آمد و رفت بند ہوجاتی ۔ کئی کئی گھنٹے تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا ۔

گذشتہ دور میں جو جلوس فقیروں وغیرہ کے نکلا کرتے تھے موقوف ہوگئے ۔ مگر عاشور خانوں اور الاوں میں زیارت کو آنے والوں میں کوئی کمی نہیں ہوتی تھی ۔ یوں تو یکم محرم سے ہر ایک عاشور خانہ وغیرہ میں ہجوم ہوتا تھا لیکن خصوصیت سے دس محرم کی رات یعنی نو محرم کا دن گزرنے پر رات کو لوگوں کی بڑی کثرت ہوتی تھی (دارالشفاء) جہاں نعل صاحب کے مجاور کا مکان ہے یہاں سے لے کر پتھر گٹی ۔ عاشور خانۂ شاہی پنجہ شاہ ، الاوہ بی بی ، الاوہ یتیماں اور مہاراجا کی ڈیوڑھی کے علاوہ دیوان کی ڈیوڑھی میں حضرت عباس کے علم کی زیارت کے لیے اور کئی مشہور علموں کی زیارت کو کثیر مجمع ہوتا تھا ۔ جس میں ہر مذہب کے لوگ ۔ عورت ۔ مرد اور بچے شامل ہوتے ۔

فوج باقاعدہ میں تعزئیے (تابوت) بنتے اور دس محرم کی رات کو فوجی جلوس کے ساتھ مہاراجا کی ڈیوڑھی میں جاتے اور معمول وصول کرتے ۔ فوجی رسالوں کے بسیوں اور دوسرے سینکڑوں ادنیٰ لوگوں کی جماعتیں ہاتھوں میں چھوٹے بڑے مشعل لیے ہوئے دارالشفاء سے پتھرگٹی اور مہاراجا کی ڈیوڑھی تک گشت کرتے تھے یہ مختلف نعرے لگاتے ہوئے جاتے تھے ۔ فقیر بننے کی رسم کسی قدر کم ہوگئی ۔ شربت ، کھچڑی ، روٹ اور چونگے وغیرہ شریں کھانوں کے خوان خاندانوں میں تقسیم ہوتے ۔ شربت کی ٹھلیوں کو رنگا جاتا ۔ دو دو چار آٹھ آٹھ ٹھلیاں تقسیم کی جاتیں ۔

مجالس عزا منعقد کرنے کا دستور بحال رہا پہلی محرم سے دس محرم تک بلکہ اربعین تک مجالس میں مرثیے پڑھنے کے لیے لکھنؤ وغیرہ سے مرثیہ نویس شعرا طلب کیے جاتے ۔ انیس اور ان کے خاندان کے اصحاب بھی آتے رہے ۔

محرم میں پانچ محرم سے بارہ محرم تک تمام سرکاری اور جاگیرداروں کے دفاتر میں تعطیل ہوتی تھی ۔ اس لیے اضلاع وغیرہ سے لوگ آتے تھے ۔ لنگر کی قطب شاہی رسم جو آصف جاہ ثانی نے آغاز کردی تھی وہ بھی برابر جاری رہی ۔

۱۰ محرم کی صبح کو دیوان ڈیوڑھی میں حضرت عباس کے علم کی سواری نکلتی تھی نہ صرف شعیہ اصحاب بلکہ دوسرے لوگ بھی سواری کو دیکھنے دیوان کی ڈیوڑھی کے میدان میں جمع ہوتے اور ماتم ہوتا تھا ۔

سہ پہر کو تمام تعزئیے اور علم پرانے پل کے قریب موسیٰ ندی میں ٹھنڈے کیے جاتے تمام تعزئیے اور اکثر علم پتھرگٹی اور چار مینار سے ہوتے ہوئے حسینی علم پر سے گذر کر پرانے پل کر آئے تھے ۔ چار مینار سے پرانے پل تک اور ندی کے اندر ہزاروں آدمیوں کا مجمع ہوتا تھا ۔ یہ مجمع بلا تفریق مذہب ہوتا ۔ چادر گھاٹ کے طرف صرف بی‌بی کا علم جاتا تھا ۔ اس علم کی سواری دو تین بجے نکلتی ۔ اور ندی تک پہنچتے پہنچتے شام ہوجاتی تھی ۔ علم کے ساتھ اور اس کے آگے اور پیچھے اور ندی میں کثیر مجمع ہوتا تھا علم کے ساتھ ماتم بھی ہوتا ۔

اس زمانے کے محرم کو ہم خود اپنے بچپن میں دیکھ چکے ہیں ۔ اس کی یاد فراموش نہیں ہوئی ہے ۔

محرم کے دس دن تک حیدرآباد کے خصوصی رسم و رواج ہندو مسلمانوں کے اتحاد اور اتفاق میں دکنی کلچر کے مظاہر کا اچھا موقع ملتا تھا ۔

یہ دور اعلیٰ حضرت نواب میر محبوب علی خان کے انتقال پر ختم ہوجاتا ہے اور حیدرآباد کے محرم کا پانچواں دور شروع ہوتا ہے ۔

پانچواں دور

حیدر آباد کے محرم کا پانچواں دور نواب میر عثمان علی خان کی مسند نشینی کے بعد سن ۱۹۳۰ع سے شمار کرنا چاہیے ۔ جب کہ لنگر کی رسم موقوف کر دی گئی ۔ فوج کے تعزئیے بند ہوگئے اس کے علاوہ دوسرے ناجایز اور معیوب امور ختم ہوگئے یعنی جو سوانگ وغیرہ ڈالا جاتا تھا جو ڈرامے ہوتے تھے یہ سب بند کر دیے گئے ۔ البتہ مجالس عزا کا رواج بڑھ گیا ۔ مجالس ، ماتم ، اربعین تک اور اس کے بعد بھی ہونے لگے ۔

عزا خانۂ زہرا تعمیر ہوا ۔ جاگیردار اوو اعلیٰ طبقے میں فقیر بننے کا جو طریقہ تھا وہ مسدود ہوگیا بلکہ فاتحہ اور نیاز کا جو رواج تھا اس میں بھی کمی ہوگئی ۔

بعض اور امور اور دوسرے صاحب ثروت اصحاب کے مکانوں میں جو علم استادہ ہوتے تھے ان کو دیکھنے کے لیے عوام کا مجمع ہوتا تھا وہ بھی ختم ہونے لگا ۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ماہ محرم کی کئی بدعتیں اور ناجایز مراسم ختم ہوگئے البتہ عزا داری کا رواج زیادہ ہوگیا ہے ۔

دس محرم کو جو مجمع پرانے پل کی طرف تعزئیے دیکھنے کا ہوا کرتا تھا وہ تعزیوں کے نہ ہونے سے موقوف ہوگیا ۔ صرف بی بی کے علم کی سواری اور اس کے علاوہ علم ٹھنڈا کرنے کا رواج باقی رہ گیا ۔ دس محرم کی رات کو عاشور خانۂ نعل صاحب ، پنجہ شاہ اور حضرت عباس کے علم وغیرہ کی زیارت کے لیے جو لوگ آتے تھے بدستور آتے رہے لیکن ان کی تعداد میں کمی ہوگئی ۔

کیونکہ اب اس قسم کے رسومات کو غیر ضروری قرار دینے لگے تھے ۔

نواب میر عثمان علی خان آصف جاہ سابع نے اپنا یہ معمول قرار

دیا تھا کہ محرم کی سات تاریخ کو حیدرآباد کے تمام مشہور عاشور خانوں کو محلات کے ساتھ جا کر زیارت کرتے تھے ۔ اس کی وجہ سے عوام میں بھی عاشور خانوں کی زیارت کا شوق ہوگیا ۔

قطب شاہی دور میں عید میلاد

سلطان محمد قلی قطب شاہ اور اس کے نواسے سلطان عبداللہ کے عہد میں عید میلاد شاندار پیمانے پر منائی جاتی تھی ۔ اس کی تفصیل تاریخوں میں موجود ہے ان سے واضح ہوتا ہے کہ عید میلاد کا جشن قصر داد محل کے کشادہ اور وسیع میدان میں منعقد ہوتا تھا یہ میدان شاہی محل کے جانب جنوب میں واقع تھا اس میدان کے تین طرف جوہریوں کے دوکانائیں تھیں ۔ عید میلاد میں نہ صرف چالیس ستون اور چار سو طنابوں کا ایک خیمہ استادہ کیا جاتا تھا اور اس خیمہ کو آراستہ کیا جاتا بلکہ اس کے اطراف کی دوکانوں کو بھی آراستہ کیا جاتا تھا ۔ خیمے کا وسطی حصہ مخمل و اطلس اور اطراف زردوزی نقش و نگار سے مزین ہوتا ۔ عید میلادالنبی کی آمد سے بہت قبل صناع ، ہنر مند اور استادان صنعت و حرفت شاہی عمارتوں کو آراستہ کرتے ۔ ربیع الاول کی سترہ تاریخ کو نقاروں ۔ دماموں ۔ نفیریوں اور قرناوں کی آواز سے میدان داد محل گونج اٹھتا ۔ تمام شہر اور اطراف کے لوگ میدان میں جمع ہو کر صنعت و حرفت کے ہنر مندیوں کا معائنہ کرتے ۔

اس خصوص میں ”حدیقۃ السلاطین“ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو ۔

”قطب شاہوں میں عید مولود نبی بڑی شان و شوکت سے سے منائی جاتی تھی ۔ ”داد محل“ کے میدان میں محفل ہوتی تھی ۔ عید میلا النبی کے آمد سے بہت پہلے صناع ۔ ہنر مند اور استادان صنعت و حرفت اس مقام کے سامنے اپنے عجیب و

غریب کمالات کی پیشکش میں مشغول ہو جاتے اور جب روز مولود النبی (۱۲ - ربیع الاول) آ جاتی تو کوسوں دماموں ، نقاروں ، نفیریوں اور قرناوں کی آواز سے میدان داد محل گونج اٹھتا - تمام شہر اور اطراف کے لوگ اس میدان میں جمع ہوتے اور صنعت و حرفت کے کرشموں کا تماشا دیکھتے اور ان دلکشا قصروں کی تصویروں کی سیر کرتے ان دونوں قصروں کی دیواروں پر تصویریں اتاری گئیں تھیں - عید مولود نبی میں عوام ان تمام تصویروں کو دیکھنے جمع ہوتے تھے اور عوام کو عام طور سے دیکھنے کی اجازت دی جاتی تھی -

ان مصور منقوش ایوانوں کے سامنے کے میدان میں اس تقریب سعید کے لیے ایک بہت بڑا خیمہ کھڑا کیا جاتا اس کے وسط میں ایک شامیانہ باندھا جاتا - جس میں شاہی تخت رکھا جاتا تھا - جو تمام و کمال سونے کا تھا اور قیمتی جواہرات سے مرصع بھی - اس کے اطراف شاہی تجمل و لوازم کی مناسب آراستگی کی جاتی - ماہرین فن موسیقی جمع ہو جاتے اور اپنے فن موسیقی اور رقص کے کمال دکھاتے - اہل موسیقی کے علاوہ دوسرے صاحبان کمال مثلاً بازی گر - ریسمان باز - لغبیت باز - حقه باز - مثلاً اہل بزل - مسخرے - شب باز وغیرہ اس موقع پر حیدر آباد میں جمع ہوتے اور میدان دلکشا کے داد محل میں اپنے اپنے کرتب دکھاتے رہتے - اس میدان کے علاوہ میدان عالم پناہ (میدان چار کمان) میں بھی ایک بلند اطلسی خیمہ کھڑا کیا جاتا اور چبوترے پر مسند ترتیب دے کر بڑے بڑے عہدہ دار یہاں بیٹھا کرتے اور رقص و سرور کی محفلیں آراستہ ہوتیں اور بزم نشاط گرم رہتی -

اس طرح دوسرے ایوانوں مثلاً محل خاص - ہشت محل - لعل محل - گگن محل - چندن محل - سحن محل وغیرہ میں بھی

ڈیرے اور شامیانے لگائے جاتے ۔ مسندیں بچھائی جاتیں ہر جگہ حسب مراتب سلحدار ۔ حوالہ دار بیٹھا کرتے اور محفل نشاط گرم رہتی۔ تمام خیموں اور محلوں میں زعفران، صندل اور مشک وغیرہ کو طلائی اور نقرئی بادیوں میں بھر کر ہر روز ایک ایک طبق پان خاصہ کے ساتھ تقسیم کرتے ۔ جو ہر محل میں کئی سو بلکہ ہزار سے زیادہ صرف ہوتے ۔ ساتھ ہی ہر روز قسم قسم کے کھانوں کے دسترخوان بچھائے جاتے اور تمام خاص و عام کی شاہی دعوت ہوتی یہ تو شاہی محل کے باہر ہوتا ۔ خاص شاہی محل کی آراستگی اس سے زیادہ ہوتی اور مخصوص اور منتخب مہ جمال رقاصائیں اور استادان خونند و سازندہ ملک ہندوستان اور ایران سے آ کر بار پاتے تھے ۔

اس ماہ کے جشن و میزبانی کے آخر میں بادشاہ کی سواری نکلتی تھی اور دونوں میدانوں کی سیر کرتی ۔ اس موقع کے لیے شاہی ہاتھی کو زعفران اور صندل سے دھو کر طلائی زنجیروں ۔ موتیوں کی جھول ۔ مرصع کلغی اور دوسرے زیوروں سے آراستہ کیا جاتا عصر کے وقت بادشاہ اس ہاتھی پر سوار ہو کر میدان کی طرف نکلتا اور جملہ ارکان دولت ، مقربان تخت ۔ سرداران عالی شان وزیران رفیع مکان ، جمعدار ، حوالہ دار ، سلحدار غرض ہر طبقے کے لوگ شاہی سواری کے اطراف پیدل چلتے۔ گاتے ، بجاتے اور ناچتے۔ رقصائیں اپنے فن کے کمالات دکھاتی ہوئی شاہی ہاتھی کے آگے آگے ہوتیں ۔ سواری کی دھوم دھام کر و فر شان و شوکت اور جلوس کے طمطراق کو دیکھنے کے لیے تمام شہر اور اطراف کی مخلوق جمع ہو جاتی ۔ مکانوں ، بازاروں اور دوکانوں میں اور ان کی چھتوں پر انسانی سروں کے سوائے کچھ نظر نہ آتا ۔ خاص کر میدان میں تو عظیم الشان مجمع رہتا تھا ۔ شاہی جلوس میدان چار کمان سے

نکل کر چار مینار سے ہوتا ہوا داد محل کے میدان دلکشا میں پہنچتا تھا یہاں کوتوالی کی چاوڑی تھی اس مقام پر شاہی ہاتھی تھوڑی دیر کے لیے ٹھہرایا جاتا اور زر و جواہر کی کشتیاں بادشاہ پر سے نثار کی جاتیں اور نذریں پیش کی جاتیں ۔ تجار اپنے اپنے تحفے پیش کرتے اور انعام و اکرام سے نہال کیے جاتے ۔

مولود النبی کے آخری دن میدان داد محل ایک طعام خانہ عام کی صورت میں تبدیل کر دیا جاتا اور تمام لوگ خاص و عام ان دسترخوانوں پر کھانا کھاتے تھے۔ اس وقت میدان میں چاروں طرف روشنی کی جاتی تمام میدان روشنی سے جگمگا اٹھتا ۔ دولت خانۂ شاہی کے اندر اور باہر آتشبازی چلائی جاتیں ۔ تمام رات کھانے ، پینے ، گانے ، بجانے اور تماشے کا سلسلہ جاری رہتا ۔ غرض میلاد النبی کی خوشی کا یہ جشن بارہ روز تک دن رات جاری رہتا تھا اور اس میں تیس ہزار ہون خرچ ہوتے [۱]''۔

عید میلاد

دور محبوبی۔دور عثمانی

قطب شاہی عید میلاد کے بعد عہد آصفی کی عید میلاد کا تذکرہ ضروری ہے ۔ آصف جاہ سادس نواب میر محبوب علی خاں اور آصف جاہ سابع نواب میر عثمان علی خاں کے دور کی عید میلاد کے حالات پیش کیے جاتے ہیں ۔

واضح ہو کہ دور محبوبی میں بارہ ربیع الاول کو تمام حکومت

---

۱ ''حدیقۃ السلاطین'' ۴۹ تا ۵۶

میں عام تعطیل دی جاتی تھی ۔ بعض مشائخین عظام مثلاً مولانا خیرالمبین صاحب حضرت زور علی شاہ وغیرہ بارہ دن تک وعظ فرمایا کرتے جس میں میلاد کے واقعات اور مسلمانوں کی اصلاح بدعتوں سے اجتناب کرنے کی نصیحت کی جاتی تھی اور بعض ایسی باتیں اور حکایتوں کو بیان کیا جاتا تھا جن کو عصر حاضر کے تعلیم یافتہ اصحاب باور نہیں کرتے تھے ۔ اس لیے ان وعظوں سے صرف قدیم تعلیم یلفتہ اصحاب متمتع ہوتے تھے۔ جدید تعلیم یافتہ اصحاب نہ ان واعظوں میں شریک ہوتے اور نہ ان سے استفادہ کیا جاتا تھا ۔

علاقہ صرف خاص ۔ پائیگاھوں اور بعض بڑے بڑے جاگیر داروں کے یہاں روزانہ بریانی اور دیگر لوازمات کے ساتھ فاتحہ ہوتی اور تمام متعلقین جاگیر کے یہاں روزانہ حصے تقسیم ہوتے تھے ۔ بلا مبالغہ حضوری صرف خاص ۔ پائیگاھوں ۔ سالار جنگی اسٹیٹ وغیرہ میں کئی صد پلہ کی پخت ہوتی اور سینکڑوں آدمیوں کی شکم سیری ہوتی تھی ۔

غرض دور محبوبی کی عید میلاد کی بھی باتیں ہم کو یاد ہیں ۔ اس کے بعد دور عثمانی آتا ہے ۔ اور مولوی انواراللہ فضیلت جنگ ناظم امور مذھبی اور پھر صدرالمہام امور مذھبی مقرر ہوئے۔ آپ کے زمانے میں گیارہ ربیع الاول یعنی بارھویں کی شب کو مکہ مسجد میں تمام رات روشنی ہوتی اور مقررہ پروگرام کے مطابق وعظ۔ قصیدہ بردہ خوانی اور مولود خوانی ہوتی رهتی اور آٹھ نو بجے صبح کو خطیب مکہ مسجد میلاد کا بیان بطور خطبہ سناتے ۔ جس میں حضور آصف جاہ سابع خود شریک ہوا کرتے تھے ۔ دور محبوبی کے بر خلاف دور عثمانی کے مجالس میلاد میں جدید تعلیم یافتہ اصحاب بھی شریک ہوتے ۔ فضیلت جنگ کے بعد جب مولوی حبیب الرحمان خان شروانی المخاطب صدر یار جنگ امور مذھبی کے اعالی افسر ''صدرالصدور'' کی خدمت پر مامور کیے گئے تو جلسہ ھائے میلاد عام

طور سے ہونے لگے۔ ہر محلہ بلکہ ہر ہر دفتر میں جلسۂ میلاد منعقد کیے جانے لگے اور ان سے عام و خاص مستفید ہوتے لگے ۔ نہ صرف ماہ ربیع الاول بلکہ تقریباً آٹھ نو ماہ تک جلسہ ہائے میلاد کا سلسلہ رہنے لگا ۔ آخر اس کو حکماً روکا گیا اور خاص چند ماہ میں اس کے انعقاد کو جاری رکھا گیا ۔ یہ طے کیا گیا تھا کہ ہر دفتر میں علیحدہ علیحدہ جلسہ ہائے میلاد مقرر کرنے کی بجائے ربیع الاول کے آخری ہفتے میں تمام دفاتر کے مشترک چندے سے امور مذہبی کے زیر اہتمام یہ جلسے ہوا کریں مگر اس کا سلسلہ چند سال کے بعد موقوف ہو گیا ۔

جلسہ ہائے میلاد نہ صرف حیدر آباد یا اضلاع میں ہوتے تھے بلکہ تعلقات کے مستقر پر بھی جلسۂ میلاد ایک خاص پروگرام کے تحت ہوتے تھے ۔

پھر وہ زمانہ بھی آ گیا جب کہ نواب بہادر یار جنگ میلاد کے جلسوں میں حصہ لینے لگے اور اپنی جادو بیانی کے جوہر دکھانے لگے ۔ بہادر یار جنگ کی میلاد مبارک کی تقریریں مسلمانوں کی اصلاح کے لیے ایک مفید تحریک کا باعث بنتی تھیں ۔ آپ کی تقریر سننے کے لیے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں اصحاب کا مجمع ہوتا تھا یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ بہادر یار جنگ کا پہلا سیاسی میدان میلاد النبی کے جلسے ہی ہیں ۔ اس کے بعد اتحاد المسلمین کی انجمن قائم ہوئی بہادر یار جنگ کبھی بحیثیت مقرر اور کبھی بحیثیت صدر جلسہ تقویر فرماتے تھے مگر خواہ کوئی حیثیت ہو آپ کی تقریر پورے پروگرام کی جان ہوتی تھی ۔

بہادر یار جنگ، مرحوم کے علاوہ مولانا حسام الدین صاحب مرحوم کے میلاد مبارک کے جلسوں کی تقریریں بھی اصلاح مسلمانوں کے لیے بڑی مؤثر ہوتی تھیں ۔ علامہ سید مناظر الحسن کی تقریر کو بھی شوق سے سنا جاتا تھا ۔ جامعۂ عثمانیہ کے تعلق سے جو جلسہ

کالج میں ہوتا تھا وہ بھی خصوصی حیثیت رکھتا تھا ۔ مقابلوں پر انعام بھی دیا جاتا تھا ۔

سکندر آباد میں بھی میلاد کا ایک بڑا جلسہ ہوتا اور اچھے مضمون پر انعام دیا جاتا تھا ۔ غرض عید میلاد کے جلسے مسلمانوں کی اصلاح کا ذریعہ بنتے تھے ۔

پولیس ایکشن کے بعد یوں تو میلاد کے جلسوں میں کمی ہوگئی تھی مگر " انجمن تعمیر ملت " کی جانب سے میلاد مبارک کا جلسہ ۱۲ - ربیع الاول کی صبح کو ہونے لگا اور اس میں خاص مجمع ہوتا ہے - باہر کے مقررین بھی بلائے جاتے ہیں ۔ ایک مرتبہ گورنر صاحب آندھراپردیش ، ڈاکٹر عبدالحق صاحب اور مولانا عبدالوہاب بخاری وغیرہ نے جلسوں کی صدارت فرما کر اچھی اچھی تقریریں کیں ۔ انجمن تعمیر ملت کے جلسہ ہائے میلاد کا سلسلہ گذشتہ سات آٹھ بلکہ شاید دس گیارہ سال سے برابر جاری ہے ۔ اور ہر سال کا جلسہ اپنے ماسبق جلسے سے ترقی کرتا جاتا ہے ۔

شب برات

مسلمانوں کی عیدوں میں جو " رات " سے متعلق ہیں تین عیدیں یا تین راتیں مقدس قرار دی گئی ہیں ۔ یعنی شب معراج ، شب براتِ اور شب قدر اور یہ مقدس راتیں ماہ رجب ۔ ماہ شعبان اور ماہ رمضان میں آتی ہیں ۔ یہاں شب برات کی صراحت کی جاتی ہے ۔

" شب برات " میں عیدالفطر یا عیدالضحیٰ کی طرح جماعت سے نماز پڑھنے کی ضرورت ہے اور نہ فطرہ دینے یا قربانی کرنے کا حکم ہے ۔ البتہ انفرادی طور پر نمازیں پڑھی جا سکتی ہیں اور مختلف دعاؤں وغیرہ کا موقع ہوتا ہے ۔ اس رات کی برکت اور تقدس کے متعلق بیسیوں روایتیں ملتی ہیں جس میں اس امر کا تذکرہ ہے کہ یہ رات حاجتوں کے بر آنے اور دعاؤں کے قبول ہونے کی رات

ہے ۔ اس رات بے شمار برکات نازل ہوتی ہیں ۔

ہم اس موقع پر نہ ان روایتوں کا تذکرہ کرتے ہیں اور نہ دعاؤں کی تفصیل بیان کریں گے بلکہ ایک دوسری حیثیت سے شب برات کی تفصیل کریں گے ۔

عام طور پر اس رات کو آتشبازی چھوڑی جاتی ہے اور یہ طریقہ نہ صرف جنوبی ہند بلکہ شمالی ہند میں بھی رائج ہے اگر آتشبازی کی ابتدا کے متعلق غور کریں اور تحقیقات کریں تو معلوم ہوتا ہے یہ طریقہ کسی دوسرے اسلامی ممالک یعنی حجاز ، عرب ، شام ، مصر ، ایران ، عراق وغیرہ میں نہیں ہے ۔ یہ صرف ہندوستان سے متعلق ہے ۔ ہندوستان کی قدیم تاریخوں اور سیاحوں کے سفر ناموں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے ۔ مغلیہ عہد تک یہاں آتشبازی کا رواج نہیں تھا ۔ چنانچہ ''سفر نامہ ابن بطوطہ'' یا ابن جبیر کے سفر نامہ میں جہاں دوسری باتوں کا تذکرہ ہے وہاں شب برات میں آتشبازی کا ذکر نہیں ملتا ۔ خصوصاً ابن بطوطہ جو محمد تغلق کے زمانے میں کئی سال تک ہندوستان میں مقیم رہا اور ایک خدمت پر بھی مامور تھا ۔ آتشبازی کا کوئی ذکر نہیں کرتا حالانکہ اس نے ہر بات کی تفصیل کی ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد تغلق کے زمانے میں شب برات میں آتشبازی کا رواج نہیں تھا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اکبری عہد میں جب کہ اکثر باتیں ہندوؤں سے سماجی طریقوں کی یک جہتی کے لیے قبول کی جا رہی تھیں اور دونوں کو ایک ساتھ اتحاد اور اتفاق کے طریقے سمجھائے جا رہے تھے تو غالباً دیوالی کی مناسبت سے شب برات میں آتشبازی کا طریقہ رائج کیا گیا ۔ دکن میں بھی اسی زمانے میں یعنی محمد قلی نے آتشبازی کا ذکر کیا ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی (چونکہ محمد قلی دکھنی کلچرل کابانی تصور کیا جاتا ہے اس لیے) آتشبازی اور روشنی کا طریقہ اس کے زمانے میں جاری ہوا ۔

بہر حال ” شب برات “ کی آتشبازی صرف ہندوستان سے متعلق رہی ہے ۔ اور صدیوں سے اس کے رواج کا پتہ چلتا ہے ۔ محمد قلی کی نظموں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حیدر آباد میں شب برات کو بڑی خوشی کی جاتی تھی نہ صرف آتشبازی چھوڑی جاتی بلکہ روشنی کا بھی خاص اہتمام ہوتا تھا ۔ اور موسیقی اور رقص سے بھی دلچسپی لی جاتی تھی ۔ ” شب برات “ کی روشنی کے متعلق یہ واضح ہوتا ہے کہ مکۂ معظمہ اور مدینۂ منورہ میں صدیوں سے اس کا رواج ہے ۔ اس رات خانۂ کعبہ میں بہت زیادہ روشنی کی جاتی ہے ۔ اس طرح مسجد نبوی میں روشنی کا اہتمام ہوتا ہے ۔ قدیم سیاحوں کے سفر ناموں سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے چنانچہ ابن جبیر نے خصوصیت سے خانۂ کعبہ کی روشنی کا ذکر کیا ہے ۔

عصر حاضر میں بھی یہ طریقہ رائج ہے ۔ شب برات کو خانۂ کعبہ میں روشنی ہوتی ہے کعبے میں داخلے کا دروازہ کھولا جاتا ہے ۔

دوسرے اسلامی شہروں میں بھی اس رات کو مسجدوں میں روشنی ہوتی ہے ۔ مگر عام طور سے شہر میں روشنی نہیں کی جاتی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ محمد قلی کے زمانے میں عام طور سے شہر حیدرآباد ہی میں روشنی ہوتی تھی ۔ خصوصاً شاہی محل اور شاہی عمارتیں روشنی سے جگمگاتی تھیں ۔ محمد قلی نے اپنی نظموں میں اس کا تذکرہ بڑے جوش کے ساتھ کیا ہے ۔

چنانچہ سلطان محمد قلی کے دیوان میں شب برات کے متعلق دس نظمیں موجود ہیں جس میں روشنی ، آتشبازی اور رقص وغیرہ کا تذکرہ نہایت دلچسپ اور دلکش انداز میں کیا گیا ہے ۔ اس موقع پر اگر تمام نظموں کا ذکر کیا جائے تو مضمون طویل ہو جائے گا ۔ اس لیے صرف بعض نظموں کا تعارف کافی ہے ۔

محمد قلی کی دس نظموں کے منجملہ ایک میں شاعرانہ کمال کا

بہترین نمونہ ملتا ہے اس نظم میں تشبیہوں کی ندرت اور انداز بیان کی دلکشی بہت زیادہ ہے ۔ پوری کی پوری نظم مرصع ہے ۔

مکھ جوت سوں چندر مکھیاں شب رات کوئی جھمکائے ہیں
چندر سورج تارے دیکھت نہیں جھلک کون جھلکائے ہیں
ہر ٹیگ دھن پر یک کدھن ہیں نور تن کے ابر ہیں
پی مداہن جھلکا بدن شـہ ریکچمن کـون آئے ہیں
مکھ سب کے رنگ آسا کرن آفتاب جون ات تاب سون
دکھلائے کسکر مہتاب کون بے تاب کر پھگلائے ہیں

چونکہ اشعار کے معنی عام طور سے سمجھے نہیں جا سکتے اس لیے ان کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے :

"میری ماہ رویوں نے اپنے چہروں کی روشنی سے شب برات کو روشن کر دیا ہے ۔ ان میں سے کوئی سورج نظر آتی ہے ، کوئی چاند اور کوئی تارا ہر طرف ہر ایک نازنین نور تن کا لباس پہن کر آتی ہے ۔ تاکہ بادشاہ کے ساتھ چمن میں نکلے شراب عشق پینے سے ان کے جسم جھلکنے لگتے ہیں ۔ وہ اپنے نوجوان چہروں کو آب و تاب اور آفتاب جیسی جھلک سے مہتاب کو بے تاب بنا کر پگھلا رہی ہیں ۔

نازنین اس انداز سے محو خرام ہیں کہ ان کی زلفوں کے لہرانے کی وجہ سے خوشبو آسمان تک پہنچتی ہے ۔ اور سارا سماں مہک گیا ہے ۔ جس کی وجہ سے فرشتے فریفتہ ہو کر لاکھوں کی تعداد میں اتر آئے ہیں ۔

ایک سے ایک پستان زیادہ خو بصورت ہیں ۔ جن پر سیاہ بادلوں کی لٹیں ایسی نظر آتی ہیں جیسے پہاڑوں پر کالے کالے بادل چڑھائی کرنے آتے ہیں ۔

نازنین کے رخسار مہتاب اور پھولوں کے ہار یا پھول جھڑیاں

نظر آتے ہیں۔ اس کے دونوں بھو حاجیوں کی طرح ایک دوسرے پر حملہ کر رہے ہیں"

ایک نظم میں محمد قلی نے آتش‌بازی کی بہت سی اصطلاحیں استعمال کی ہیں چند شعر ملاحظہ ہوں۔

عشق شبرات سر تھے دھن کری رے
نین مہتاب سیتے دن کری رے
عجب اس دھن کے مکھہ پر ہے تجلی
ہلالاں تن و من روشن کری رے
ہوں یاں سو کے سنکڑیاں چکراں چون
گھڑیاں بازیاں سو اب جوبن کری رے
نین مستی کے گل ریزاں عسو بھر کر
للی طاؤس چمک چو من کری رے
پھلی ناسک جھمکتے تھے ہے شب‌رات
دھرت دن آج لس جوگن کری رے
لڑاں موتیاں ہاں تج ہنسنے کیا جھلیاں
تو جھیلائی تھے جگت در بن کری رے
ترے یک دیکھ دھرتی کھلبلی دھن
ککن کون پگ مٹے پنجن کری رے

طویل نظم ہے شب برات کی روشنی کا تذکرہ کئی جگہ ہے۔ ایک نظم کے چند شعر یہ ہیں۔

جو شبرات ات جھلک سون جگ میں آیا
تو سب جگہ اس جھلک تھے جگ جگایا
شرف شب رات تھے سب رات پائے
شرف شب برات نے شبرات پایا
ککن در بن جھمکن لگیا ات
رلس روشن سرخ بن دن کنوایا

کہتا ہے شب برات کی وجہ سے تمام راتوں کو شرف حاصل ہے ۔ کثرت چراغاں کی وجہ سے رات ایسی منور ہو گئی کہ معلوم ہوتا ہے بغیر سورج طلوع ہوئے دن نکل آیا ہے ۔ زمین کے ان چراغوں کا عکس جب آسمان پر پڑا تو وہ بھی آئینے کی طرح چمکنے لگا آتش بازی اور چراغوں کی وجہ سے دنیا ایسی روشن ہو جاتی ہے کہ اس اجالے کو دیکھ کر آفتاب شرما گیا اور اس شرم کے مارے رات کو کبھی اپنا منہ نہیں دکھاتا ۔

شب برات میں جو مہتاب چھوڑے جاتے ہیں تو ان کی تابانی ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ظلمت میں آب خضر ، گلشن میں جب پھو لبازیاں چھوڑی جاتی ہیں تو زمین پر سورج چاند اور تارے اتر آتے ہیں اور ان کی روشنی کی جھلک آسمان تک پہنچ جاتی ہے ۔ خدا تعالیٰ نے قطب شاہ کو ایسی تجلی بخشی کہ اس نے رات کو دن سے زیادہ روشن کر کے چمکا دیا ۔

غرض کہ اس کی نظموں میں روشنی ، آتش بازی ، شاہانہ رنگ رلیوں کا بخوبی پتہ چلتا ہے کہ شب برات کی تقریب میں دربار اور محل کی مخصوص طوائفیں بڑے اہتمام کے ساتھ سج دھج کے اور طمطراق کے ساتھ اپنے مکان سے آتی تھیں اور رقص کی محفل گرم ہوتی تھی ۔

محمد قلی کے بعد اس کے جانشینوں اور سلطان عبداللہ کے عہد میں وہی نقشہ رہا جو اس کے نانا محمد قلی کے دور میں تھا ۔ قطب شاہی دور کے بعد شاہی محل کی روشنی ، کر و فر اور شاہی دربار موقوف ہو گئے تھے ۔ مگر عوام میں آتشبازی کا سلسلہ بدستور باقی رہ گیا ۔

آصفی دور میں آتشبازی کا جو طریقہ تھا اس سے واضح ہو گا ۔ کہ پائے گاھوں اور دیوان کی جانب سے حضور میں آتشبازی نظر گذارنی جاتی تھی اور اس طرح حضور کی طرف سے آتشبازی کی بھی تقسیم ہوا کرتی تھی ۔ ایک عرصے تک سرکاری اعلیٰ عہدے داروں

کو سرکار کی جانب سے آتش بازی بھی دی جاتی تھی ۔ اس طرح جو عہدے دار منسوخ تھے ان کی اولاد بھی اس آتش بازی کو چھوڑا کرتی تھی اگرچہ عرصہ ہوا کہ یہ قاعدہ موقوف ہو چکا ہے مگر تاریخوں میں اس کی صراحت ملتی ہے ۔

عام طور سے عوام اپنے بزرگوں ، رشتہ داروں کی فاتحہ کرتے اور قبروں پر پھول چڑھائے جاتے تھے ۔ نیاز کے حصے دوستوں اور رشتےداروں میں تقسیم ہوتے تھے ۔

حیدرآباد کا قدیم رمضان

مسلمانوں کے لیے ماہ رمضان نہایت مبارک اور مقدس مہینہ ہے۔ اس ماہ عظمت ، کی فضیلت اور برکات سے قطع نظر ہم کچھ اور باتیں سناتے ہیں ۔

قطب شاہی دور میں ماہ رمضان کی عظمت کا خیال رکھا جاتا تھا ۔ ماہ رمضان کے چاند کے ساتھ ہی لہو و لعب کے جلسے ختم ہو جاتے تھے ۔ رقص و سرود کی محفلیں برخاست ہو جاتی تھیں ۔ شراب خانے اور سیندھی خانے بند کر دیے جاتے تھے ۔

ماہ رمضان کے تقدس کا لحاظ کرکے شاہی محل میں بھی رقص و سرود ، شراب‌نوشی اور عیش و عشرت موقوف ہو جاتا تھا ۔ سلطان محمد قلی باوجودیکہ رند مشرب اور عیش و عشرت کا دلدادہ تھا لیکن وہ بھی ماہ میں پابندی سے روزہ رکھتا تھا ۔ اس کی تقلید میں تمام شاہی بیگمات اور محل کے ملازمین بھی روزہ رکھتے تھے ۔

ظاہر ہے کہ بادشاہ کا اثر عوام پر بھی ہوتا ہے ۔ اسی لیے عام طور سے لوگ روزہ رکھتے تھے ۔ سلطان محمد قلی نے اگرچہ ماہ رمضان کے متعلق کوئی نظم نہیں لکھی ہے مگر عیدالفطر کے متعلق کئی نظمیں لکھی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ ماہ رمضان کی کس طرح حرمت کی جاتی ہے ۔

آصفی دور میں اکثر مسجدوں میں تراویح کی نمازیں ہونے لگیں ۔ جو مسجدیں حکومت کی نگرانی میں ہوتی تھیں تراویح کی نماز کا انتظام سررشتۂ مذہبی کی جانب سے ہوتا تھا ۔ جو مسجدیں سرکاری نگرانی میں نہیں تھیں ان میں تراویح کا انتظام اہل محلہ کرتے تھے۔ مسجدوں میں روشنی کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔ جاگیرداروں اور امیروں خصوصاً پائیگاہی امیروں کی جانب سے اکثر مسجدوں میں افطاری بھیجی جاتی تھی تاکہ روزہ دار روزہ کھولیں اور اس کا ثواب ملے ۔ الوادع کے ''جمعہ'' کو مکہ مسجد میں بڑا مجمع ہوتا تھا اور اس روز اکثر و بیشتر امراء اور جاگیردار خود مسجد میں روزہ کشائی کرتے تھے مکہ مسجد کے صحن میں فرش ہوتا ، صدہا دسترخوان بچھتے اور روزہ دار روزہ کھولتے تھے ۔ سینکڑوں خوان افطاری کے آتے تھے ۔ پائیگاہی امراء خصوصیت سے اس روز آتے تھے ۔

ہماری یاد میں اس میں بہت کمی آ گئی تھی ۔ اور اب تو وہ زمانہ مفقود ہوگیا اور وہ باتیں جاننے والے بھی نہیں رہے ۔

مولوی انوار اللہ فیضیلت جنگ مرحوم جب امور مذہبی کے ناظم اور پھر صدر المہام امور مذہبی بنے تو انہوں نے اس امر کا اعلان کر دیا تھا کہ دن کے وقت چاء خانوں اور ہوٹلوں پر پردے چھوڑ لیے جائیں چنانچہ اس زمانے سے اس کی پابندی ہوتی تھی ۔ اب اس کا بھی رواج نہیں ہے ۔ یہی چیز ہم کو اپنے سفر عراق میں معلوم ہوئی ۔ سنا گیا ہے کہ وہاں عام طور پر ہر ہوٹل پر پردے چھوڑ دیے جاتے ہیں اور راستے پر کوئی شخص سگریٹ پیتے نہیں گزر سکتا ۔ خواہ وہ مسلمان ہو یا عیسائی ۔ پولیس اس کی خاص نگرانی رکھتی ہے ۔ فارسی شاعری میں ماہ رمضان میں شراب بند ہو جانے کے متعلق یہ شعر مشہور ہے :

ہلال عید بہ اوج فلک ہویدا شد
کلید میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد

یعنی عید کا چاند آسمان پر نظر آیا اور شراب خانے جو بند ہوگئے تھے وہ کھل گئے۔

حیدرآباد میں عیدالفطر

قطب شاہی زمانے میں عیدالفطر کو عید رمضان سے موسوم کیا جاتا تھا۔ ماہ رمضان کی وجہ سے عیش و عشرت لہو و لعب جو بند ہوجاتے تھے پھر سے آغاز ہوتے۔ عیش و عشرت کے شادیانے بجنے لگتے ، مصری ، پستے ، بادام ، دودھ اور کھجور کا ہرگھر میں اہتمام ہوتا۔ شیر خرما اور سیویوں سے دوستوں کی ضیافتیں ہوتیں تھیں چنانچہ محمد قلی کا ایک شعر اس کی تفسیر کرتا ہے۔

عید سوی لیائیاں خوشیاں آنند
اس آنند ان سو کریں خوباں آنند

بانات شیر خرما پستے شکر ادھر دھر
کیوں روزے رکھتی سکھیاں کر کر سوال ساقی

محمد قلی نے اپنی گیارہ نظموں میں عید رمضان کا ذکر کیا ہے۔ ایک نظم کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

”عید کی رات جلوہ گر ہوئی اور روزوں کے دن گزرگئے۔ اس لیے ساقی نئے چاند جیسے ساغروں میں شراب بھر۔ میں بہت دن سے صوم و صلواۃ کی پابندی کی وجہ سے زھد و پاک بازی کا مرتکب ہو کر بدنام ہو رہا تھا اس لیے اب تو محبت کے پیالے پلا کر مجھے نیک نام کر دے۔

ماہ رمضان کی وجہ سے صراحی مست ہوکر سرکشی کرنے لگی تھی لیکن اب پھر جام کی طرف جھک جھک کر سلام کرنے لگی ہے۔

ان تیس دنوں کا خمار توڑنے کے لیے اے ساقی تو مجھے کم شراب نہ دے بلکہ دم بہ دم پیالے بھر بھر کر دیتا جا۔

نبی کے صدقے میں قطب شاہ کو مے طہور ملی اور امام کے صدقے

میں کوثر سے بھرا ہوا ساغر مل گیا ''۔

یہ تو قطب شاہی دور کا تذکرہ ہوا ہم آج سے پچاس سال پہلے کے عید کا اپنا چشم دید حال سناتے ہیں۔

رمضان کی عید کی تیاری ماہ شعبان سے ہی شروع ہوجاتی تھی۔ کیونکہ بنارسی اور ولایتی رنگ برنگ اور قسم قسم کے کپڑوں اور دوسری ضروری چیزوں کی فراہمی رمضان کے شروع ہونے کے پہلے ہی سے ہوجاتی تھی۔ رمضان کے چاند سے ہی خرید و فروخت شروع ہوجاتی۔ کپڑوں کی زیادہ دوکانیں اس زمانے میں لاڑ بازار میں تھیں۔ پتھرگٹی پر صرف چند ہی کپڑوں کی دوکانیں تھیں۔ حاجی ضیاء علی صاحب اور ایک دو مسلم تاجروں کے سوا باقی تجارت ہندو اصحاب کے ہاتھ میں تھی۔ ہر قسم کا پارچہ ، سوتی ، اونی ، ریشمی زرین ، ولایتی ، بنارسی ، اورنگ آبادی مال کی دوکانیں سب کی سب ہندو ہی تاجروں کی تھیں۔ کپڑوں کے علاوہ مصالحہ ، لیس کور ، غرض زنانہ اور مردانہ ملبوسات کی تمام چیزیں ماہ رمضان میں ہی زیادہ سے زیادہ خریدی جاتیں تھیں۔ بلا مبالغہ صبح سے رات کے نو دس بجے تک ہر دوکان میں خریداروں کا جمگٹھا رہتا تھا۔ لاکھوں نہیں بلکہ کروڑں کی بکری ہوتی تھی۔ ہر گھر میں چھوٹے بڑے لڑکے لڑکیاں عورت ، مرد ، میاں ، بی بی ، حتیٰ کہ ملازمین۔ اکثر و بیشتر گھروں میں تو پورے خاندان کے افراد کے کپڑے بنتے تھے۔ رمضان کے مہینے میں پارچے فروش ، جوتے فروش ، ٹوپی فروش ، چوڑی فروش، عطر فروش ، منیاری فروش کی دوکانوں میں جو بھی فروخت ہوتا وہ نسبتاً دوسرے مہینوں سے زیادہ ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی درزی رنگ ریز ، دھوبی ، پٹویگر ، سنار ، بہرحال ہر ایک کسب والا اور صنعتی رمضان کے مہینے میں زیادہ سے زیادہ منفعت حاصل کرتا تھا۔ آج کل پتھرگٹی کی تمام دوکانوں پر کسی دن یا مہینے بھر میں اس قدر کثیر مجمع نہیں ہوتا جیسا کہ پہلے ایک دن میں ایک دوکان پر ہوتا

تھا ۔ بعض پارچہ فروش تو ماہ رمضان میں پانچ پانچ لاکھ اور چھ چھ لاکھ کا ساسان فروخت کرتے تھے ۔ لباس ۔ آرایش وغیرہ کی چیزیں عید کے پہلے خریدی اور تیار کی جاتی تھیں ۔ غریب سے غریب شخص بھی کم از کم پرانے کپڑوں ھی کو دھوبی سے دھلوا کر استری کرکے پہنتا تھا تاکہ پاک و صاف نظر آئے ۔

آج سے پچاس سال پہلے حیدرآباد کی آبادی تین چار لاکھ سے زیادہ نہیں تھی ۔

کپڑوں کے علاوہ دوسری اشیاء مثلاً ٹوپیاں ، شملے ، جوتے ، دستیاں ، جوڑ ۔ عطر ، حتیٰ کہ زیور بھی خاصا فروخت ہوتا تھا ۔ یہ واقعہ ہے کہ حیدرآباد کی کوئی دوکان خواہ وہ کسی قسم کی ہو ماہ رمضان میں خوب نفع حاصل کرتی اس کے علاوہ درزیوں کی دوکان پر خاصا مجمع ہوتا تھا ۔ ماہ رمضان کے آخری ایک ہفتے تک تو درزیوں کی دوکانیں تمام تمام رات کھلی رھتیں ۔ اس طرح رنگریز دھوبی پٹوےگر ۔ غرض کوئی ایسا پیشہ ور اور تاجر نہ ہوتا جو ماہ رمضان کا انتظار کئی ماہ سے نہ کرتا اور پھر ماہ رمضان میں جو مصروفیت ان دوکان داروں کو ہوتی وہ مدتوں یاد رھتی ۔ روزآنہ سہ پہر کو پتھرگٹی لاڑبازار۔ میں هجوم اور سواریوں کی اس قدر کثرت ہوتی تھی کہ راستہ چلنا دشوار ہوتا تھا۔ خصوصیت سے آخری ہفتہ تو گویا رت جگا ہوتا تھا ۔ تمام دوکانیں رات بھر کھلی رھتیں اور خرید و فروخت ہوتی رھتی تھی ۔

عید کے چاند کے ایک دن پہلے سے شہر کے تمام گوالے دودھ کا خاص انتظام کرتے تاکہ عید کے دن اس کو فروخت کیا جائے ۔ عام دنوں کی بہ نسبت اس روز دودھ کی قیمت گراں ہو تی تھی ۔ یعنی ایک روپیے کا ڈھائی تین سیر دودھ ملتا تھا ۔

عید کا چاند دیکھنے کا انتظام ایسا ہوتا جیسا کہ رمضان کے چاند کے لیے ہوتا تھا ۔ حیدآباد سے ” بیدر“ (۸۰) میل کی مسافت

پر تھا ۔ اور چونکہ بہت بلندی پر یہ آباد تھا ۔ اس لیے یہاں چاند دیکھنے کا اہتمام ہوتا اور چاند دیکھ کر سانڈنی سوار روانہ ہوتا جو رات کے بارہ بجے تک حیدرآباد پہنچ جاتا تھا ۔ اگر حیدرآباد اور اس کے قرب و جوار میں چاند نظر آیا ہو تو سحر کے وقت اس کا اعلان ہو جاتا تھا اگرچہ ہر چاند کو تین توپ سر ہوا کرتے تھے ۔ مگر خصوصیت سے ماہ رمضان اور عید الفطر کو توپوں کے لوگ منتظر رہا کرتے تھے ۔

عید کا چاند نظر آ جانے کے بعد سے ہی گویا صبح کی تیاری ہونے لگتی ۔ جس گھر میں زیادہ بال بچے ہوتے تو پھر ان کو نہلانے کے لیے رات چار بجے سے ہی یکے بعد دیگر نہلانے کا کام شروع ہو جاتا تھا ۔ بچے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی جد و جہد کرتے تھے ۔ ہر گھر میں یہی ہوتا تھا ۔ آفتاب نکلنے تک بچے غسل کر کے نئے کپڑے پہن کر تیار ہو جاتے تھے ۔ اور پھر گھر کے بڑے غسل کرتے اور سیویاں شیر خرما وغیرہ کھا کر مسجد کو جانے لگتے عید کی نماز عید گاہ میں بھی ہوتی اور دوسری بڑی بڑی مسجدوں میں بھی ۔ حکومت کی جانب سے عیدگاہ کی نماز کا اہتمام ہوتا تھا ۔ کوتوال شہر پوری جمعیت پولیس کے جلوس کے ساتھ عید گاہ آتے تھے ۔ کوتوال صاحب ہاتھی پر سوار ہوتے تھے ۔ ان کے علاوہ قاضی شہر ۔ صدر الصدور بھی اپنے علاقے کی جمعیت کے ساتھ ہاتھی پر آتے تھے ۔ خطیب مسجد کو بھی سواری کے لیے ہاتھی جاتا اور وہ بھی ہاتھی پر آتا تھا ۔ اس زمانے میں چونکہ موٹریں نہ تھیں اور نہ اس قدر سائکلیں تھیں اس لیے لوگ گھوڑوں ہاتھیوں ، گاڑیوں ، رتھ ، شکرام جھٹکوں ، اور میانوں میں آتے تھے ایک بڑا حصہ پیدل بھی آتا ۔ اس طرح عید الفطر کی نماز کے لیے پندرہ بیس ہزار کا مجمع ہوتا تھا ۔ دس بجے کے بعد نماز عید ہوتی تھی ۔ جس وقت خطیب صاحب دوسرے خطبے میں اعلیٰ حضرات کا نام

لے کر دعا پڑھتے تو سررشتہ' مذہبی کی جانب سے ان کو خلعت پہنایا جاتا تھا ۔

نماز کے بعد اکیس توپوں کی سلامی ہوتی ۔ اب جلوس واپس روانہ ہوتا کیونکہ آتے وقت کوتوال صاحب ، قاضی صاحب ، فرخی صاحب علیحدہ علیحدہ آتے تھے ۔مگر واپسی کے وقت ایسا نہیں ہوتا تھا بلکہ اول کوتوال صاحب کا جلوس گذرتا اس کے بعد صدالمصدور (افسر مذہبی) پھر قاضی صاحب اور اس کے بعد خطیب صاحب کے ھاتھی ہوتے تھے ۔ ان کے بعد دوسرے لوگ روانہ ہوتے ۔ یہ سرکاری عہدے دار یعنی کوتوال ، قاضی ، صداالصدور ہوغیرہ پہلے حضور کی ڈیوڑھی جاتے اور عید کی نذر پیش کرتے پھر اپنے گھروں کو جاتے تھے ۔

عید رمضان کی تیاری میں سویوں کے علاوہ ، کھجور ، بادام اور کشمش وغیرہ خشک میوہ بھی ہوتا تھا ۔ ہر گھر میں شیر خرما کی تیاری لازماً سمجھی جاتی تھی ۔ گھروں کی صفائی ، اھک‌پاشی فرنیچر کی پالش وغیرہ بھی رمضان کے پیش خیمہ ہوتے تھے ۔ غرض عید کی بڑی تیاری ہوتی اور لاکھوں روپے خرچ ہوتے تھے ۔ تنخواہ یاب ملازم ، جاگیردار ، منسب دار ، معمولدار اور تاجر غرض ہر ایک اپنی اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرتا تھا ۔ اور ''عید'' کے دن کے لیے شوق اور بے چینی سے انتظار کرتا رھتا تھا ۔

عید کے دن شیر خرما کے لیے دودھ کی ضرورت ہوتی تھی ۔ اس زمانے میں جس قدر گوالے تھے سب غیر مسلم تھے ۔ جو عید کے لیے بیس بیس پچیس میل کی مسافت سے دودھ لاتے تھے اور من مانی قیمت وصول کرتے تھے ۔ دووھ کی قیمت چار پانچ سیر کے برخلاف ایک سیر فی روپیہ ہو جاتی تھی ۔ اس کے باوجود گوالوں کا پورا دودھ فروخت ہو جاتا تھا اور مانگ باقی رھتی تھی ۔

عید گاہ اور مکہ مسجد میں زیادہ مجمع ہوتا تھا ۔ اس کے

علاوہ محلے کی بڑی بڑی مسجدوں میں بھی عید کی نماز کے لیے لوگ جمع ہوتے ۔ مختلف اوقات میں مسجدوں میں نماز عید ادا ہوتی ۔ چونکہ ''عید گاہ'' کی نماز سرکاری تقریب ہوتی تھی ۔ اس لیے نماز کی تفصیل کی جاتی ہے ۔ نماز کے لیے کوتوال ، قاضی، صدرالصدور جلوس کے ساتھ ہوتے تھے ۔ ہمارے بچپن میں اولاً اکبر جنگ کوتوال تھے اس کے بعد سلطان یار جنگ کو یہ منصب ملا ۔ پھر عبدالکریم خاں پھر عماد جنگ وغیرہ کوتوال بنے ۔

اول الذکر اصحاب جب تک کوتوال رہے کوتوالی کی پوری ، جمعیت ، سواروں اور عربوں کا جلوس ہمراہ ہوتا تھا ۔ اولاً سوار پھر پولیس بلدہ اس کے بعد سٹی پولیس (افغان پولیس) اس کے بعد کوتوال صاحب ہاتھی پر سوار ہوتے ۔ ہاتھی پر ایک کرسی ٹاپ دار ہوتی ، جس کو ٹاپ کہتے تھے ۔ قاضی صاحب صدر الصدور صاحب نظم جمعیت کے عربوں اور بے قاعدہ فوج کے ساتھ آتے تھے ۔ امام صاحب بھی ہاتھی پر آتے ان کے سامنے بھی کچھ عرب ہوتے تھے۔ یہ تمام سرکاری عہدے دار قدیم درباری لباس (سفید گھیر دار جامہ ۔ سفید دستار) میں ہوتے تھے ۔ سرکاری عہدےدار یعنی قاضی ، کوتوال اور صدر الصدور کے آ جانے کے بعد نماز عید شروع ہوتی ۔ پھر خطبہ شروع ہوتا ۔ دوسرے خطبے کے دوران میں امام صاحب کو شاہی خلعت پہنائی جاتی ۔ اس خلعت میں شملہ، جامہ اورکمر بند وغیرہ شامل ہوتا تھا ۔ مگر زمانۂ مابعد میں صرف ایک گراں قیمت شال دی جاتی تھی ۔ ختم نماز پر (۲۱) توپوں کی سلامی سر ہوتی اور لوگوں کی واپسی شروع ہو جاتی لوگوں کے رنگ برنگ کے ریشمی ، اونی ، سوتی کپڑے عجیب بہار دکھاتے تھے ۔

عید گاہ جانے کا راستہ اب بہت کشادہ ہوگیا ہے مگر ہمارے بچپن میں اس قدر کشادہ نہیں تھا ۔ اس زمانے میں نہ تو موٹر تھے اور نہ اس قدر کثرت سے بائیسکلیں تھیں سواریوں میں جھٹکے ،

شکرام ، شیڈو، فینس ، بروهام اور دیگر گاڑیاں تھیں ۔ بعض اصحاب ہاتھی اورگھوڑوں پر بھی آتے تھے۔ آج کل کی طرح باوجود راستہ کشادہ ہونے کے ایک رخی راستہ نہیں رکھا جاتا تھا ۔ لوگوں کی کثرت اور سواریوں کے تنوع کے باوجو ٹرافک کے انتظام میں نہ کوئی نقص ہوتا تھا اور نہ کوئی حادثہ ہوتا ۔ پولیس کو انتظام قایم رکھنے کے لیے زیادہ جد و جہد کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی ۔

نماز کو جانے سے پہلے متوسط اور اعلیٰ طبقے کے ہر گھر میں فطرہ نکالا جاتا تھا اور صبح سویرے اس کی تقسیم شروع ہو جاتی تھی - نماز کے بعد شیر خرما ، بریانی وغیرہ کے حصے دوست احباب اور رشتے داروں میں تقسیم ہوتے ۔ کسی گھر میں نئی شادی ہو تو خصوصیت سے اہتمام کے ساتھ کئی کشتیوں میں رنگ برلگ کی سویاں ، خشک میوہ، شکر مصری وغیرہ دولھا کےگھر کو جاتا تھا ۔

جس طرح ''عید گاہ'' میں گویا سرکاری نماز ہوتی تھی اسی طرح خریت آباد کی مسجد میں افسر الملک (کمانڈر انچیف) نماز کے لیے آتے تھے - یہاں بھی عید کی نماز کے بعد (۲۱) توپوں کی سلامی ہوتی تھی ۔ گویا یہ فوجی عید گاہ تھی ۔

نماز کے بعد دوست احباب ، رشتےدار اور عہدے داراں سرکاری سے عید سلاپ کا سلسلہ جاری ہوتا جو ایک دو دن نہیں بلکہ ہفتوں تک چلتا تھا۔ عید کی ملاقات کی جو بات خصوصیت سے لکھنی ہے وہ یہ ہے کہ عید کی ملاقات کے لیے مسلمان عہدے داروں کے علاوہ ہندو عہدے دار بھی اہتمام کرتے تھے ۔ ہمارے بچپن میں اولاً راجا سرلی منوہر صاحب صدر محاسب ، راجا فتح نواز صاحب سرلی دھر بخشی ، رگھناتھ پرشاد صاحب جج ہائی کورٹ اور وغیرہ راجا اندر کرن وغیرہ کے پاس ان کے ماتحت مسلمان عید کی ملاقات کے لیےآتے تھے۔ پان سپاری وغیرہ تقسیم ہوتی تھی ۔ تعجب تو اس پر ہوتا تھا کہ ہندو عہدے داروں کے پاس مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ان

کے ہندو ماتحت بھی آتے تھے گویا قومی عید ہوتی تھی ۔

مہاراجا کشن پرشاد میرے بچپن میں مدارالمہام تھے ۔ موصوف کے یہاں دیوانی کے عہدے داروں کا خاص دربار ہوتا تھا ، نذر پیش ہوتی تھی ۔ اعلیٰ حضرت کا دربار عید کے دو ایک روز کے بعد ہوتا تھا اگرچہ وقت سہ پہر یا شام کا مقرر ہوتا تھا مگر عموماً رات گزرنے یا بڑی رات گزرنے کے بعد حضور برآمد ہوتے تھے ۔ عید کی قدر کے علاوہ خطابات عطا ہوتے جس کو خطاب ملتا وہ نذر پیش کرتا ۔ یعنی ایک نذر عید کی اور دوسری خطاب ملنے کی ۔

عموماً عید کی تعطیل سرکاری دفاتر بلدہ اور اضلاع کو چار دن کی ہوتی تھی ، شب قدر کے چار دن ملا لیں تو گویا ایک ہفتے کی تعطیل ہوتی ۔ اکثر عہدے دار اور ملازمین حیدرآباد آ جاتے تھے کیونکہ تعطیل بڑی ہوتی ۔ بلا مبالغہ "عید" کے چار دن انتہائی خوشی اور مسرت کے ہو جاتے تھے ۔

عید کے روز اس کے بعد ایک ہفتے تک نوبت والے ، روشن چوکی والے ، مراثیاں (ڈومنیاں) اور طوایفیں ، جاگیرداروں اور عہدے داروں وغیرہ کے مکانوں پر جا کر عیدی لینے کے لیے ایک دو گھنٹے گا بجا کر اپنا سالانہ معمول حاصل کرتے تھے ۔ اس زمانے میں نوبت والے اور روشن چوکی والے عموماً پانچ روپیے ایک روز کی اجرت حاصل کرتے تھے ۔ عید کی مبارک باد میں بھی معاوضے میں ایک گھنٹا ان کو مل جاتا تھا ۔ البتہ مراثیاں (ڈومنیاں) اور طوایفیں تین چار گھنٹے گاتی تھیں ۔ ان کو دس بارہ روپیے سے لے کر پچاس روپیے تک انعام ملتا تھا ۔

رشتے داروں میں اور دوستوں میں عید کے دن حصے تقسیم ہوتے تھے ۔ خصوصاً سمدیانے میں جو حصے جاتے تھے وہ بڑے پر تکلف اور اہتمام سے جاتے تھے ۔ جاگیرداروں ، امیروں ، عہدے داروں میں عید کے جلسے منائے جاتے ۔ دعوتیں ہوتیں اور گانے کی محفلیں ہوتیں غرض

عیدالفطر کا جو سماں ، ہم نے بچپن میں دیکھا ہے آج ایک خواب معلوم ہوتا ہے ۔

عیدالضحیٰ بقرعید

مسلمانوں کی عیدوں میں ایک اہم عیدالضحیٰ ہے ۔ جس کو بقرعید بھی کہتے ہیں ۔ قطب شاہی دور میں بھی یہ عید بڑی شان سے منائی جاتی تھی ۔ قطب شاہ نے اپنی کئی نظمیں بھی اس عید پر لکھی ہیں ۔

آصفی دور میں ایک زمانۂ دراز تک سرکاری ملازمین کو حکومت کی جانب سے بکرے تقسیم ہوتے تھے ۔ بہ لحاظ عہدہ اور کام یہ بکرے دیے جاتے یعنی ایک دو بکروں سے لے کر سات آٹھ بلکہ دس بکرے تک دیے جاتے تھے ۔ جب دفاتر کی تنظیم ہوئی اور برٹش انڈیا کے مماثل قوانین بنائے گئے تو بکروں کا تقسیم کرنا بند ہوگیا ۔

دور آصفی میں اس عید کے موقع پر پانچ دن کی تعطیل دی جاتی تھی ؛ عرفہ کے دن ایک اور عید کے لیے چار یوم ۔ دیہات اور قصبات میں خصوصیت سے بکروں کی نگہداشت ہوتی تھی تاکہ عید کے موقع پر ان کو زیادہ قیمت سے فروخت نہ کیا جائے لیکن یہ زیادہ قیمت بھی ہمارے بچپن میں تین روپے سے لے کر پندرہ سولہ روپے تک ہوتی تھی ۔ یعنی جو بکرا اب بیس پچیس بلکہ تیس روپے میں ملتا تھا وہ تین چار انتہا پانچ روپے میں ملتا تھا ۔

عیدگاہ میں جلوس کے ساتھ قاضی ، مفتی اور کوتوال جاتے تھے ۔ جس کا تذکرہ عیدالفطر میں کیا گیا ہے ۔ عید کی ملاقاتیں ملنے ملانے وغیرہ کا جو تذکرہ عیدالفطر میں کیا گیا ہے وہ سب کچھ اسی طرح عیدالضحیٰ میں بھی ہوتا تھا ۔

حیدرآباد میں عموماً بکرے ذبح کیے جاتے تھے ۔ اونٹ اور گائے کی قربانی شاذ و نادر ہوتی تھی ۔

یہ واقعہ ہے کہ بقرعید کے موقع پر کبھی حیدرآباد یا ممالک

محروسہ نظام میں کبھی کوئی ھنگامہ اورفساد نہیں ھوا ۔ سن ۱۹۲۰ع کے بعد جس طرح ھندوستان کے صوبوں اور اضلاع میں ھنگامے اور فساد بقرعید کے موقع پر ھوا کرتے تھے یہاں کبھی نہیں ھوئے بلکہ یہاں کی ھندو مسلم رعایا اتفاق اور یک جہتی کا ثبوت دیا کرتے تھے ۔

مسلمانوں کی جن عیدوں میں حکومت آصفیہ کی جانب سے عام تعطیل ھوا کرتی تھی ان کی فہرست درج کی جاتی ھے :

(۱) محرم ۔ آٹھ یوم (۲) ربیع الاول ۔ دو یوم (۳) ربیع الثانی ایک یوم (۴) رجب ۔ ایک یوم (۵) شب معراج ۔ ایک یوم (۶) شب برات ۔ دو یوم (۷) شب قدر و عیدالفطر - آٹھ یوم (۸) عیدالضحیٰ معہ یوم عرفہ پانچ یوم ۔

دسہرہ ۔ دیوالی ۔ ھولی

مسلمانوں کی عیدوں کے تذکرے کے بعد ھندو اصحاب کی عیدوں کا تذکرہ ضروری ھے ۔ حکومت آصفیہ کے زمانے میں ھندو اصحاب کو جن عیدوں میں عام تعطیل ھوا کرتی ھے اس کی فہرست اس مضمون کے آخر میں درج ھے ۔

جس طرح مسلمانوں کی عیدوں میں عیدالفطر اور عید الضحیٰ اھمیت رکھتے ھیں ۔ اسی طرح ھندووں میں دسہرہ دیوالی ، اور ھولی اھم سمجھے جاتے ھیں ۔

دسہرے میں جلوس نکلا کرتا ، پوجا ھوا کرتے ، مسلمان اپنے ھندو دوستوں کے یہاں ملاقات کو جایا کرتے تھے ، دسہرے کے تقریبات جو عوام مناتے یعنی ''سوانگ'' بھرے جاتے اس کا سلسلہ طویل ھوتا ۔ دسہرے کی خرید و فروخت کئی دن پہلے سے شروع ھوتی ۔

ھندو اصحاب کی دوسری عید دیوالی تھی ۔ اس میں اچھی تجارت

ہوتی ۔ دوکانوں کو سجایا جاتا اور کثرت سے روشنی کرتے ۔ مسلمان ملاقات اور مبارک باد دینے آیا کرتے ۔ ایک زمانے تک بڑے بڑے تاجروں کے یہاں گانے کے جلسے ہوتے تھے ۔ ہندو اصحاب اپنے مسلمان دوستوں اور گاھکوں کو شیرینی اور مٹھائی کے حصے روانہ کرتے ۔

جس طرح دسہرہ اور دیوالی کی تقریب حیدرآباد میں مسرت اور شاد مانی سے منائی جاتی اسی طرح ہولی کی تقریب ہوا کرتی ۔ ایک زمانہ تھا کہ مہاراجا چندو لال کی بارہ دری ہولی کے تقریبی جلسوں میں راجا اندر کا پرستان بن جاتی ناچ رنگ ، رقص و سرود کے جلسے کئی دن تک ہوتے رہتے تھے ۔

مہاراجا کشن پرشاد کے زمانے میں بھی ہولی کے موقع پر یہ جلسے ہوا کرتے پرتکلف دعوتیں ہوتیں ۔

ہندووں کے ساتھ ہولی میں مسلمان بھی شریک ہوتے ۔ آج سے تقریباً دو سو سال پہلے مسلمان عورتوں کا ہولی میں حصہ لینے کی تصدیق پہلی صاحب دیوان شاعرہ لطیف النساء بیگم امتیاز کے دیوان سے ہوتی ھے ۔ جس نے اپنے دیوان کی دو غزلوں میں ہولی کا نقشہ کھینچا ھے ۔ چنانچہ دونوں غزلیں درج ھیں ۔ امتیاز کا دیوان سن ۱۲۱۲ ھجری مطابق سن ۱۷۹۸ء میں مرتب ہوا ھے اور اس کا ایک قلمی نسخہ سالار جنگ کے کتب خانے میں موجود ھے ۔ غزلیات یہ ھیں :-

دکھلائی کس مزے سے اب کے بہار ہولی
کھیلے ھیں سب جمع ہوکیا گل عذار ہولی

سارے پری رخاں نے مل کر مچائیں دھومیں
رنگ زرد و سرخ لے کر کھیلیں نگار ہولی

سونے کی تھالیوں میں رکھ کر عبیر و ابرک
بھر مٹھیاں میں ڈھینک کر ھے پکار ہولی

شیشوں میں زعفراں کا رنگ شہاب بھر کر
اوپر سے قم قموں کے ہے ساز سار ہولی

سارے طوائفینیں ناچیں ہیں کیا مزے سے
اندر صبا میں دیکھے ہو بے قرار ہولی

جب راگ کا سماع کو گاویں ہیں کس ادا سے
نکلے ہے منہ سے ان کی بے اختیار ہولی

رنگ سے ہے پھیکی آ کر مجلس بنا کر بھنیں
کیا کیا مزے سے کر کر جو اشتہار ہولی

سب جو طوائفوں پر کر کر نظر یہ کہویں
پھر کر ہمیں سنا لو اب ایک بار ہولی

پچکاری ہات لے کر ان مہوشوں سے
دھو میں مچی چہل سے کھیلا ہے یار ہولی

تو امتیاز جلدی جا کر گلے لپٹ جا
ایسے ہیں رنگ بہت یار قہار ہولی

ہم نیم جان بیک میں اوس کی جلاد نون میں
کھینچیں گے سال بھر کا پھر انتظار ہولی

کھیلے تھے پرسوں ہم نے کر سیر باغ ہولی
چلے سینکڑوں ہمارے کرنے سراغ ہولی

پہنے لباس یکسر سب سے سفید بن بن
پچکاریاں لے کھیلیں ہم بافراغ ہرلی

بی‌بی خدیجہ پہلے آئی تھی رنگ پہ اپنے
پھیکی عبیر و ابرک کر کیا دماغ ہولی

محبوب اک طرف کو لٹکے دیکھا جھمکڑے
امت الحسن ہیں گویا روشن چراغ ہولی

است الجال کیسے کھیلی تھی آ چھل سے
گلشن میں دیکھ لالہ کے داغ داغ ہولی
رنگ میں بھرانے سب کو حاضر تھی سکھو بیکم
کھیلیں برہانی بیگم ہو باغ باغ ہولی
پابند کس مزے سے ہوئیں امتیاز رنگیں
سن راگ کھیل تیرے میکا آ باغ ہولی

ہندو اصحاب کی جن عیدوں میں حکومت آصفیہ کی جانب سے عام تعطیل ہوتی تھی ۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے ۔

(۱) دسہرہ ۔ دو یوم (۲) دیوالی ۔ دو یوم (۳) تل سنکرات ایک یوم (۴) بسنت پنچمی ۔ ایک یوم (۵) سہا شیواتری ۔ ایک یوم (۶) ہولی و ہولنڈی ۔ دو یوم (۷) اکادی ۔ ایک یوم (۸) جنم اشٹمی ۔ ایک یوم (۹) راکھی پونم ۔ ایک یوم (۱۰) گنیش چوتھ ۔ ایک یوم (۱۱) اننت چودش ۔ ایک یوم (۱۲) سری رام نومی ایک یوم ۔

اس کے علاوہ سورج گہن اور چاند گہن کو ایک ایک دن کی عام تعطیل ہوا کرتی تھی ۔

میلے ، عرس اور جاترے

حیدرآباد کے میلوں عرس اور جاتروں کی مختصر صراحت ضروری ہے ۔ کیونکہ تمدن و تہذیب کلچر و ثقافت میں میلوں کا تذکرہ بھی اہمیت رکھتا ہے ۔

حیدآباد کے میلوں کا آغاز ماہ محرم ہی سے شروع ہوتا ہے ۔ کیونکہ حضرت امام حسین کے سوگ و ماتم کے سلسلے میں محرم کو تاڑ بن کا علم نکالا جاتا تھا ۔ اس کو میلہ تاڑ بن سے موسوم کیا

جاتا ہے ۔ اس کے بعد ۲۰ صفر کو عنبر پیٹھ کا میلہ ہوتا جو علموں کے چالیس دن کا سوگ تھا ۔ اس سلسلے میں سنکیسر اور مشیرآباد کے میلے ہوا کرتے تھے ۔ اگرچہ ان میلوں میں ہند و مسلم کی نمائندگی ہونے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ میلے لہو و لعب اور عیاشی کے مرکز بن جاتے تھے ۔ آصف جاہ سابع نے ان کو بند کر دیا اور حقیقی ماتم کا مرکز بنا دیا ۔ صفر کے آخری چہار شنبہ کو باغ عام اور جنگلوں میں جو مجمعے ہوتے اس کو میلے کا نام بھی دیا جانا چاہیے ۔ خصوصاً صبح سے سہ پہر تک جو جمگھٹا ہوتا اور اس کو دیکھنے کے لیے جو مجمع ہوا کرتا تھا ۔ وہ حیدرآدبا کی ایک یادگار تھا ۔ اگرچہ آخری چہار شنبہ مسلمانوں سے مخصوص تھا مگر جو مجمع ہوتا اس میں ہندو بھی شریک ہوتے تھے ۔ یعنی اچھا خاصا قومی میلہ بن جاتا تھا ۔

ماہ رجب میں عرس کوہ مولا کے موقع پر بمقام ''لنگم پلی'' تین دن تک جو میلہ لگا کرتا تھا ۔ وہ اپنا آپ نظیر تھا ۔ اس میلے میں حیدرآباد کی صنعت و حرفت مصنوعات کی گویا نمائش ہوتی تھی ۔ اور یہ میلہ خرید و فروخت کا مرکز بن جاتا تھا ۔ لنگم پلی میں تقریباً سیل ڈھیر میل دو طرفہ دوکانیں قایم ہو جاتیں اور ۱۷ رجب کو جو، میلے کا اصل دن ہوا کرتا ہزاروں اصحاب کا مجمع ہوتا تھا جس میں بوڑھے و جوان ، عورت، مرد ، بچے ، ہند و مسلم سکھ ، پارسی ، سب ہی شامل ہوتے تھے ۔ پھر امیر و غریب جاگیر دار و منصب دار ۔ تاجر و خوش باش غرض ہر طبقے اور گروہ کے اصحاب میلہ دیکھنے جاتے اور تقریباً دو ڈھائی میل آدمیوں کا بڑا اژدھام ہوتا تھا ۔ ایک زمانہ تھا کہ ہاتھی ، گھوڑوں ، رتھوں ، شکراموں کی لمبی قطار نظر آتی تھی ۔ امیر و غریب سب ہی اس میلے میں جاتے اور خرید و فروخت میں حصہ لیتے تھے ۔ یہ میلہ تین دن تک رہا کرتا تھا ۔

ان میلوں کے علاوہ چھوٹے بڑے بیسیوں میلے مختلف مقامات میں ہوتے تھے ، جن کی صراحت طوالت کی موجب ہے ۔ البتہ پنچھی کا میلہ اس لیے قابل ذکر ہے کہ یہ ہندوؤں کی مذہبی تقریب تھی مگر خورشید جاہ کی بارہ دری کے صحن میں ہوتی تھی اور سانپوں کو دودھ پلایا جاتا تھا ۔ اس کو دیکھنے کے لیے ہندوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کا بھی مجمع ہوتا تھا ۔

ان میلوں کے علاوہ بعض اور میلے بھی ہوا کرتے تھے جن کی صراحت طوالت کا موجب ہو گی ۔

عرس :

صوفیائے اکرام اور مشاہرین بزرگان دین کے عرس دکن کے کئی شہروں میں ہوتے ہیں ۔ عموماً یہ عرس تین دن ہوتے تھے ۔ یعنی صندل ، چراغاں اور فاتحہ ، گلبرگہ میں خواجہ بندہ نوازگیسودراز اور آپ کی کئی اولاد کا اورنگ آباد میں ایک عرس ہوتا ۔ بمبئی میں فقیر مخدوم علی مہاتمی کا ، مدراس کے علاقے حضرت ، تہتر اولیا، کوکم میں تمیم انصاری کا ، ناگور میں نادرولی وغیرہ کے عرس ہوتے ہیں ۔ میں نے پہلے باب میں صوفیان اکرام کی ایک فہرست دی ہے ان میں سے بیسیوں صوفیان اکرام کے عرس یہاں کے مختلف مہینوں میں ہوتے ہیں ۔ صرف ایک شہر حیدرآباد کے کئی عرس مشہور ہیں ۔ یعنی بابا شرف الدین صاحب ، یوسف شریف صاحب ، میر مومن صاحب ، میر محمود صاحب برہنہ شاہ ، اجالا شاہ ، شاہ خاموش ، آغاداود صاحب ، میر محمد حسین صاحب وغیرہ ۔

مغل پورہ میں خواجہ اجمیری کا چیلہ کے نام سے ایک قلم موجود ہے ۔ یہاں ماہ رجب کی چھٹی کو عرس ہوتا ہے ۔مرحوم اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں کے دور میں طوائفوں کا گانا بھی یہاں ہوتا تھا ۔ اور کئی عرسوں میں مینا بازار کے نام مخصوص یوم

خواتین کے نام سے ایک دن رکھا جاتا تھا ۔ ان تمام امور کی آصف جاہ سابع نے خلاف شرع ہونے کی وجہ سے ممانعت کر دی ۔ اس طرح ان کی وجہ سے ایک بدعت دور ہو گئی ۔ عرسوں میں زیارت کرنے بلا تفریق مذہب اشخاص آتے بلکہ ہندوؤں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی ۔

جاترے :

جس طرح مسلمان صوفیا کے مزاروں پر عرس ہوا کرتے اسی طرح ہندو دیویوں کے مندروں پر سالانہ جاترہ ہوا کرتی تھی ۔ رتھ کش گانا وغیرہ ہوتا ۔

حیدرآباد کے جاترے مشہور ہیں ۔ مثلاً دیول سیتا رام باغ ، دیول جھام سنگھ ، دیول الوال وغیرہ جو یہاں بڑی دھوم دھام سے جاترہ ہوتی تھی جس میں ہندو مسلمان شریک ہوتے تھے ۔

چونکہ ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے حیدرآبادی صوفیا اور مندروں کے متعلق علیحدہ کتاب شائع ہو رہی ہے ۔ اس لیے اس بات کو یہاں ختم کیا جاتا ہے ۔

ساتواں باب

موسیقی

دکن یعنی جنوبی ہند میں ہندی موسیقی کا آغاز ۱۳۰۰ ع کے اوائل سے ہوا ہے جب سلطان علاؤالدین خلجی اور اس کے سپہ سالار ملک کافور نے دکن فتح کیا تو سلطان خلجی نے دکن کے ماہر موسیقی گوپال نایک کی شہرت سنی اور اس کو دھلی طلب کیا گوپال نایک اپنے زمانے کا ایک نامور ماہر موسیقی اور باکمال صاحب فن تھا ۔ اس کے صدھا شاگرد تھے جو اس کے تخت کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر چلتے تھے ۔ گوپال شاھی مہمان کی حیثیت سے دھلی میں رھا اور دربار شاھی میں امیر خسرو سے گانا سنانے کی خواھش کی ۔ خسرو نے جواب دیا ''میں ایک مغل ھوں ہندوستانی گانا معمولی جانتا ھوں ۔ آپ ھی پہل کیجیے'' ۔ چنانچہ گوپال نے کئی راگ سنائے ۔ جن سے خسرو واقف تھے ۔ اس کے بعد خسرو نے اپنے راگ سنائے جس سے گوپال ناواقف تھے ۔ خسرو عرب اور عجم کے راگوں سے واقف تھے ، انھوں نے دونوں قسم کی موسیقی کو ترتیب دے کر ایک نیا عالم پیدا کر دیا تھا ۔ گوپال کئی سال دھلی میں مقیم رھے اور خسرو سے استفادہ کیا اور پھر دکن آ کر راگوں کو رواج دینے لگے ۔ اپنے ساتھ کئی آلات موسیقی یعنی ستار ۔ طبلہ ۔ وغیرہ بھی ساتھ لائے جن سے دکن میں کوئی واقف نہ تھا[1] ۔

دھلی کا تخت جب تغلق خاندان میں آیا اور دیوگڑھ یعنی

۱- رسالہ ''ساقی'' کراچی ۔

دولت آباد پورے هندوستان کا دارالسلطنت بنا تو دوسرے اصحاب علم و فن ، علماء اور شعرا کے ساتھ موسیقار بھی دکن آ کر بس گئے ۔ اس طرح هندی موسیقی کو ترقی ہوئی ۔ کچھ عرصے کے بعد دکن میں دو خود مختار سلطنتیں قائم ہو گئیں ۔ بہمنی اور وجیانگر۔

ان دونوں سلطنتوں میں هندی موسیقی کو بڑی ترقی هوئی ۔ خاندان بہمنی کے دوسرے بادشاہ محمد شاہ کو موسیقی سے بڑی دلچسپی تھی اس کے دربار میں دهلی سے تین سو ۳۰۰ قوال آ کر امیر خسرو کا کلام سناتے تھے ۔ تاریخوں[1] سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ اس کے بعد عام طور سے موسیقی سے دلچسپی ہو گئی تھی اور شرفاء کی عورتیں خواہ امیر ہوں یا غریب اس فن کو حاصل کرنے میں پس و پیش نہیں کرتی تھیں ۔ چنانچہ تغل چین جو ایک بڑا امیر تھا اس کی دختر کے نہ صرف حسن و جمال میں عدیم‌المثال ہونے کا ذکر ملتا ہے بلکہ اس کے موسیقی میں ماهر ہونے کا حال بھی موجود ہے[2] ۔ اس طرح مدگل کے سنار کی لڑکی پرتھا کے فن موسیقی میں کمال پیدا کرنے کا حال تاریخوں میں درج ہے ۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ برهمن جس نے پرتھا کو موسیقی کی تعلیم دی علم موسیقی میں کمال رکھتا تھا اور آلات نغمہ کو خوب بجاتا تھا اس نے ایک سال تک مدگل میں قیام کیا اور پرتھا کو نغمہ نوازی کی پوری تعلیم دی ۔ پرتھا کی شادی سلطان نے اپنے فرزند حسن خان سے کر دی تھی اور شہزادہ حسن خان بھی عیش و عشرت کا دلدادہ تھا اس کی عیش و عشرت کی داستان طویل ہے اس کے گرد و پیش اهل موسیقی کا جمگھٹا ہوتا تھا ۔ بادشاہ نے اس کو اپنا ولی عہد مقرر کرنا چاها مگر پبلک نے اس کو قبول نہیں کیا

۱۔ ''تاریخ فرشتہ''

۲۔ ترجمہ ''تاریخ فرشتہ'' صفحہ ۷۸

اور اس کے بجائے بادشاہ کا بھائی احمد خان بادشاہ بن گیا ۔ بہمنی خاندان کے ایک اور بادشاہ محمود شاہ بہمنی سنہ ۸۸۷ھ تا ۹۹۲ھ (سنہ ۱۳۸۸ع تا سنہ ۱۸۱۵ع) کے زمانے میں بھی موسیقی کا بڑا عروج ہوا ۔ اس خصوص میں مورخ فرشتہ نے جو صراحت کی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ بادشاہ ساقی اور شراب کا متوالا تھا ۔ دن رات عیش و عشرت میں مشغول رهتا تھا ۔ عراق ، خراسان ، ماورالنہر، لاہور دھلی، غرض جس جگہ کے بھی رقاصہ اور ارباب موسیقی اور سازندے وغیرہ مشہور اور اپنے فن میں یگانہ ہوتے وہ دکن آتے اور بادشاہ کی سرپرستی سے نہال ہو جاتے ۔ احمد آباد اور بیدر - ایران اور توران سے بازی لے گیا تھا ۔ بیدر کے باشندے چھوٹے بڑے امیر و غریب سب ہی بادشاہ کی تقلید میں ساقی اور شاهد شراب و کباب اور موسیقی کے دلدادہ بن گئے تھے[۱] ۔

بہمنی سلطنت کے بعد دکن میں کئی خود مختار سلطنتیں قائم ہوئیں ۔ جن میں زیادہ مشہور بیجاپور کی عادل شاہی ، گولکنڈہ کی قطب شاہی اور احمد نگر کی نظام شاہی سلطنتیں ھیں ۔ ان خاندانوں کے کئی بادشاہ موسیقی سے دلچسپی لیتے رہے ۔ چنانچہ عادل شاہی حکومت کے بانی یوسف عادل شاہ کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ اس کو موسیقی سے بڑی دلچسپی تھی اور اس کی موت بھی اسی سلسلے میں واقع ہوئی فرشتہ لکھتا ہے کہ بیجانگر سے جنگ کے لیے یوسف عادل شاہ روانہ ہوا ، دریا کرشنا کے کنارے شاہی کیمپ قائم ہوا اور بادشاہ نے مجلس نشاط منعقد کی ۔ عیش پرستی اور نغمہ نوازی میں دن رات منہمک ہوگیا ۔ اس زمانے میں موسیقی کے دو استاد فن جو قانون سنانے اور دوسرے آلات موسیقی کے بجانے میں بڑی مہارت رکھتے تھے ۔ استاد گیلانی اور حسین قزوینی اس وقت حاضر دربار تھے -

---

۱۔ ترجمہ ''تاریخ فرشتہ'' صفحہ (۲۲۰)

انھوں نے فارسی کی ایک دل کش غزل گائی جس کا مطلع تھا :

بوئے پیراھن یوسف ز جہاں گم شدہ بود
عاقبت سوز گریبان تو بیروں آورد

بادشاہ کو غزل اس قدر پسند آئی کہ دونوں استادوں کو چھ ہزار ھن جو تین سو عراق توسان کے برابر ھوتے تھے خزانۂ عامرہ سے دلوائے[۱]۔ اس کے بعد ابراھیم عادل شاہ ثانی کا زمانہ آتا ھے ۔ جو نہ صرف موسیقی کا بےحد شایق اور دلدادہ تھا بلکہ خود بھی موسیقی کا ماھر اور استاد فن تسلیم کیا جاتا تھا ۔ اس کی مہارت فن کا ایک ادنیٰ ثبوت اس کی کتاب ''نورس'' ھے جس میں کئی رنگ اور راگنیوں کے لیے گیت موزوں کیے ھیں ۔

ابراھیم نہ صرف ماھر موسیقی تھا بلکہ شاعر بھی تھا اور علم و ھنر کا بھی قدر دان تھا ۔ اس کے دربار میں مشہور مورخ فرشتہ نے رسائی پائی تھی اور اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''تاریخ فرشتہ'' قلم بند کی ۔

فرشتہ نے سلطان ابراھیم کی موسیقی کے متعلق کوئی صراحت نہیں کی ھے۔ البتہ دوسرے مورخ جو زمانۂ مابعد سے تعلق رکھتے ھیں انھوں نے ابراھیم کی مہارت موسیقی کی تفصیل کی ھے چنانچہ ''بساطین السلاطین'' کا مورخ لکھتا ھے :-

''ابراھیم عادل شاہ کوکم عمری سے موسیقی کا شوق تھا اور فطری طور سے اس کو موسیقی سے (رغبت تھی) تھوڑے ھی عرصے میں موسیقی میں ماھر فن بن گیا ۔ اس زمانے کے تمام اھل فن موسیقی سے زیادہ مہارت حاصل کر لی تھی اور عالم میں مشہور ھوگیا ۔ اکثر حصوں سے ماھر موسیقی جمع ھوگئے ۔ تین چار ہزار ماھر موسیقی بیجاپور میں اکھٹے تھے۔

۱- ترجمہ ''تاریخ فرشتہ۔''

اکثر لوگ ابراھیم کو فیثاغورث ثانی کہتے تھے ۔ فیثا غورث موسیقی کا بانی کہلاتا ہے[1] ۔

سلطان کے دربار میں قوالوں کے تین گروہ تھے۔ ان کو شاگردان سلطان کہتے تھے ۔ پہلے گروہ کو حضوریان ، دوسرے گروہ کو درباریان اور تسیرے کو شہریان سے موسرم کیا گیا تھا ۔ حضوریان رات دن بادشاہ کے گرد و پیش رہا کرتے تھے اور بادشاہ سے موسیقی کا استفادہ کرتےرہتے تھے ۔ جو ارباب موسیقی شہر نورس میں رہتے تھے اور درباریوں سے اکتساب فن کرتے تھے ۔ ان کو شہریان سے موسوم کیا گیا تھا ۔ ''حضوری'' قوال بادشاہ سے براہ راست موسیقی کا استفادہ کرتے تھے اور ان سے درباری گروہ مستفید ھوتا اور ان سے تیسرا گروہ متمتع ھوتا تھا ۔ تینوں گروھوں کی تنخواھیں مقرر تھیں اور روزینہ ملتے تھے ۔ اس طرح تمام ارباب موسیقی فراغت سے گزران کرتے تھے[2]۔

دکن میں قدیم الایام سے گانے بجانے کی رسم شمالی ھند کے اور اقطاع کی بہ نسبت زیادہ رھی ۔ اس فن میں انھوں نے اکثر نئے آلات اور گانے بجانے کے اچھے اچھے قواعد ایجاد کیے اور ھمیشہ اس ملک میں اس فن کا چرچا رھا ۔ ابراھیم عادل شاہ ثانی بھی گانے بجانے کی طرف رجوع ھوگیا ۔ چونکہ ذھن کا تیز اور صاحب ادراک سلیم تھا ۔ اس نے اس ھنر کو خوب سیکھ لیا اور ایسی مہارت بہم پہنچائی کہ فن موسیقی میں بے مثل ھوگیا اور نئے نئے قواعد اس فن میں ایجاد کرنے لگا۔ بادشاہ کے پاس رسوخ حاصل کرنے اور کسب معاش کے لیے صدھا امراء و شریف زادے مطرب اور گویے بن گئے تھے اور ان شاگردوں کی تعداد تین چار ھزار تک پہنچ گئی

---

۱ - ۲ - ''بساطین السلاطین'' صفحہ ۲۵۱ تا ۲۵۲

تھی ۔ انھیں شاگردوں کے لقب کے علاوہ ''لشکر نورس'' بھی کہتے تھے ۔ عید نورس کو یہ سب جمع ہوتے ابراھیم محل نورس میں دربار عام کرتے ۔ گویے ، سازندے اور نوازندے اپنا اپنا کمال دکھلاتے [1] ۔

شہر کے تمام عاید ، اکابر اور خورد و بزرگ وہاں آتے اور محفل میں شریک ہوتے تھے ۔ اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ نہ صرف ابراھیم عادل شاہ کو موسیقی میں کمال حاصل تھا بلکہ اس زمانے میں شرفاء اور امراء بھی اس فن کو حاصل کرتے اور کمال پیدا کرتے تھے ۔ لیکن اس کے باوجود اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ اھل علم اور اصحاب فضل اس کو ایک حد تک معیوب تصور کرتے تھے ۔ کیونکہ ابراھیم کے زمانے کے مورخ فرشتہ نے اس خصوص میں کوئی صراحت نہیں کی ہے ۔ حالانکہ اس نے ابراھیم کے زمانے میں اپنی تاریخ لکھی ہے اور بادشاہ کے دوسرے جزئی امور بیان کیے ہیں ، مگر موسیقی کے متعلق کوئی صراحت نہیں کی ۔ اس سے پایا جاتا ہے کہ غالباً اصحاب علم و فضل اس ہنر کی قدر نہیں کرتے تھے یا خود بادشاہ جس کے حکم سے ''تاریخ فرشتہ'' قلم بند ہوئی ہے وہ اس کو پسند نہیں کرتا تھا کہ اس کا اظہار تاریخ میں کیا جاتے ۔ ابراھیم کی مہارت فن موسیقی کا ثبوت اس کی تصنیف ''نورس'' سے بھی ملتا ہے ۔ ''نورس'' دراصل گیتوں کا مجموعہ ہے ۔ جو مختلف راگ اور راگنیوں کے تحت لکھے گئے ہیں ۔ چنانچہ جن راگ اور راگنیوں کی اس میں صراحت ہے حسب ذیل ہیں ۔

بھوپالی ، نوروز نورس ، بھیرویں ، کیز ، ویسے ، پورنا ، برانیہ ، ملار ، توزی ، گوری ، کلیان وغیرہ ایسے راگ ہیں جن سے آج کوئی واقف نہیں ہے ۔

---

۱ - ''بساطین السلاطین'' ۔

سلطان ابراهیم عادل شاہ کے بعد محمد عادل شاہ اور علی عادل شاہ ثانی اور پھر سکندر عادل شاہ کا زمانہ آتا ہے ۔ اگرچہ ان بادشاہوں میں خصوصاً علی عادل شاہ کی مہارت موسیقی کا ثبوت ملتا ہے کیونکہ اس کے کلیات میں بھی بعض گیت موجود ہیں ۔ مگر ابراہیم عادل شاہ کی طرح کسی نے توجہ نہیں کی اور مہارت نہیں پیدا کی ۔ سکندر عادل شاہ پر حکومت عادل شاہی کا خاتمہ ہوجاتا ہے ۔

عادل شاہی حکومت کے ساتھ ساتھ قطب شاہی دور پر بھی نظر کرنا ضروری ہے ۔ یہاں بھی سلطان محمد قلی قطب شاہ اور اس کے نواسے عبداللہ کے زمانے میں موسیقی کی جانب بہت زیادہ توجہ ہوئی ہے ۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ فطرتاً رند مشرب شاہد و ساقی کا دلدادہ حکمران تھا ۔ ماہ رمضان اور محرم کے سوا اس کی زندگی کے بہت کم لمحے ایسے ہوں گے جب شاہد اور ساقی اس سے دور رہتے ہوں ۔ ایسے شخص کا موسیقی اور رقص سرود سے دلچسپی نہ لینا ایک تعجب خیز امر ہوگا ۔ چنانچہ سلطان محمد قلی کو موسیقی سے پوری دلچسپی تھی اور اس مہارت کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ اس نے کئی گیت لکھے ہیں جو مختلف راگ اور راگنیوں میں گائے جاتے تھے ۔ ارباب موسیقی دور دور سے حیدرآباد آ کر بادشاہ کی فیاضی سے بہرہ ور ہوتے تھے ۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ کے بعد جب محمد قطب شاہ کا دور آیا تو موسیقی کی قدر دانی بند ہوگئی ۔ مگر اس کے بعد جب سلطان عبداللہ شاہ مسند حکومت پر بیٹھا تو اس کے دور میں پھر سے راگ رنگ رقص و طرب کا ہنگامہ بلند ہوگیا ۔ دور دور سے ارباب موسیقی حیدرآبار آتے تھے ۔ اس زمانے میں موسیقی کا جو دور دور شہرہ تھا اس کا اندازہ پروفیسر صدیقی کے الفاظ میں پڑھنے کے قابل ہے :

''سلطان عبداللہ کو رقص و سرود کا بہت شوق تھا چنانچہ

مقامی عیش و عشرت کے علاوہ لاہور ، آگرہ ، برہان پور سے عیش و عشرت کا سامان جمع کیا جاتا تھا ۔ ظاہر ہے کہ اس شاہی زندگی کا اثر عوام پر بھی پڑتا ہے چنانچہ گولکنڈہ اور حیدرآباد میں رقص و سرود کی محفلیں عام ہونے لگیں ۔ عیش و عشرت کی گرم بازاری ہوگئی ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کی کوئی تقریب خواہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی بغیر طوایف اور رقص و سرود کے نہیں ہوتی تھی ۔ جو ابوالحسن تانا شاہ کے عہد میں بھی جاری رہی[۱] ''۔

اس خصوص میں ''حدیقة السلاطین'' کے مصنف نے جس سے صدیق صاحب نے مواد حاصل کیا ہے اس کی وضاحت کا اقتباس بھی دلچسپی کا موجب ہوگا وہ لکھتا ہے :

''سطان عبداللہ کے زمانے میں تلنگانہ کے رقاص اور کارندان کرناٹک کے مہ و شان اور خوش صورت ، احمد آباد کے زیبا شمائل اور لاہور اور کابل کے صبیح چہرہ آگرہ کے ملیح حسن والے ۔ برہان پور اور منڈل کے ماہر فن موسیقی حیدرآباد میں جمع ہوگئے تھے ۔ ان میں سے ہر ایک فن موسیقی کا ماہر اور یکتائے بے ہمتا تھا[۲] ''۔

سطان عبداللہ کو موسیقی سے جو شغف تھا اس کا یہ نتیجہ تھا کہ گولکنڈہ اور حیدرآباد ارباب موسیقی سے بھرپور تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی موسیقی زیادہ تر ''طوایفین'' سے متعلق ہوگئی تھی ۔ چنانچہ جو حالات سلطان عبداللہ کے زمانے کے معلوم ہوئے ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ طوایفین کی کثرت تھی ۔ عیش و عشرت اور خوشی کے جلسوں اور تقاریب سے قطع نظر مذہبی

۱- ''تاریخ گولکنڈ'' صدیقی صفحہ ۲۷۳ - ۲۷۴ -
۲- ''حدیقة السلاطین'' صفحہ ۳۶ -

تقاریب میں موسیقی لازمی تصور کی جاتی تھی ۔

چنانچہ عید میلاد کے موقع پر جو جشن یکم ربیع الاول سے ۱۲ تک منعقد ہوتا تھا اس کا حال حسب ذیل ہے :-

اس موقع پر شاہی محلوں اور ایوان کے علاوہ بیرونی میدانوں میں عظیم الشان شامیانے لگائے جاتے اور ان کو اسباب آرایش سے آراستہ کیا جاتا ۔ روشنی کا بہت زیادہ اہتمام ہوتا بیرون ملک سے منتخب مہ جمال رقاصائیں طلب کی جاتیں ۔ خاص محل کی طوایفیں اور دوسرے گانے بجانے والوں کو ایک خاص قسم کا لباس مرحمت ہوتا اور یہ سب سرخ لباس میں بادشاہ کے ہمراہ ہوتے ۔ ۱۲ دن تک یہ ماہر فن رقاصائیں اور نغمہ طراز مہ جبینیں اپنے ناچ اور گانوں سے محفل کو گرماتیں اور اس طرح مجلس عیش و نشاط برپا رہتی تھی ۔ ان کے دیکھنے کے لیے عام اجازت تھی ۔ شہر کی تمام مخلوق رات دن یہاں جمع رہتی[1] ۔

عید میلاد کے علاوہ عید بعثت نبی ، عید مولود علی ، عید غدیر ، شب برات ، عیدالفطر ، عیدالضحیٰ وغیرہ کے موقع پر بھی محفل رقص و نشاط برپا ہوا کرتی ۔ جب مذہبی جلسوں میں رقص اور سرود کی یہ گرم بازاری ہوتی تو پھر دوسری شاہی تقریبوں ، سال گرہ ، نو روز اور ہولی وغیرہ کے موقع پر کیا کچھ نہ ہوتا ہوگا ۔ غرض کہ اس زمانے میں حیدر آباد کی فضائیں نغمہ و طرب سے معمور ہوگئیں تھیں ۔

جیسا کہ قبل ازیں تذکرہ کیا گیا ہے ۔ اس زمانے میں موسیقی کی وجہ سے طوایفین کی بڑی قدر و منزلت ہوتی تھی ۔ اور ان کی کثرت ہوگئی تھی ۔ چنانچہ بہ قول فرانسیسی سیاح ٹرنر گولکنڈہ میں بیس ہزار طوایفین آباد تھیں اور ان کا نام باضابطہ رجسٹر میں

۱۔ ''تاریخ دکن'' سلسلہ آصفیہ جلد دوم صفحہ ۳۲۴

درج تھا ان میں سے بعض موسیقی کے ساتھ ورزشی کمالات کی بھی ماہر تھیں ۔ ٹرلر کے بیان کا اقتباس حسب ذیل ہے :

"شہر ، اطراف شہر اور قلعہ میں جو ایک جدا شہر ہے طوایفیں اس قدر کثرت سے ہیں کہ داروغے کے رجسٹر میں ان کی تعداد بیس ہزار سے زیادہ مندرج کی گئی ہے اور رجسٹر میں درج ہونے کی وجہ یہ ہے کہ رجسٹر میں اپنا نام بغیر درج کرائے کوئی عورت اپنا پیشہ (گانا اور بجانا) نہیں کرسکتی تھی ۔

جمعہ کے دن کچھ طوایفیں اپنے آلات کے ساتھ چوک میں بالا خانۂ شاہی کے رو برو حاضر ہوتیں ۔ اگر بادشاہ موجود ہو تو وہاں گاتی ناچتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان عورتوں کے جسم ایسے نرم اور چست و چالاک اور ورزشی ہوتے ہیں کہ جب بادشاہ موسلی پٹن گیا تو ان میں سے نو عورتیں بڑی چالاکی سے ہاتھی کی صورت بن گئیں[۱]۔"

سطان عبداللہ کو نہ صرف موسیقی کا شوق تھا بلکہ وہ خود بھی ماہر فن موسیقی تھا ۔ اس کے مہارت فن کا ثبوت گیتوں سے مل سکتا ہے جو اس نے راگ اور راگنیوں میں گانے کے لیے موزوں کیے تھے ۔ چنانچہ ان سے حسب ذیل راگ اور راگنیوں کا پتہ چلتا ہے ۔

بھاگڑہ ، کانڑا ، کیدار ، رام گیری ، بھری گوری ، اننت کلیات ، دھناسری ، بھری اساری ، ملہار ، بلاول ، سیندھوا ، سالگورا ، ملتانی ، دھناسری کانی ، اساودی ، سری راگ ، زھیر تلنگی ، پدماوتی ، گوری بست ، مادری سری راگ ، تورمی سارنگ "۔

اس سے واضح ہو گا کہ سلطان عبد اللہ کو کس قدر مہارت تامہ حاصل تھی ۔ سلطان عبد اللہ کے بعد ابو الحسن تانا شاہ کا دور

۱۔ ترجمہ سفر نامہ ٹرلر صفحہ ۹ ۳

آتا ہے ۔ اس کے زمانے میں بھی موسیقی کی قدر دانی ہوتی تھی ۔ جو ارباب موسیقی شاہی ملازم تھے ان کو تنخواہ دی جاتی تھی ۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ تین لاکھ (۳۲) ہزار روپیہ سالانہ اس کے مصارف ہوتے تھے ۔ چنانچہ ''تاریخ ظفرہ'' میں جوآمد و خرچ بتایا گیا ہے اس میں اس کا اندراج ہے[1] ۔

احمد نگر میں نظام شاہی حکومت میں حسین نظام شاہ اور برہان نظام شاہ موسیقی کے قدردان تسلیم کیے گئے ہیں ۔ ان کے زمانے میں احمد نگر میں موسیقی کو عروج ہوا ۔

جب پورا دکن مغلیہ قلم رو میں شامل ہو گیا اور عالم گیری عمل داری ہو گئی تو چونکہ عالم گیر کو موسیقی سے کوئی دلچسپی اور رغبت نہیں تھی اس لیے موسیقی پر اوس پڑ گئی اور ارباب موسیقی منتشر ہو گئے ۔

عالم گیر کے انتقال کے بعد موسیقی کی جانب پھر سے توجہ ہونے لگی ۔ نہ صرف پیشہ ور بلکہ اصحاب علم بھی فن موسیقی سے دلچسپی لینے لگے تھے ۔ چنانچہ وجیہہ الدین وجدی صاحب ذوق اور صاحب حال وقال بزرگ تھے ۔ جنھوں نے شیخ عطار کی دو مثنویوں کو فارسی سے دکنی میں ترجمہ کیا ہے ۔ اس کی تیسری مثنوی ''باغ جانفزا'' سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ موسیقی میں کافی مہارت رکھتے تھے ۔ اس وجہ سے انھوں نے کئی آلات موسیقی اور کئی راگوں کا تذکرہ اپنی مثنوی میں کیا ہے ۔ گانے والوں کے اقسام مثلاً طوائفین ، کسبیاں ، ڈومنیاں ، رام جنوں وغیرہ بتائے ہیں ۔ اسی طرح راگوں اور سازوں کی صراحت کے ساتھ اداؤں کا بھی تذکرہ کیا ہے ۔ اس کی وضاحت سے اس امر کا صاف پتہ چلتا ہے

---

۱ ۔ ''تاریخ ظفرہ'' مطبوعہ صفحہ ۱۷۵ ۔

کہ موسیقی میں وجدی کو مہارت حاصل تھی ا۔

اسی طرح اس کے متعلق خواجہ خان حمید تخلص جس نے ''گلشن گفتار'' کے نام سے شعراء کا تذکرہ قلم بند کیا ہے ۔ فتوت نے بھی اپنے تذکرہ ''ریاض حسنی'' میں اس امر کی صراحت کی ہے ۔خواجہ خان کو موسیقی میں اچھی مہارت حاصل تھی ۔ ایک دوسرے ماہر فن موسیقی سید عبد الولی عزلت تھے ۔ جن کا تفصیلی حال ہم کو معلوم ہے ۔یہاں مختصر صراحت کی جاتی ہے :

سید عبد الولی عزلت شاہ سعد اللہ کے فرزند تھے ۔ سنہ ۱۱۰۴ ھجری میں تولد ہوئے ۔ بعد تعلیم اپنے وطن سورت سے نکل کر اورنگ آباد آئے ۔ پھر دھلی اور مرشد آباد کی سیر کرتے ہوئے حیدرآباد آ کر قیام کر لیا ۔ ناصر جنگ ، صلابت جنگ اور نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے درباروں میں رسائی تھی ۔ ثانی الذکر نےجاگیر بھی دی تھی ۔ عزلت شاعر بھی تھے اور موسیقی دان بھی ۔ مصوری میں بھی مہارت حاصل تھی اور خطاطی میں بھی ان علوم کی باضابطہ تعلیم کے لیے انھوں نے اپنے مکان میں ایک مدرسہ قایم کیا تھا اور شاگردوں کو ان علوم کا درس دیا کرتے تھے ۔ فن موسیقی میں جو مہارت تھی اس کی صراحت مورخوں نے یوں کی ہے کہ وہ کئی سازوں کے استاد تھے ۔ قانون ، سرور ، ارغن کے دقیق نکات اور ان کے رموز کے بڑے ماہر تھے ۔ زیر و بم و تان و سر عمدہ طرح سے ملاتے تھے ۔ اس زمانے میں جس قدر صاحب فن موسیقی تھے ۔ وہ عزلت کی استادانہ مہارت فن کی معترف تھے ۔ قدرت نے گلا بھی عمدہ عطا کیا تھا ۔ عزلت نہ صرف ماہر موسیقی تھےبلکہ وہ موسیقی کے شائقین کو فن موسیقی کی تعلیم بھی دیا کرتے تھے ۔ عزلت کا حال قدیم و جدید تذکروں میں بصراحت موجود ہے ۔

۱- وجدی محمد بن عمر ۔

ان کے هم عصر مورخ لاله لچھمن نارائن شفیق نے ان کی موسیقی دانی کے متعلق جو صراحت فارسی مین کی ہے - اس کا ترجمه یه ہے :

فن موسیقی و سنگیت اور دستے میں خوب مہارت رکھتے ہیں۔ اس فن کے جو ماہرین ہیں ان کی موسقیی دانی کا اعتراف کرتے ہیں۔ علم دوھر اورگیت میں بھی دریا کی طرح موجیں مارتے ہین - اور ایسا سمندر ہیں جو متلاتم ہو ۱۔

عزلت کی موسیقی میں یاد گاروں کی مثنوی ''راگ مالا'' بھی ہے -جس کی مختصر صراحت بیان کی جاتی ہے -

راگ مالا ایسی نظموں کا مجموعه ہے جو راگ راگنیوں سے متعلق ہے - اس میں چھ راگ ہیں اور ہر ایک راگ میں پانچ راگنیاں اور ہر راگنی کے آٹھ حصے کیے گئے ہیں -

راگوں کی تفصیل یه ہے

(۱) بھروں راگ اور بھیرویں ، بلاولی ، براری ، کامودی ، بنگالی -

(۲) مال کواس راگ (گوند گیری ، گندھاری ، گند براتی - سروسنی ، دھن سازی) -

(۳) ھنڈول (تلنگی) دیو گیری ، بسنتی ، سندھوری ، آہری -

(۴) سری (کرنالی ، کوس ، اساوری ، سندھوری -

(۵) دیپک (ورنا کلی ، پٹسجری ، توڑی کہاڈی ، گرجری -

(۶) میگ (سورتی) ، گونڈ ، دھاتی ، کنکائی ، سویا -

اس زمانے میں موسیقی سے جو دلچسپی تھی اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے که موسیقی کے شوقین حضرات موسیقی کی محفلیں

۱- ''چمستان شعراء'' صفحه ۴۵۵ ۔

هفته وار منعقد کرتے تھے ۔ چنانچہ اس زمانے کے ایک امیر اعتقاد الدولہ لشکر جنگ کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ ہر دوشنبہ کی رات ان کے یہاں محفل موسیقی منعقد ہوتی تھی۔ اس زمانے کی موسیقی کی دو اور کتابوں کا تذکرہ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے ۔ ایک کتاب ''مفرح القلوب'' اور دوسری ''فتح المجاهدین'' کے نام سے موسوم ہے ۔ یہ ٹیپو سلطان کے حکم سے سری رنگ پٹن میں تیار ہوئی تھیں ۔ ہم علیحدہ علیحدہ دونوں کا تعارف کراتے ہیں ۔

(۱) فتح المجاهدین :

یہ کتاب فارسی میں قلم بند ہوئی ہے ۔ اس کے مصنف میر عالم (دیوان حیدرآباد) کے بھائی زین العابدین ہیں ۔ اس میں فوجی قواعد اور ضابطہ اور فنون جنگ کا تذکرہ فارسی میں کیا گیا ہے ۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ فوجی باجوں اور ارغنوں میں گانے کے لیے اردو گیت اور گانے بھی درج ہیں ۔ جن اوقات میں ان کو بجایا جاتا ہے ، اس کی بھی صراحت ہے ۔ بہ الفاظ دیگر کر یہ کہا جا سکتا ہے ۔ کہ مغربی آلات موسیقی میں مشرقی راگ گانے اور ان کے اوقات درج ہیں ۔

حال ہی میں یہ کتاب پاکستان کے ایک وزیر نے شائع کر دی ہے ۔نمونہ پیش ہے ۔

وقت آهسته قدم

ملک ہندوستان میں دیں کا وہی سلطان ہے
غرق جس کے آب خنجر میں فرنگستان ہے
کب ہے نسبت جاہ وحشمت میں سکندر سیں تجھے
بارگاہ قدر کا دارا ترا دربان ہے
ہے وہی انسان کامل جس میں ہو معنی کی بو
نقش بے بائیں وگرنہ صورت انسان ہے

طلوع صبح کے وقت ترقی پر

صبح دم ہے اے مجاهد خواب سوں بیدار ہو
طاعت حق واسطے جلدی سے تم هشیار ہو

ترقی دوم

جب مہیا وقت محنت هوویں یکسر جاهدین
مثل بسمل هوں طپاں دهشت سوں هر دم مشرکین

وقت اجتماع به نغمۂ اصغر

عجب تئیں حکم سےسلطان کے ہوے جمع کر پکھا
فلک پر جوں ثریا آفتاب و ماہ و اختر ها

بوقت تبدیل فوج (توری)

بلبل ثنا کرے ہے جب گل کے گلستاں میں
میں خلق کا ترے وصف کہتا پھروں جہاں میں
گر باد خاق تیرا گزرے چمن کے دل پر
هر خار بار لاوے صد دست گل خزاں میں
طاق بلند نسیاں ہے جائے نام کسریٰ
شہرہ ہوا ترا عدل از بس کہ اب جہاں میں

(۲) مفرح القلوب :

اس کے مصنف حسن علی عزت ہے اور سنہ ۱۱۹۹ع میں کتاب مرتب ہوئی ہے ۔ یہ کتاب قدیم اردو میں اور موسیقی سے متعلق ہے اس میں راگ راگنیوں اور گیتوں کا تذکرہ ہوا ہے ۔ راگ اور راگنیوں کے جدید نام رکھے گئے ہیں ۔ کتاب ایک مقدمہ ، چھ باب

اور خاتمے پر مشتمل ہے ۔

مقدمے میں ''صدا'' (آواز) کی گردش اور اس کے اقسام کا ذکر ہوا ہے ۔ پہلے باب میں نغمہ ابیض ، اس کے اصول اور ضرب طرز غنا اور اس کے اوقات وغیرہ رکھے گئے ہیں ۔

دوسرے باب میں نغمۂ اصغر اس کے اصول ضرب ۔ طرز ۔ وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے ۔

تیسرے باب میں نغمۂ احمر اس کے اصول و ضوابط ۔ ضرب اور طرز وغیرہ کا بیان ہوا ہے ۔

چوتھے باب میں نغمۂ زبر جد اس کے اصول اور طرز وغیرہ کا حال لکھا ہے ۔

پانچویں باب میں نغمۂ وادداا اور اس کے متعلقات درج ہیں ۔

چھٹے باب میں نعمۂ عباس اور اس کے لوازم وغیرہ کا ذکر ہوا ہے ۔ خاتمے میں ایسے گیت اور غزلیات درج ہیں جو مذکورہ چھ نغموں میں گائے جانے کے قابل ہیں ۔

صدرالذکر صراحت سے واضح ہو سکتا ہے کہ ٹیپو سلطان نے نغموں اور راگوں کے نام بھی تبدیل کر دیے تھے۔ راگوں کے نام کے علاوہ راگنیوں کے نام بھی تبدیل کر دیے ہیں طرز سلطانی ۔ طرز سروری ۔ طرز سروش اور طرز سو ناژل کے ذیل میں غزلیات درج ہیں - ان کتابوں کے علاوہ ایک اور کتاب کا تذکرہ ضروری ہے جو ''لنہس رس'' کے نام سے موسوم ہے اور سنہ ۱۲۰۰ ہجری میں مرتب ہوئی ۔ حیدر آباد کے ریزیڈنٹ ولیم پیٹرک کی خواهش پر یہ کتاب هندی میں ترجمہ کی گئی ہے ۔ بخشو نایک نے سلطان بہادر گجراتی کے ایما پر اس کو هندی میں مرتب کیا تھا ۔ دو هزار سے زیادہ راگ اور راگنیاں درج تھیں ان کے منجملہ ایک هزار دھرپد چار راگ اور (۹۴) راگنیوں کو سب سے بہتر تصور کیا گیا تھا ۔ اس میں صرف ایک سو دھرپد اور هر ایک راگ اور راگنی سے دو دو

دھرپد اس میں درج ہوئے ہیں اس کا قلمی نسخہ کتب خانۂ آصفیہ حیدر آباد میں موجود ہے ۔

مصنف ''گلزار آصفیہ'' نے جو تاریخ دکن کی معتبر کتاب شمار کی جاتی ہے دکن میں موسیقی کا کچھ حال بھی درج کیا ہے ۔ گویا تقریباً ایک سو سال کی موسیقی کا حال اس سے واضح ہو جاتا ہے ۔ اس کی صراحت سے ظاہر ہوتا ہے کہ شمالی ہند کے مشہور ماہر فن موسیقی تان سین کے خاندان کا ایک فرد نعمت خان محمد شاہی دربار میں پانچ ہزاری منصب سے سرفراز تھا ۔ اور فن موسیقی میں یگانۂ روزگار مانا جاتا تھا ۔ اس کے نواسے فیروز خان نے اپنے نانا سے اس فن کو حاصل کیا تھا ۔ اور بڑی نام آوری حاصل کر لی ۔ اس کو موسیقی کی مہارت کے لحاظ سے ثانئی ابوالنصیر فارابی کہتے تھے اس کے شاگردوں کی تعداد پانچ سو تھی ۔ ان میں سے ہر ایک ماہر فن تھا ۔ فیروز خان کے شاگردوں میں کریم خان جو اس کا قریبی عزیز تھا سب میں زیادہ مشہور اور سب سے زیادہ ماہر فن تسلیم کیا گیا تھا ۔ سنہ ۱۱۰۰ ہجری کے آخر میں کرنول کے ایک نواب عبدالحلیم خان نے اس کو دکن طلب کر کے اپنے یہاں ملازم رکھا ۔ مگر چونکہ عبدالحلیم خان فن موسیقی سے بالکل ناواقف تھا اور کریم خان کے فن کی قدردانی نہیں ہوتی تھی ۔ اس لیے کریم خان عبدالحلیم خان کی ملازمت سے کنارہ کش ہو کر حیدر آباد آ گیا اور یہاں ایک امیر شکوہ جنگ کی ملازمت کرلی ۔ شکوہ جنگ اس زمانے میں ماہر فن موسیقی سمجھے جاتے تھے ۔ کریم خان کی باقی زندگی ان کے توسل میں گزر گئی ۔ کریم خان کے دو لڑکے تھے ۔ رضا خان اور خوش حال خان ۔ ثانی الذکر (خوش حال خان) نے موسیقی میں کمال پیدا کیا اور استاد تسلیم کر لیا گیا ۔ حیدر آباد کے تمام ارباب فن موسیقی میں اس کو ترجیح حاصل تھی ۔ اس طرح تان سین کے خاندان کا ایک سلسلہ

بھی حیدر آباد میں منتقل ہوا[1] ۔

حیدر آباد میں جن امیروں اور جاگیرداروں کو فن موسیقی میں دخل تھا اور ماہر موسیقی تسلیم کیے جاتے تھے ان میں سے بعض یہ ہیں :

ارسطو جاہ ۔ درگاہ قلی خان ۔ شکوہ جنگ ۔ قوی جنگ ۔ راجا بالا پرشاد ۔ میر محمد علی خان ۔ و میر خلیل‌اللہ خان (فرزندان سعیدالدولہ بہرام جنگ) اور سید عاقل خان (فرزند بہرام الملک) سید عزت خان (فرزند شاہ تجلی علی) ۔ میر فخرالدین جان ۔ خواجہ غلام حسین خان ۔ خان زمان خان ۔ میر فیروز علی جان خواجہ جیون[2] وغیرہ ۔ یہ تمام وہ اصحاب تھے جو خصوصیت سے فن موسیقی کے شایق اور ماہر فن سمجھے جاتے تھے اور اکثر راگ رنگ کے جشن منعقد کیا کرتے تھے ۔

ان تمام کے حالات کی صراحت طوالت کی محتاج ہے اس لیے نظر انداز کیے جاتے ہیں ۔ صرف دو تین امیروں کا تذکرہ ضروری ہے جن کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ ایک ارسطو جاہ اور دوسرے درگاہ قلی خان ۔ تیسرے شکوہ جنگ اس لیے مختصر طور پر ان کا حال پیش کیا جاتا ہے ۔

(۱) غلام سید خان المخاطب نواب اعظم‌الامرا ارسطو جاہ اپنی قابلیت سے ترقی کرتے ہوئے آصفی خاندان کے وزیر آعظم بنے ۔ (سنہ ۱۱۸۷ ھجری) اور اپنے انتقال تک (سنہ ۱۲۱۹ ھجری) اس خدمت کو انجام دیتے رہے ۔ ارسطو جاہ کی شخصیت مختلف حیثیت سے تاریخ دکن میں مشہور ہے وہ اپنے وقت کے بہت بڑے سیاست‌دان تھے ۔

۱۔ ’’گلزار آصفیہ‘‘
۲۔ ’’گلزار آصفیہ‘‘

وہ بڑے عالم اور فاضل تھے ۔ ان کے گرد و پیش ہر وقت علما اور شعرا کا مجمع ہوتا تھا ۔ ان کی شان اور مدح میں موزوں کیے ہوئے قصاید اور قطعات دو ضخیم جلدوں میں مرتب ہیں ۔

ارسطو جاہ خود بھی شاعر اور زندہ دل تھے ۔ بذلہ سنجی ، خوش مزاجی اور لطیفہ گوئی کی طبیعت پائی تھی ۔ چوسر بازی، پتنگ بازی اور کبوتر بازی ، گھوڑے کی سواری میں خوب مہارت رکھتے تھے ۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ موسیقی سے بھی رغبت تھی ۔ اس فن کے نکات سے خوب واقف تھے ۔ موسیقی کی سر پرستی کرتے تھے اس کے لحاظ سے تاریخ موسیقی میں ان کا نام ہمیشہ روشن رہے گا ۔

شمالی ہند سے کئی مشہور ماہرین فن موسیقی کو طلب کر کے بیش قرار تنخواہ پر ملازم رکھا تھا ۔ چنانچہ ان میں سے محمد خان ۔ دولہ خان ۔ غازی خان ۔ میاں نتھو خان مشہور تھے ۔ جن کا حال آگے آتا ہے ۔ ارسطو جاہ کو موسیقی سے اس قدر دلچسپی تھی کہ اپنے محل میں موسیقی سے لطف اندوز ہونے کے علاوہ اس زمانے کی مشہور ماہر موسیقی ماہ لقا بائی چندہ کے یہاں ۔ موسیقی کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے ۔ ماہرین موسیقی کو نہ صرف حکومت کی جانب سے تنخواہ مقرر ہوئی تھی ۔ بلکہ اپنی ذات سے بھی ان کو ماہوار دیا کرتے تھے[1] ۔

یہ نہیں تھا کہ وہ ہر وقت موسیقی اور راگ رنگ میں ڈوبے رہتے بلکہ ہر کام کا ایک وقت تھا ۔ بقول مولف ''گلزار آصفیہ'' ۔ وہ صوم صلوۃ کے بڑے پابند اور تہجد گزار تھے ۔ ان کی تہجد بھی قضا نہیں ہوتی تھی ۔

(۲) درگاہ قلی خان سالار جنگ جو خاندان سالار جنگ کے مورث تھے اور آصف جاہ اول کے ہمراہ دھلی سے آئے اور دارالسلطنت

۱۔ ''گلزار آصفیہ'' ۔

اورنگ آباد کے کوتوال بنائے گئے ۔ اس کے بعد صوبے داری کے عہدے پر بھی سر فراز رہے ۔

درگاہ قلی خان کو موسیقی سے بڑی دلچسپی تھی ۔ وہ فن سے واقف تھے اور موسیقی کے ارباب فن کی سرپرستی کرتے تھے ۔ چنانچہ غلام رسول خاں اور مہدی خاں جو اس زمانے کے ماہرین فن موسیقی اور استاد فن تسلیم کیے جاتے تھے ۔ ہمیشہ ان کی سرکار میں باریاب رہا کرتے اور ہزاروں روپیے انعام حاصل کرتے تھے ۔ انھوں نے دوسروں کے لیے ایک نظیر قایم کر دی تھی ۱۔

(۳) تیسرے قابل تذکرہ امیر خواجہ نعمت اللہ خاں شکوہ جنگ ہیں جن کے متعلق محمد یوسف صبحی نے موسیقی کا ماہر فن ہونا بیان کیا ہے ۔ اور اس قدر مبالغہ کرتا ہے کہ ان کو ثانی فیساغورث تصور کرتا ہے ۔ اور تان سین موجود ہوتے تو وہ بھی داد دینے کی صراحت کرتا ہے ۔ اس کی وضاحت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے تمام ماہرین موسیقی میں ان کو فضیلت حاصل تھی ۔ وہ موسیقی کے فن میں گوے سبقت لے گئے تھے ۔ تان‌سین کے خاندان کا ایک ماہر فن موسیقی کریم خان جس کو شمالی ہند سے عبدالحمید خان والی کرنول نے طلب کر کے ملازم رکھا تھا ۔ جب کرنول سے برداشتہ خاطر ہو کر حیدرآباد آیا تو شکوہ جنگ کے یہاں ملازم ہو گیا تھا اور انھوں نے اس کو اپنی سرکار سے متوسل کر کے سرپرستی فرمائی ۔ وہ اس کے مرتے تک اس کی پوری خبر گیری کرتے رہتے تھے ۔

یہ تو وہ اصحاب تھے جو موسیقی کے شوقین تھے ۔ یہ حضرات فن موسیقی میں دسترس رکھتے تھے اور فن کے قدر دان بھی تھے ۔ اب ہم ان ارباب موسیقی کا تذکرہ کرتے ہیں ۔ جو فن موسیقی کے استاد

۱۔ ''گلزار آصفیہ''

تھے ۔ بہ الفاظ دیگر جن کا پیشہ موسیقی تھا ۔ سوسال کے عرصے میں جنھوں نے نام آوری حاصل کی تھی وہ حسب ذیل ہیں ۔

(۱) محمد خان ۔ (۲) غلام رسول خان ۔ (۳) غلام مہدی خان ۔ (۴) خوش حال خان ۔ (۵) دولے خان ۔ (۶) غازی خان ۔ (۷) میاں شبو خان ۔ (۸) بو علی بخش ۔ (۹) محمد حسن خان ۔ (۱۰) محمد یوسف ۔ (۱۱) محمد حسین ۔ (۱۲) موتی خان ۔ (۱۳) شاکرعلی ۔ (۱۴) باقر علی ۔ (۱۵) الٰہی بخش ۔ (۱۶) ایزد بخش ۔ (۱۷) محمد اعظم ۔

اناث ماہرین موسیقی :

(۱) ماہ لقابائی ۔ (۲) حسن افزا (۳) پیاری جی (۴) ہیجو بائی ۔ (۵) شرفن جی ۔ (۶) کریم کنور ۔ (۷) وزیر بخش وغیرہ [۱]۔

یہاں استادان فن موسیقی کے متعلق مختصر صراحت پیش کی جاتی ہے ۔ جس سے موسیقی کی ترقی کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔

(۱) محمد خان، آصف جاہ ثانی (سنہ ۱۱۷۵ ہجری تا سنہ ۱۲۱ ہجری) کے ابتدائی زمانے میں شاہ جہان آباد دھلی سے حیدرآباد آ کر آباد ہو گیا ۔ فن موسیقی کا بے نظیر استاد تسلیم کیا جاتا تھا ۔ حیدرآباد میں اس کے کئی شاگرد مشہور ہیں ۔ محمد خان کا پیشہ ہی موسیقی تھا ۔ اس فن سے اس کی زندگی بسر ہوتی تھی ۔ پونہ میں بالا جی راؤ پیشوا کا ملازم ہو گیا ۔ ماھوار ایک ہزار پانچ سو ملنے لگے ۔ عرصے تک وہاں رہا ۔ پھر ناگپور جا کر جانو جی بھوسلا کی سرکار سے وابسطہ ہوا اور اسی قدر ماھوار پاتا رہا ۔ حیدرآباد میں تین ہزار روپیہ ماھوار تنخواہ ملنے لگی ۔ بقول مولف ''گلزار آصفیہ'' اس کے مماثل دوسرا کوئی ماہر موسیقی شمالی ھند سے نہیں آیا تھا ۔ ماہر موسیقی ہونے کے علاوہ خوش آواز تھا[۲]۔

۱- گلزارآصفیہ ۔

۲- ''گلزار آصفیہ'' ۔

(۳-۲) غلام رسول و غلام مہدی خاں عرف کنکر پتھر ان دونوں کو چھوٹے صاحب اور بڑے صاحب بھی کہتے ہیں ۔ دونوں محمد خان کے شاگرد تھے ۔ غلام رسول خان گیت اور دھرپت گانے میں فرد فرید شمار ہوتا تھا اور مہدی خان گیت اور دھرپت گانے میں اگرچہ اپنے بھائی سے کم تھا مگر خیال گانے میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا ۔ حضور آصف جاہ کے پاس مجرے کے پانچ ہزار روپیے ملتے تھے ۔ سالانہ چار مرتبہ یعنی عید الفطر ، عید الضحیٰ ، سالگرہ اور نو روز کے دن اس کے مجرے ہوتے تھے ۔ اس طرح بیس ہزار روپیے ملتے تھے[1]۔

اس کے علاوہ درگاہ قلی خان سالار جنگ ۔ قوی جنگ وغیرہ جو موسیقی کے شائق تھے ۔ ان کے یہاں ان کے مجرے ہوتے تھے اور ہزار ہا روپیہ انعام ملتا تھا[2]۔

یہ دونوں نہ صرف فن موسیقی میں ماہر تھے ۔ بلکہ اس کے ساتھ شاعری تیر، اندازی اور خوش نویسی میں بھی مہارت تھی ۔ غلام رسول کا تخلص سیوک اور مہدی خان کا تخلص آدھن تھا ۔ ہندی زبان سے بھی بخوبی واقف تھے ۔ ترانہ خیال کے دھرپت ۔ ہولی ، بسنت وغیرہ میں دونوں نے جو ایجادات کیے۔ تھے وہ عرصے تک باقی رہے مہدی خان کے مکان پر جو جلسے موسیقی کے ہوتے تھے اس میں اس وقت کے امراء اور معززین شریک ہوتے تھے[3]۔ جن کے ناموں کی تفصیل طوالت کا موجب ہو گی ۔ مہدی خان کا ایک خیال حسب ذیل ہے ۔

۱- گلزار آصفہ ۔
۲- ''گلزار آصفہ'' ۔
۳- ''گلزار آصفیہ''

بات بھلی ہے وھی جو سب عالم ریجھے
عالم ریجھے سن ریجھے
بات بھلی ہے وھی
ایک نہ ریجے سن میں کھیجے
اس بات کی کوئی نہ پتیجے
آدھی کی تو ایک بات ھی
کیا رنگ کی موت اب بھر لیجے
جان بوجھ کر جو سونده بندے
اس کے حق میں کیسا کیجے
بات وھی سب عالم ریجھے
بات بھلی ہے وہ ھی

(۴) خوش حال خان کریم خان کا لڑکا تھا اور تان سین کے کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا ۔ تاپ اس کا تخلص تھا ۔ اس کے زمانے میں حیدر آباد کے جس قدر ارباب موسیقی اور صاحب فن موسیقی تھے ۔ وہ خوش حال خان کو اپنا استاد اور پیش رو تسلیم کرتے تھے گیت ، دھرپد اور خیال وغیرہ گانے میں اس کا کوئی مد مقابل نہیں تھا ۔ مسرف خاص حضور کا ملازم تھا ۔ ہر مجرے پر پانچ سو روپیہ اور دوشالہ ملتا تھا [۱]۔

خوش حال خان کو ماہ لقابائی چندہ نے اپنے استاد کی حیثیت سے مامور کر لیا تھا ۔ اس کے رہنے سہنے اور تمام ضروریات کی وھی کفیل تھی ۔ چندہ کے انتقال تک جو سنہ ۱۲۳۲ ھجری میں ھوا خوش حال خان اس سے متعلق رھا ۔

(۵ - ۶) دولے خان اور اس کا لڑکا غازی خان شمالی ھند کے مشہور گانے والے تھے ۔ ارسطو جاہ دیوان نے ایک کثیر رقم دے

۱- "گلزار آصفیہ" صفحہ ۳۱۲ ۔

کر ان کو طلب کیا تھا ، موصوف کا خیال تھا کہ ان کے برابر گانے والا ہندوستان میں نہیں ہے ۔ خیال گانے میں اس کی کوئی مثال نہیں تھا ۔ تین سو روپیہ ماہوار تنخواہ دی جاتی تھی[۱]۔

(۷) میاں شبوے خان موسیقی کا ماہر اور شاعر بھی تھا ۔ ستار بجانے میں بڑی اچھی مہارت پیدا کی تھی ۔ اس فن کا استاد تسلیم کر لیا گیا تھا ۔ اس کو بھی ارسطو جاہ نے شمالی ہند سے طلب فرمایا تھا ۔ ایک سو روپیہ ماہوار تنخواہ حکومت کی جانب سے اور دوسو روپیہ ماہوار اپنی طرف سے دیتے تھے ۔ اس کے علاوہ ساٹھ روپیے ماہوار کھانے کے لیے دیتے تھے ۔ ہاتھی اور پالکی بھی عنایت تھی[۲] ۔

اس کے ایجاد کیے ہوئے گیت ، ترانے اور خیال اس زمانے کے طوائفیں گایا کرتی تھیں ۔

(۸) بوعلی بخش ۔ نیسر کا رہنے والا تھا ۔ قانون بجانے میں بڑی اچھی مہارت تھی ۔ نوے روپیے ماہوارتنخواہ تھی[۳]۔

(۹) محمد حسن ، محمد خاں کا بھتیجا تھا ۔ اسے سات روپیہ سرکار یومیہ سے ملتا تھا ۔ بقول مولف " گلزار آصفیہ"۔ ان کے زمانے میں محمد حسن موسیقی میں فرد کامل مانا جاتا تھا ۔

(۱۰ - ۱۱) محمد یوسف اور اس کا لڑکا محمد حسین دونوں دکن کے باشندے تھے ۔ ڈھولک بجانے میں اس کا کوئی مد مقابل نہیں تھا ۔ ایک سو روپیہ ماہوار تنخواہ تھی۔

(۱۲ - ۱۳ - ۱۴) موتی خان ۔ شاکر علی و باقر علی ۔ تینوں بنارس سے آ کر مقیم ہوگئے تھے ۔ موتی خاں کو خیال گانے میں

۱- "گلزار آصفیہ" صفحہ ۳۱۲ ۔
۲- "گلزار آصیہ" صفحہ ۳۱۲ ۔
۳- "گلزار آصفیہ" صفحہ ۳۱۱ ۔

مہارت تھی - چار روپے یومیہ ملتے تھے - باقر علی ستار بجانے میں استاد تسلیم کیا گیا تھا - دو سو روپے ماہوار تنخواہ تھی -

(۱۵ - ۱۶) الٰہی بخش اور اس کا بڑا بھائی ایزد بخش دونوں لکھنؤ سے آئے تھے - اول الذکر کو ماہوار ایک سو روپے اور ثانی الذکر کو دو سو روپے ماہوار ملتے تھے - الٰہی بخش خیال سرائی میں فرد کامل تسلیم کیا گیا تھا اور ایزد بخش ہر قسم کے گانے میں ماہر سمجھا جاتا تھا -

(۱۷) محمد اعظم کو خیال گانے اور غزل گانے میں خوب مہارت حاصل تھی - اس کو یکتائے عصر کہا جاتا تھا - سو روپے ماہوار ملتا تھا[1] -

اس کتاب میں جن اناث ماہرین فن موسیقی بہ الفاظ دیگر طوایفین کا نام بھی درج کیا گیا ہے ان کے حالات یہاں نظر انداز کیے جاتے ہیں - کیونکہ ان کے حالات ایک علیحدہ کتاب ''جلوۂ راز'' میں درج ہوچکے ہیں - ''تاریخ گلزار آصفیہ'' کے بعد یا یوں سمجھیے کہ سن ۱۲۸۰ ہجری کے بعد بھی حیدرآباد میں موسیقی کی قدر دانی ہوتی رہی - نہ صرف ارباب موسیقی اس فن میں اپنی مہارت کا ثبوت پیش کرتے رہے بلکہ امراء نے بھی بہ حیثیت فن قدر دانی کی ہے - اس وقت کے امیروں میں خصوصیت سے صمصام الملک کا نام لینا ضروری ہے وہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور موسیقی کے فن میں کافی دخل تھا - ان کے یہاں کئی ارباب موسیقی ملازم تھے جن میں سے غلام علی سب میں مشہور تھا - صمصام الملک کے شوق موسیقی کا پتہ اس سے چل سکتا ہے کہ انھوں نے موسیقی کی کتابیں جو ناگری رسم الخط میں لکھی ہوئی تھیں - نستعلیق رسم الخط میں مرتب کرائی تھیں - چنانچہ ان کی

۱- ''گلزارِ آصفیہ'' ۳

صراحت بیان کی جاتی ہے ۔

(۱) ''پنگل'' یہ رسالہ جو موسیقی سے متعلق دیوناگری میں تھا سن ۱۲۷۰ ہجری میں صمصام الملک کے حکم سے غلام علی قوال کی مدد سے نستعلیق رسم الخط میں لکھا گیا ہے ۔

(۲) ''سندر سنگار'' ۔ یہ کتاب شاہجہاں کی مرتب شدہ نہایت رائے کی تصنیف تھی اس کو بھی صمصام الملک کے ایما سے سن ۱۱۷۲ ہجری میں غلام علی قوال کی مدد سے فخرالدین نے لکھا ہے ۔

ان دونوں کتابوں میں موسیقی کے اقسام راگ اور راگنیاں دونوں درج ہیں ۔ موسیقی کے شوق کا یہ نتیجہ تھا کہ طوایفین کی یہاں کثرت تھی اور ان کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ ہر امیر اور غریب اور بڑے جاگیردار کے پاس ارباب نشاط کے نام سے خاص سررشتہ ہوتا تھا کوئی ماہر موسیقی اس کا افسر ہوتا ۔ ارباب موسیقی ملازم ہوتے اور ان کو ماہوار تنخواہ ملا کرتی ۔

نصراللہ خان عبدالعلیم نے اپنی مولفہ کتاب ''تاریخ دکن'' میں جو سن ۱۸۶۵ء میں مرتب ہوئی ہے ارباب نشاط کے دفتر کا جو حال قلمبند کیا ہے اس کا اقتباس درج ذیل ہے ۔

ارباب نشاط کی کچہری اس کو کنچن کچھری بھی کہتے ہیں ۔ اس کی مہتممہ ایک عورت ماہ شریفہ نام ہے جو حضور کی خاص ماماؤں سے تعلق رکھتی ہے اس کی عمر ساٹھ سال ہے مولف نے اس کو دیکھا ہے اس کے تحت ایک جمعدار چار اہل کار اور چند ھرکارے اور جوان ملازم ہیں ۔ طوایفیں کے مقدمات اس کے یہاں پیش ہوتے اور تصفیہ پاتے ہیں[۱] اس زمانے میں مسلمان اور ہندوؤں کی کوئی خوشی اور مسرت کی

۱۔ ''تاریخ دکن'' نصراللہ خان صفحہ ۱۲۶

تقریب ایسی نہیں تھی جس میں طوایفین کا گانا نہ ہوتا ہو۔
اس طرح کی دلچسپی کے باعث شمالی ہند سے طوایفین کے آنے کی کثرت ہوگئی ۔ ان کی کثرت کی وجہ سے طوایفین کی حالت میں بھی فرق آ گیا ۔ انھوں نے گانے بجانے اور ناچنے کے ساتھ ساتھ اپنے بستروں کی تجارت بھی شروع کر دی تھی ۔ شرفا جوفنی حیثیت سے موسیقی سے دلچسپی لیتے تھے اس میں کمی آ گئی''۔
جب انگریز حیدر آباد آ گئے تو فوج کے علاوہ خاص سوسائٹی میں انگریزی موسیقی کا رواج ہو گیا ۔ یا باقاعدہ فوج کے علاوہ بے قاعدہ فوج میں بھی یوروپین باجے استعمال ہونے لگے ۔

نوبت روشن چوکی کے ساتھ دکنی باجوں میں موسیقی بھی شامل تھی ۔ نوبت کا اعزاز حکومت آصفیہ سے ملا کرتا تھا اور اس امیر کے یہاں جس کو نوبت کا اعزاز ملتا تمام دن اور رات کے مختلف اوقات میں نوبت بجا کرتی ۔ اس کے اوقات عموماً صبح سویرے اس کے بعد آفتاب بلند ہونے پر پہر دو پہر اور سہ پہر کو تھا ۔ سر مغرب کے علاوہ دوپہر اور رات کو بھی نوبت بجا کرتی تھی ۔

شادیوں اور رسومات کے علاوہ نوبت اور روشن چوکی کا ہونا لازمی تھا ۔ نوبت بجانے والے عموماً مسلمان ہوتے اور روشن چوکی بجانے والے ہندو ہوتے اگرچہ ان دونوں کا رواج اب کم سے کم تر ہوگیا ہے مگر بعض شادیوں اور رسومات میں اب بھی نوبت اور روشن چوکی طلب کی جاتی ہے ۔

اختتام

صفحات گزشتہ میں دکن کے تمدن و تہذیب یعنی کلچر کی مختصر تاریخ درج کر دی گئی ہے ۔ جس سے واضح ہوتا کہ دکن میں مسلمانوں کا چھ سو سالہ کلچر کیا تھا اور اس کا آغاز کب ہوا اور کس طرح ترقی ہوئی ۔

مسلمانوں کے کلچر کا آغاز سنہ ۱۳۰۰ء کے بعد ہوا اور ۱۹۴۸ع میں اس کا اختتام ہوا۔

مسلمانوں نے اپنے کلچر کے جو آثار چھوڑے ہیں وہ تابناک اور درخشاں ہیں اور تاریخ میں ہمیشہ زرین حروف میں باقی رہیں گے۔

کتابیات

مخطوطات

شمار	نام مخطوطه	مصنف	کس کتب خانے میں ہے
(۱)	تحفة المجاهدین	زین الدین معبری	کتب خانۂ قاضی عبداللہ مرحوم (مدراس)
(۲)	سبحه المرجان	مولانا غلام علی آزاد	کتب خانہ ٔ سعیدیہ حیدرآباد
(۳)	مشکوات النبوت	سید شاہ موسیٰ قادری	کتب خانۂ آصفیہ (اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدر آباد)
(۴)	ترک والا جاهی	برهان خان هاندی	کتب خانۂ سعیدیہ
(۵)	سعید نامه	لاله دکنی رائے	"
(۶)	قصر والا جاهی	محمد جشن خان تمنا	"
(۷)	تذکرة البلاد والاحکام	حسن علی کرمانی	دفتر آرکٹکچر حیدر آباد
(۸)	نشان حیدری	حسن علی کرمانی	کتب خانۂ سعیدیہ
(۹)	سوانح دکن	خواجه منعم خان	کتب خانۂ سالار جنگ
(۱۰)	تاریخ قطب شاهی	"	انڈیا آفس لندن
(۱۱)	تاریخ دل افروز (ماه نامه)	غلام حسین جوهر	کتب خانۂ سالار جنگ
(۱۲)	فتوحات عادل شاهی	"	برٹش میوزیم
(۱۳)	شمس الامراء کے علمی خدمات	نصیرالدین ہاشمی	کتب خانہ ٔ خواتین دکن
(۱۴)	خوان نعمت اعظم	"	کتب خانۂ جامعہ نظامیہ حیدر آباد
(۱۵)	ایوان نعمت	"	"

مطبوعات

شمار	نام کتاب	مصنف	نام مطبع	سنہ طباعت	صراحت کتب خانہ
(۱)	اردو شہ پارے	سیدمحی الدین قادری زور	مکتبۂ ابراھیمہ	سنہ ۱۹۲۹ع	کتب خانۂ خواتین دکن
(۲)	ارسطو جاہ	عبدالمجید صدیقی	,, ,,	سنہ ۱۹۳۹ع	,, ,, ,,
(۳)	بہمنی سلطنت	,, ,,	مطبع طارق حیدر آباد	مابعد ۱۹۳۸ع	,, ,, ,,
(۴)	بساتین السلاطین	ابراھیم زبیری	مطبع سیدی		,, ,, ,,
(۵)	بستان آصفی چھ جلدیں	مانک راؤ وٹھل	مطبع انوارالاسلام		,, ,, ,,
			مطبع قادری		,, ,, ,,
			شمس المطابع وغیرہ		
(۶)	ترجمہ تاریخ مینگلز	مترجم ریورنڈ سیل			کتب خانۂ مدرسۂ محمدی مدراس
(۷)	تذکرہ اولیاء دکن جلد اول	عبدالجبار ملکا پوری	حسن پریس حیدرآباد	سنہ ۱۳۳۳ھ	کتب خانۂ خواتین دکن
(۸)	تذکرہ اولیاء دکن جلد دوم				

شمار	نام کتاب	مصنف	نام مطبع	سنه طباعت	صراحت کتب خانه
(۹)	تاریخ خورشید جاہی	غلام امان جان	مطبع خورشید جاہی	سنه ۱۲۸۷ھ	,, ,, ,,
(۱۰)	ترجمه تاریخ فرشته	فدا علی	مطبع جامعۀ عثمانیه	سنه ۱۹۲۶ع	,, ,, ,,
	جلد اول ، دوم ،			,, ,,	,, ,, ,,
	سوم اور چهارم				
(۱۱)	تاریخ فرشته	ابوالقاسم فرشته	مطبع نول کشور		,, ,, ,,
(۱۲)	تاریخ دکن جلد سوم	عبدالغفور خان	مطبع مفید عام آگره	سنه ۱۹۰۳ع	,, ,, ,,
	سلسله آصفیه				,, ,, ,,
(۱۳)	تاریخ دکن	هارون خان شروانی	شمس المطابع حیدرآباد	سنه ۱۳۳۳ف	,, ,, ,,
(۱۴)	تاریخ گولکنڈه	عبدالمجید صدیقی	مطبع مکتبۀ ابراهیمیه حیدر آباد	سنه ۱۹۳۹ع	,, ,, ,,
(۱۵)	تاریخ دکن	محمد سلطان	مطبع یوسفی حیدر آباد	سنه ۱۳۲۷ھ	
(۱۶)	تاریخ جنوبی هند	محمود خان	برقی کوثر پریس بنگلور		کتب خانۀ خواتین دکن
(۱۷)	تزک آصفیه	تجلی علی	مطبع سیدی حیدرآباد	۱۳۱۰ھ	,, ,, ,,
(۱۸)	تزک محبوبیه	غلام صمدانی گوهر	فخر نظامی پریس	۱۳۱۹ھ	,, ,, ,,

شمار	نام کتاب	مصنف	نام مطبع	سنه طباعت	صراحت کتب خانه
(۱۹)	ترجمه تحفة المجاهدین	مترجم سید شمس الله قادری	شروانی پرنٹنگ پریس علی گڈھ	۱۹۳۲ ع	کتب خانۂ خواتین دکن ,, ,, ,,
(۲۰)	تاریخ راحت افزا	سید محمد علی الحسن	آعظم اسٹیم پریس	ما بعد ۱۹۳۵ ع	,, ,, ,,
(۲۱)	تاریخ رشید الدین خان	غلام امان خان	فیڈوالیش سوسائٹی مدراس	۱۸۶۲ ع	,, ,, ,, ,, ,, ,,
(۲۲)	تاریخ النوایط	شمس العلما عزیز جنگ	عزیز المطابع حیدرآباد	۱۳۲۲ ھ	,, ,, ,,
(۲۳)	تاریخ اسلام	سید امیر علی	مطبع حمیدیه لاہور	۱۹۰۶ ع	,, ,, ,,
(۲۴)	ترجمه تاریخ الخلفاء امام سیوطی	مترجم محی الدین خان	مطبع صدیقی لاهور	۱۳۲۳ ھ	,, ,, ,, ,, ,, ,,
(۲۵)	تاریخ دکن	عبدالعلیم نصرالله خان	مطبع نول کشور		,, ,, ,,
(۲۶)	حدیقةالعالم	میر عالم	مطبع سیدی حیدرآباد		,, ,, ,,
(۲۷)	حدیقة السلاطین	مرتبه سید علی اصغربلگرامی مولف نظام الدین ساعدی	اسلامک پبلیکیشن سوسائٹی حیدرآباد	۱۹۶۲ ع	,, ,, ,, ,, ,, ,,
(۲۸)	دکن میں اُردو طبع ۵	نصیرالدین هاشمی	انشاء پریس لاهور	۱۹۶۰ ع	,, ,, ,,

شمار	نام کتاب	مصنف	نام مطبع	سنه طباعت	صراحت کتب خانه
(۲۹)	ریاض مختاریه	میر دلاور علی دانش	اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد	۱۹۳۲ع	کتب خانۂ خواتین دکن
				”	” ”
(۳۰)	ریاست میسور میں اُردو کی نشو و نما	ڈاکٹر حبیب النساء	برقی پریس بنگلور	۱۹۶۲ ع	” ” ”
				”	” ”
(۳۱)	سیرة ابن اسحاق	ابن اسحاق	یورپ		کتب خانۂ مدرسۂ محمدی (مدراس)
(۳۲)	سلاطین معبر	مترجم سید شمس الله قادری	مسلم یونیورسٹی پریس علی گڈھ	سنه ۱۹۲۸ع	کتب‌خانه‌خواتین دکن
(۳۳)	سلطان محمد قلی‌قطب‌شاه	ڈاکٹرسید محی الدین زور	اعظم اسٹیم پریس	سنه ۱۹۳۰ع	” ” ”
(۳۴)	سیرة عائشه	سید سلیمان ندوی	معارف پریس‌اعظم گڑھ		” ” ”
(۳۵)	عجائب الاسفار سفر نامه ابن بطوطه	مترجم محمد حسین ایم-اے	رفاه‌عام پریس لاهور	سنه ۱۸۹۸ع	” ” ”
(۳۶)	عرب وهند کے تعلقات	سید سلیمان ندوی	هندوستانی پریس‌آله آباد	سنه ۱۹۲۹ع	” ” ”

شمار	نام کتب	مصنف	نام مطبع	سنہ طباعت	صراحت کتب خانہ
(۳۷)	کلیات سلطان محمد قلی	مرتبہ ڈاکٹر زور	مطبع مکتبہ ابراهیمیہ حیدرآباد	سنہ ۱۹۳۰ع	کتب خانۂ خواتین دکن
(۳۸)	کلام الملوک	مرتبہ میر سعادت علی	” ”	سنہ ۱۳۵۷ھ	” ” ”
(۳۹)	گلزار آصفیہ	خواجہ غلام حسین خان	مطبع محمدی حیدرآباد	سنہ ۱۲۸۷ھ	” ” ”
(۴۰)	گزشتہ لکھنؤ	عبد الحلیم شرر	یونائیٹڈ انڈیا پریس		” ” ”
(۴۱)	گزیٹر	مرزا مہدی خان کوکب	مطبع شمسی آگرہ	سنہ ۱۹۰۸ع	” ” ”
(۴۲)	مختصر تاریخ کنبہ		یورپ		کتب خانۂ مدرسہ محمدی (مدراس)
(۴۳)	مرقع عبرت	مہدی حسن	مطبع ہزار داستان	سنہ ۱۳۰۰ھ	کتب خانۂ سالار جنگ
(۴۴)	مدراس میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	مکتبۂ ابراهیمیہ حیدرآباد	سنہ ۱۹۳۸ع	کتب خانۂ خواتین دکن
(۴۵)	مقالات ہاشمی	” ” ”	فیروز پرنٹنگ پریس لاہور	سنہ ۱۹۳۹ع	” ” ”
(۴۶)	نظام علی خان	سراج الدین طالب	شمس الاسلام پریس حیدرآباد	سنہ ۱۹۳۲ع	” ” ”
(۴۷)	وضاحتی فہرست کتب خانۂ سالار جنگ		مطبع ابراهیمیہ	سنہ ۱۹۶۱ع	” ” ”